UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224480

UNIVERSAL
LIBRARY

BROWN BOOK

224480

عہد پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

OSMANIA UNIVE
COLLEGE LIBR

شباب لکھنؤ

مولفہ محمد احمد علی صاحب بی اے

پرنٹر و پبلشر منشی سجاد علی علوی

سنہ ۱۹۱۳ء

الناظر پریس واقع لکھنؤ میں طبع ہوا

حق تالیف محفوظ ہے

چیدہ لٹریچر (رعایتی قیمت

شباب لکھنؤ (تاریخ) قسم ۱ عہ ر = قسم ۲
مرقع اودھ (تاریخ) قسم ۱ ۸ ر = قسم ۱
تاریخ تمدن مجلد ہہ = غیر مجلد
ملکہ وفقیہ (قصہ)
فلسفہ کی تعلیم
خورشید بدر
مرقع لیلےٰ مجنون (ڈراما)
قاسم وزہرہ (ڈراما) قسم ۱ ۱۲ ر قسم ۲ ۸ ر قسم ۳
اسرار بہ نگون (ناول)
سائنس و اسلام
ون ناحق (ناول

تصانیف مولانا شبلی نعمانی

المامون
سیرۃ النعمان ۱۲ ر
الفاروق عاہر
الغزالی عہر
سوانح مولانا روم قسم ۱ عہ ر قسم ۲ ۱۰ ر
موازنہ انیس و دبیر عہر
علم الکلام عہر
الکلام عہ ر
رسائل شبلی ۱۲ ر
رنگ زیب عالمگیر قسم ۱ عہ ر قسم ۲ ۱۰ ر
روم و مصر و شام ۱۲

المشتہر شفاعت علی علوی منیجر الناظر بک ایجنسی امین آباد لکھنؤ

تاریخ ۱۷۶

دیباچۂ مؤلف

اُنیسویں صدی کے اس چل چلاؤ کے وقت میں جبکہ جمہوری حکومت کے خیالات ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کے دل میں رچے بسے ہیں۔ دنیا کا کیا ذکر خود اسی ہندوستان کے توہم پرست او حاکم وقت کو ظل اللہ سمجھنے والے باشندے بھی حکومت خود اختیاری کے مدرسے میں جمہوری اور لمٹڈ سلطنت کے اصول کا سبق پڑھ پڑھ کے آزادی اور مطلق العنانی کا سودا دماغ میں رکھنے لگے ہیں کسی شخصی حکومت کے نظم و نسق یا خود مختار فرمانروا کے ذاتی حالات عیش و عشرت کی داستانیں راجہ اور پرجا کی آسائش پسندی اور فارغ البالی کی روایتیں حکایتیں قلمبند کرنا ہرگز ایسا نہیں جس سے تعلیم یافتہ فرقے ی معلومات میں کسی مفید اضافے کی امید ہو۔ لیکن جبتک دنیا آباد ہے اور جبتک دنیا میں انسان بستے ہیں پرانی باتیں اور اگلے تذکرے ضرور زبانی بیان ہونگے۔ کتابوں میں لکھے جائیں گے۔ لوگ انکا سنیں گے اور شوق سے پڑھیں گے اسے چاہے افسانہ پسندی کی طبعی رجحان پر محمول کرو چاہے یہ سمجھو کہ گذرے ہوئے وقتوں اور مرے ہوئے انسانوں کے حالات سننے سے نئی عقلوں میں روشنی آنے کی اُمید یہ سب کچھ کراتی ہی۔ ہر نوع تاریخ اور ترجمے کا فن جسکے ذریعہ سے ہمکو پُرانی باتیں ورا پنی ماسبق نسلوں کی سرگذشتیں معلوم ہوتی ہیں کسی نہ کسی پیرایے میں ہمیشہ مطبوع خاص و عام رہا ہی ور رہے گا۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھکے راقم الحروف نے قصد کیا ہی کہ سلطنت اودھ کی تاریخ کا وہ دلچسپ حصہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے جس سے باشندگان اودھ کے عام اخلاقی اور تمدنی عروج زوال کے اسباب و علل کے دریافت کرنیکے واسطے کافی ذخیرۂ معلومات حاصل ہو جائے۔ چنانچہ س کتاب کے ذریعہ سے سلطنت اودھ کی ابتدائی تاریخ۔ اُسکی ترقی و تنزل کے اسباب کا ایک مجمل خاکہ کھینچا گیا ہی اور امید ہی کہ وہ ہر طرح سے مطبوع و دلچسپ ثابت ہوگا۔

مجکو نہایت افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اودھ کی تاریخ ایسی تاریکی میں پڑی ہوئی ہی کہ زمانہ حال کے اصول روایت و درایت کے بموجب اگر تنقید کیا جائے تو ناکامی کے ساتھ کسی نئی تالیف

منصوبے ہی سے ہاتھ اُٹھانا مصلحت معلوم ہو۔ اسیوجہ سے میں نے اکثر مقامات پر پچھلے مورخین کے نقش قدم پر چلنے ہی کو محفوظ سمجھکے محض نقل حکایت کردی ہی۔

بیشک لکھنؤ میں ابھی اُس نسل کے باقیات صالحات موجود ہیں جسکی نہایت ناکمل سرگذشت اب صرف تاریخ کی جلدونمیں ملسکتی ہی لیکن یہ فرسودہ حال بوڑھے اب اتنے ہی کے واسطے رہگئے ہیں کہ مجمع یاران بے تکلف میں بیٹھیں تو پرانی داستانیں بیان کرکے دلوں کو گرمائیں پچھلی صحبتونکو یاد کرکے روئیں رلائیں۔ اکیلے ہوں تو ٹھنڈی سانسیں لیں اور اپنی گذشتہ عظمت وشوکت کے تصور ہی سے جی بہلائیں۔ اور اگر زمانہ حال کے تعلیم یافتہ لوگوں میں جا پڑیں تو اُنکی بدقسمتی کی نہایت مہیب صورت پیش کرکے اُنکے دلوں میں یہ حسرت پیدا کرائیں کہ ہائے ہم اُس زمانے میں کیوں نہوئے۔ انمیں سے بہتیرے ایسے بھی نکلیں گے جنکی آنکھونکے سامنے ہر وقت وہی اگلے جاہ وجلال کے مرقع رہتے ہیں۔ وہ اُسکی یاد میں اتنے محو ہیں کہ انھیں خبر بھی نہیں کہ زمانہ کتنی دور آگے نکلگیا ہو۔ اُنکے کانوں میں ابتک وہی تیغ وتفنگ کی جھنکاریں سنائی دیتی ہیں اور جب کبھی بیٹھ جاتے ہیں تو انھیں اپنے قوت بازو کے کارنامے سینہ وشانہ کے زخموں کی شہادت کے ساتھ سنانے دکھانے سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ دنیا نے اب کتنی ترقی کی ہی۔ ظاہر ہی کہ ایسے لوگوں سے کسی قسم کے تاریخی مواد ومصالحہ کی جمع کرنے کی کوشش کسقدر بیکار ہی۔ اُنکے دماغوں میں خیالات کا نظم بگڑا ہوا ہی نہ وہ سلسلے کے ساتھ واقعات بیان کرسکتے ہیں نہ اُنسے جرح کرکے اس بات کا پتا لگ سکتا ہی کہ جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں اسمیں کتنا چشم دید اور کتنا سنا ہوا اور جو سنا ہوا ہی وہ کس حد تک معتبر راویوں سے سنا ہوا اور کتنی بازاری گپ شپ اسمیں شامل ہوگئی ہی۔ انھیں وجوہ سے راقم الحروف کو اکثر مقامات پر انگریزی مورخین کے اجتہاد پر تکیہ کرنا پڑا اور یورپین سیاحونکے بیانات کو صحیح ماننا پڑا ہی اور انھیں وجوہ سے نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت کی مفصل حالات اُنکے ایک یورپین مصاحب کی لکھی ہوئی کتاب کا ترجمہ کرکے ناظرین کے سامنے پیش کرنا پڑی ہی۔ اگر حیات مستعار باقی ہی تو انشاء اللہ آگے چلکے اس کتاب کے دوسرے حصہ میں نصیر الدین حیدر کے بعد کے بادشاہوں کی کیفیت انتزاع سلطنت اور برطانیہ اعظم کے انتظامات بھی پیشکش ناظرین کیے جائیں گے۔

آخر میں مجھے اپنے عم معظم جناب منشی محمد محسن علی صاحب وکیل سے اپنی بیحد مشکوری وامتنان ظاہر کرنا ضروری معلوم ہوتی ہی جنکی وجہ سے مجھے اِس کتاب کی تالیف میں بہت بڑی مدد ملی ہی۔ فقط

محمد احمد علی۔ بی اے۔ لکھنؤ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۃ الکتاب

یہ وہ قصہ نہیں کچھ جھوٹی سچی جس میں باتیں ہوں
بیاں پُر درد ہی گزری ہوئی اگلی کہانی ہے

تمہید المضامین

لکھنؤ میں مسلمانوں کی بادشاہت" ایک خیال تھا کہ دماغ میں آیا اور نکل گیا۔ ایک خواب تھا کہ پوری طرح دیکھنے بھی نہ پائے تھے جو آنکھ کھل گئی اور تعبیر پوچھتے پوچھتے بھول بھی گیا۔ نہیں نہیں ایک طلسم تھا۔ دم کے دم میں بنا اور ایسا بنا کہ جسکا ہر کارخانہ سامری کے جادو پر چشمک زن تھا اور پھر چشم زدن میں مٹا اور ایسا مٹا کہ کہیں نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ خدا جانے وہ کون لوگ تھے۔ کیا ساز و سامان رکھتے تھے جنھوں نے یہ طلسم بنایا تھا۔ ابھی بادشاہت کو مٹے آدھی صدی بھی پوری نہیں ہوئی۔ بہتیرے آدمی ابتک زندہ ہیں جو اپنے چشم دید حالات بیان کرتے اور "ستم از بادۂ شبانہ ہنوز" کی صدا سُنا سُنا کر روتے رُلاتے ہیں۔ تاریخ کی کتابیں بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں جنہیں "ذکر جوانی در پیری" یاد دلانیوالے واقعات تھوڑے بہت قلمبند ہیں۔ لیکن زمانے کا رنگ ایسی جلد پلٹا ہی کہ زبانی روایتیں حکایتیں سُنتے ہیں تو کوہ قاف اور راجہ اندر کے اکھاڑے کا سماں نظروں کے نیچے پھر جاتا ہے اور تاریخیں پڑھتے ہیں تو اُنمیں امیر حمزۂ صاحبقراں کی داستان اور افراسیاب جادو کی نیرنگ سازی کا مزا ملتا ہی۔ عقل حیران ہوتی ہی کہ اتنی جلد یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی اور زمین و آسمان کیونکر بدل گئے۔ دل قبول ہی نہیں کرتا کہ ابھی چالیس پینتالیس برس اُدھر اسی لکھنؤ میں مسلمانوں کی یہی نکبت زدہ قوم برسر اقتدار و حکومت تھی اور گلی گلی کنچن برستا تھا۔ اُس زمانے کے فرسودہ حال بڑے بوڑھوں سے پوچھتے ہیں تو وہ آہ سرد بھر کے بس اتنا سنا دیتے ہیں کہ "ارے میاں وہ گلی کوچے ہی نہیں رہے۔ وہ چلنے پھرنے والے ہی اُٹھ گئے زمانے نے نئی بساط بچھائی ہے"۔ اسیر مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں ~

بڑھ گئی گھٹنے سے زیادہ اور شان لکھنؤ
لامکاں ہے ان دنوں ہر اک مکان لکھنؤ

کہتے ہیں جس طرح انسانوں اور حیوانوں کی زندگی کے کئی دورے ہوتے ہیں۔ بچپن۔ شباب جوانی۔ کہولت۔ شیخوخت۔ اُسی طرح ملکوں سلطنتوں۔ اور قوموں کی بھی عمر ہوا کرتی ہے اور اُنمیں بھی ایسے ہی دورے ہوتے ہیں لکھنؤ کی بادشاہت کی بھی ایک عمر ہوئی پہلے بچپن ہوا۔ پھر شباب آیا۔ اور شباب کے آتے ہی جوانی۔ کہولت۔ شیخوخیت۔ اور موت سب کا پیش خیمہ آگیا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے

سنبھالے ہوش تو مرنے لگا حسینوں پر
اُسے تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

کیا ہوا۔ اکثر دیکھا گیا ہے انسان جوش نوجوانی اور عنفوان شباب کی سرشوری میں ایسی بے اعتدالیاں کر گزرتا ہے کہ اُسیوقت سے طبیعت کو اک روگ لگ جاتا ہے۔ پھر جب تک قدرتی مد بدن کا زور چلتا ہے ہشاش بشاش۔ توانا و تندرست رہتا ہے۔ ادھر کہولت نے صورت دکھائی اُدھر دبی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی اور مرض کا زور شروع ہو گیا۔ پُروائی ہوا چلی اور پُرانی چوٹ اُبھر آئی۔ زخم ہرے ہو گئے۔ ناسور پھر ٹپکنے لگا۔ بعینہٖ یہی حال لکھنؤ کی بادشاہت کا ہوا۔ جو زمانہ عنفوان شباب کا تھا۔ جب دل سے دیر سے تک بہار آئی ہوئی تھی ہر طرف کا اطمینان تھا۔ رقیب راہزن کا کھٹکا نہ تھا اور اسکا موقع تھا کہ ہمت اور اولوالعزمی اپنے جوہر دکھاتی۔ عروس سلطنت کا بناؤ سنگار کیا جاتا۔ اُسیوقت بے اعتدالیاں بڑھیں۔ بیخودی اور سیہ مستی نے اپنا رنگ جمایا۔ عیش و عشرت کے چرچے زیادہ ہوئے۔ صحبت کا رنگ بگڑا۔ اصحاب دانش و بینش ناپدید۔ ارباب نشاط مجرائیوں میں داخل ہوئے۔ شمع حیات نے صبح پیری کا انتظار بھی نہ کیا۔ سرشام ہی سے جھلملانے لگی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ؎

روح قالب میں جو آئی تو قضا بھی آئی
شمع کے ساتھ ہی محفل میں ہوا بھی آئی

اگرچہ مسلمانوں کی قوم کی ترقی و تنزل کی داستان ہر حصہ دنیا میں سراپا حیرت و سراپا عبرت ہے لیکن ہندوستان کی اسلامی شہنشاہی اور اُسکے تمام شعبے تو نیرنگی زمانہ کے عجائب نمونے تھے۔ دہلی۔ آگرہ۔ لکھنؤ۔ اور اسی قسم کے دوسرے شہروں میں ذرا جاکے کوئی پرانے آثار و نشانات دیکھے تو اسے خود معلوم ہو جائیگا کہ یہ تباہی زدہ قوم اپنے وقتوں میں کیا کچھ طلسمات باندھ چکی ہے۔

اللہ اللہ۔ یہ وہی مسلمان تھے جو سوکھی کھجوریں اور جو کے ستو کھا کھا کے عرب کے جلتے بھنتے ریگستانوں

سے کشورستانی اور ہفت اقلیم کی فرمانروائی کے پرچم اڑاتے چلے تھے انھیں کو بھائی بندوں نے

"زشیر شتر خوردن و سوسمار ٭ عرب را بجائے رسیدہ ست کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو"

کا طعنہ دیا تھا۔ خدا کی قدرت نے انہیں خاک نشینوں کو اس مرتبہ پر پہونچایا کہ ایک طرف تو تخت کیانی اور درفش کاویانی پر قبضہ کیا اور دوسری طرف انھیں طعنہ دینے والوں کو دو کلمے ایسے پڑھا دیے کہ جنکی برکت سے نیشاپور سے غریب الوطن و تارک الدیار ہوکے نکلے تو اودھ میں وہ لطف اٹھائے کہ جشن جمشیدی کا مزا بھول گئے ؎

دعوتیں بھولے سمرقندی و شیرازی تمام
اسقدر الوانِ نعمت کے لگائے اُسنے خوان

تمام مورخین متفق ہیں کہ اودھ کے فرمانروا عجمی النسل تھے۔ اور اگرچہ اس عمارت کا بنیادی پتھر رکھنے والا ایک نجیب الطرفین سید تھا جو خانہ دامادی کا طعنہ سُنکے اور دل و جگر پر تیغ زبان کا زخم کھا کے وطن اور عزیزان وطن سے منہ موڑنے اور ہندوستان کی طرف رُخ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن اُسکا جانشین (جسے خانہ دامادی ہی کی بدولت یہ عروج حاصل ہوا) شاہ بداغ کی اولاد تھا اور اُسی کی آل اولاد پہلے نواب وزیر اور پھر بادشاہ بنکے سوا سو برس تک اس مُلک کی ڈھائی تین کرور رعایا کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کی۔

اسمیں کچھ شک نہیں کہ وہ باقبال غریب الوطن طالع ہمایوں لیکے دنیا میں آیا تھا کہ جس وقت زمانہ کی بے مہری نے اُسے خانماں خراب کیا اُسوقت ہندوستان کی اسلامی شہنشاہی کا شیرازۂ جمعیت شکست ہو رہا تھا۔ ظاہر فی الجملہ درست تھا مگر "درخت اقبال کی جڑ کو دیمک لگ چکی تھی" وہ پہونچا اور ایسے موقع سے پہونچا کہ دست و بازو کے زور و قوت اور دل و دماغ کے فطرتی جوہر دکھانے کے واسطے اُسے میدان صاف ملا۔ پھر تو تائید غیبی اور مشیت ایزدی نے وہ رنگ دکھائے کہ اگر چشم بینا ہو تو اُس سے بہت کچھ سبق پڑھ لے۔

اگرچہ زمانے کے ظالم ہاتھ نے بادشاہ اور بادشاہت سب کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اور اب ایک افسانہ "سب کہی" کے سوا کچھ رہ نہیں گیا ہے۔ لیکن دلوں کے گرمانے کیواسطے یہ عبرت خیز و درد انگیز "سرگزشت بلاکشاں" بھی کچھ کم نہیں۔ اور اسی لیے راقم الحروف نے قصد کیا ہے کہ مختصر طریقے سے اُس کی پیدائش، اُٹھان اور لہلہاتی جوانی کی داستان حوالۂ قلم کروں۔ شاید کسی دن ناصبور کو اُس کے

دیکھنے سے عالم کی بے ثباتی اور شادی وغم دُنیا کی ناپائداری کا حق الیقین ہوجائے اور وہ اُس امتحان صبرو شکیبائی میں پورا اُتر جائے جسمیں ہم سب آئے دن مبتلا رہتے ہیں۔ کیونکہ ؎

ز رنج و راحت گیتی مرنجاں دل و شو خرم
کہ آئین جہاں گہے چناں گہے چنیں باشد

(۲) سلطنت کی ابتدا اور بنیاد

ماجرائے نوجوانی عہد پیری میں نہ پوچھ
رنج ہوتا ہے اب اس قصے[1] کو دوہراتے ہوئے

گزشتہ صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ آسیائے گردش ایام رفتار میں بجلی کی سُرعت دکھا رہی تھی۔ بالائی ہند میں قسمت آزمائی کرنیوالے جانباز حباب آسا عالم فانی کی سطح پر سر اُبھارتے اور تلاطم امواج سے ساحل فنا کی ٹکریں کھا رہے تھے۔ خدا جانے کتنوں نے سر اُبھارا اور رہ گئے۔ سیکڑوں غنچے کھلنے بھی نہ پائے کہ مرجھا گئے۔ چند ایسے بھی نکلے جنھیں یاوری بخت و سازگاری اقبال کی نسیم نے اپنے جھونکوں سے شگفتہ کیا۔ دنیا کی بہار دیکھی دکھائی۔

انھیں بخت آزما جانبازوں میں سید محمد امین نامے ایک مرد میدان تھے جنھوں نے اودھ کے خاندان شاہی کی بنیاد ڈالی۔ یہ حضرت امام موسیٰ کاظم کی اولاد اور صحیح النسب سید تھے۔ اِن کے باپ

---

[1] اس تاریخی مضمون کے لکھتے وقت کتب مندرجۂ ذیل پیش نظر رہی تھیں۔ انھیں کو اسکا ماخذ سمجھنا چاہیے۔

۱۔ قیصر التواریخ مصنفہ سید کمال حیدر۔
۲۔ مرقع خسروی مصنفہ جناب شیخ عظمت علی صاحب کاکوروی۔
۳۔ تاریخ اودھ المسمیٰ بہ "گلزار ہند" مصنفہ مسٹر اردن صاحب بزبان انگریزی۔
۴۔ کلکتہ ریویو جلد سیوم۔ مضمون تاریخی بابت اودھ۔ مرقومہ سر ہنری لارنس صاحب۔
۵۔ تفضیح الغافلین بزبان انگریزی۔ مترجمہ مسٹر ہوی صاحب۔
۶۔ تاریخ نادر العصر مصنفہ جناب منشی نول کشور۔
۷۔ رہنمائے سیاحان لکھنؤ۔ مصنفہ مسٹر ہلٹن صاحب۔
۸۔ مسلمانان ہند کے مراسم و عادات مصنفہ مسز میر حسن علی۔
۹۔ سیر و سیاحت مسز منڈی صاحب۔
۱۰۔ بعض رسائل متعلق معاملات اودھ جو وقتاً فوقتاً انگلستان میں شائع ہوئے تھے۔

محمد نصیر عرصہ ہوا نیشاپور سے ترک وطن کرکے ہندوستان آچکے تھے اور بہادر شاہ خلف ثانی اورنگ زیب عالمگیر کی ملازمت میں تھے۔ وہ زمانہ وہ تھا کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی زرریزی وگہرپاشی کی داستانیں سن سن کے اسلامی دنیا کے ہر گوشے سے پریشان حال اور تباہ روزگار مسلمان ادھر ہی کا رُخ کرتے اور ”یا قسمت یا نصیب“ کی صدا دیتے اسی ملک میں وارد صادر ہوا کرتے تھے میر محمد نصیر صاحب بھی عسرت اور فلاکت سے حیران پریشان ہو کے گھر سے چلے تو بڑے بیٹے میر محمد باقر کو لے کے ہندوستان میں داخل ہو گئے۔

چھوٹے صاحبزادے میر محمد امین خانہ دامادی کے عیش وتنعم کو چھوڑ کے آنا مناسب نہ سمجھے لیکن بعد چندے باپ کی برگشتگی بخت کا ورثہ بیٹے کو بھی ملا۔ طمانیت خاطر کے پھول سونگھتے سونگھتے طعن وتشنیع کا کانٹا چبھا۔ عیش منغص ہوا۔ سامان راحت موجب صد زحمت ہوا۔ لذات نفسانی پر آلام روحانی نے شبخون مارا۔ قصہ مختصر بھرے پُرے گھر کو چھوڑ کے غریب الوطنی پر کمر باندھنا پڑی۔ ہندوستان کی راہ تو کھلی ہوئی تھی۔ باپ کے نقش قدم پر چل کے یہ بھی اسی ملک میں وارد ہو گئے۔ لیکن ہنوز منزل تک نہ پہونچے تھے راستے ہی میں تھے کہ باپ کے مرنے کی خبر ملی۔ ”اتہم بالاست الم“ سمجھ کے راضی برضا ہو گئے اور تقدیر الٰہی پر شاکر ہو کے ہمت نہ ہارے۔ کچھ دن مختلف مقامات میں بسر کرکے آخر کار شاہجہاں آباد پہونچ گئے یہاں اگرچہ شہنشاہی کے کارخانے درہم وبرہم ہو چلے تھے پھر بھی ایسے ذی جوہر سپاہی منش شرفا کے واسطے معیشت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ یہ بھی پہونچے تو بعض امرائے دربار کی قدر شناسی سے بے سروسامان نہ رہے۔ چند ہی روز میں حیثیت آبرو سے درست ہو گئے۔ مگر دماغ ہفت ہزاری لائے تھے۔ زیادہ دنوں تک کسی سے صحبت برار نہ ہوسکی۔ بالآخر دربار میں رسائی ہو گئی۔ اب فرخ سیر کا عہد تھا جوہر شناس بادشاہ نے ”بالائے سرش زہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی“ پر نظر کرکے تواضع وتکریم سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خلعت سرفرازی عطا فرمایا۔ اور پہلے باڈی گارڈ کا کمانڈر مقرر کرکے حلقہ بگوشی کی دستاویز پر تقرب واختصاص کی مُہر کی۔ پھر بعد چندے آگرے کا صوبہ دار کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ سادات بارہہ دربار کے مالک سلطنت وشہنشاہی کے مالک۔ بلکہ بادشاہ کے جسم وجان کے مالک ہو رہے تھے سید عبداللہ اور سید حسین علی دونوں بھائیوں کا طوطی بول رہا تھا۔ انکی ترقیوں۔ سربلندیوں پر عروج واقبال بھی چشمک زن تھے۔ لیکن انجام بینی کی آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں۔ محسن کشی اور ناسپاس گزاری جلادی پر ہر وقت کمر بستہ رفاقت میں تھیں۔ جنھیں یار وفادار سمجھے تھے وہی ظالم غدار نکلے [illegible] کی پتلی بنا کے رکھا تھا وہی نورنگاہ کے دشمن بنے۔ جو چیز جان جاتی تھی انھوں نے سچ، [illegible] رخ سیر کی جان

گئی اور محمد شاہ نے سلطنت پائی۔ شاہانہ راحت طلبی کے رویہ پر عیش و عشرت کا سکہ جما۔ دن عید رات شب برات کا سماں نظر آیا۔ راگ و رنگ سرود و انبساط کے نقارخانے میں معدلت پناہی اور ترہ زدوانی کے طوطی کی صدا کسے سنائی دیتی۔ کہاں کی سلطنت۔ کہاں کی حکومت ع یہاں دماغ نہ تھا خندہ ہائے بیجا کا۔ بالآخر "کردنی خویش زدنی پیش" کا ماجرا پیش نگاہ ہوا۔ سادات بارہہ کا اقبال گھٹا۔ زوال بلکہ استیصال ہوا۔ پشتینی نمک خواروں اور قدیمی جان نثاروں نے سازش کرکے دونوں کو زیر کیا۔ ایک ایک کرکے موت کے گھاٹ اتارا۔ کہتے ہیں اس سازش میں میر محمد امین نے بہت جوہر دکھائے۔ خوب حق نمک ادا کیا۔ اور اسکا صلا یہ ملا کہ سعادتخاں برہان الملک کا خطاب پایا۔

اگرچہ سادات بارہہ کے استیصال سے عیش پسند بادشاہ کو بہت کچھ آزادی و فارغ البالی نصیب ہوگئی لیکن ملک بھر میں جو طوائف الملوکی برپا تھی اسکا کچھ علاج نہ ہوا۔ نظم و نسق کی باگیں ڈھیلی ہوچکی تھیں اور بدلگام منہ زور جانوروں کی روک تھام آسان نہ رہی تھی۔ آئے دن ایک نہ ایک طرف سے تردد انگیز خبریں اور وحشت خیز اطلاعیں دربار میں پہنچتیں اور راحت میں خلل ڈالتیں۔ ابتری و بے امنی کے چرچے عیش منغص کرتے۔ عین اسی زمانہ میں صوبہ اودھ [illegible] لکھنؤ کی شورہ پشتی و سرہنگی کی خبریں پیاپے پہونچنے لگیں۔ اور ان گرما گرم رپورٹوں کو سنتے سنتے آخرکار اسکے تدارک پر توجہ ہوئی اور یہ تجویز ہونے لگی کہ کون مرد میدان وہاں بھیجا جائے۔ جو تسلط جمائے۔ اکھڑی ہوئی حکومت جمائے۔ الٹی ہوئی بساط پھر بچھائے۔ اتفاق یہ کہ جو حریفان غدار اس جانباز سید کی ترقی جاہ و منصب سے ہر وقت خار در جگر رہتے تھے انکے دلوں میں بھی سمائی کہ کسی طرح اسے "از دیدہ دور از دل دور" کرکے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ چنانچہ یہی حیلہ نکال کے سب نے اپنی ہمت اسی پر مصروف کردی کہ کسی طرح برہان الملک ہی کو یہ خدمت تفویض ہوجائے۔ جوڑ توڑ لگائے۔ سازشیں کیں اور آخرکار کانٹا سمجھ کے دربار سے نکالا۔ لیکن خدا کی مشیت کون جانتا تھا اور یہ کسے خبر تھی کہ یہی کانٹا کبھی گلدستۂ رنگا رنگ کی مہک گلشن ہستی میں پھیلائے گا۔ خرابے میں چمن زار کھلائے گا اور زمین شور میں سنبلستان کی بہار دکھائے گا۔ سچ ہے ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

برہان الملک کو داری ملی۔ اور اودھ کے سرکش و سرہنگ زمینداروں کی قلع

قمع کرنے اور شہزادگان لکھنؤ کے تنبیہ و انقیاد بنانیکی مہم سپرد کی گئی مگر اس بے سروسامانی کے ساتھ کہ نہ فوج دی گئی نہ نقد و جنس یا سامان حرب سے کوئی اعانت کی گئی۔ لیکن تقدیر الٰہی میں تو یہی لکھا جا چکا تھا کہ یہ مہم وہی سر کریگا اور اسی مہم سے اُسکے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر پہونچیگا۔ لاکھ مزاحمتیں کوئی پیش کرے کیا ہوتا ہی۔ چنانچہ باوجود اس بے سروسامانی کے اس مرد میدان نے ہمت نہ ہاری۔ اپنی ہی قوم مغلیہ کے شکستہ حال بیکاروں کی ایک فوج بھرتی کی۔ اُمیدوں کا سبز باغ دکھایا۔ انعام و اکرام کے وعدوں سے جی بڑھایا۔ یہ لوگ زمانہ کی کلفتوں سے بہ تنگ اور معیشت کی فکروں سے جاں بلب تو تھے ہی آنا سہارا پا کے اُٹھ کھڑے ہوے۔ اچھی خاصی فوج بھرتی ہوگئی۔ اور فوج بھی کیسی کہ جسکا ایک ایک متنفس ہر وقت مارنے مرنے پر کمر بستہ۔ جان ہتھیلی پر لئے ہوے۔ پھر اسیطرح ساز و سامان حرب و ضرب کی فراہمی کا عقدہ بھی ناخن تدبیر سے کھولا۔ اور کوچ بول دیا۔ میان راہ اکبرآباد۔ کیٹھرا اور فرخ آباد چھوتے ہوے اور ہر مقام کے صوبہ داروں سے دعوت و مدارات کے عوض سامان جنگ۔ اور آئین اخلاق و مہمان نوازی رسمی کے بدلے صلاح و مشورۂ مناسب وقت لیتے ہوے اودھ پہونچے۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ ان سب میں صوبہ دار فرخ آباد نے زیادہ حق دوستی ادا کیا۔ وہ بوجہ قربت و ہمسائگی اودھ کے حالات اور شہزادگان لکھنؤ کے تمرد اور جبروت و سطوت سے واقف تھا اُسنے صلاح دی کہ یوں تحت اللفظ بے سیاق نہ چلے جانا۔ پہلے ذرا نواح کے قصبات میں سکہ جمانا۔ وہاں کے رئیسوں۔ شریفوں سے راہ و رسم پیدا کرنا۔ اُنکو اپنے سے ملانا اور ایسا برتاو کرنا کہ ضرورت کے وقت وہ تمہاری حمایت کر سکیں۔ کیونکہ یہ لوگ ساتھ دینے پر جلد اُٹھ کھڑے ہونگے۔ بات پتے کی تھی۔ دل میں بیٹھ گئی۔ نواب نے اسی پر عمل کیا پہلے قصبۂ کاکوری میں داخل ہوے" یہاں کے شیوخ اہل لکھنؤ کے سراسر خلاف اور اُنکی شرارتوں سے تنگ تھے۔ نواب کا آنا اپنا مزید اقبال سمجھے اور شریک صلاح دولت نواب ہوے" سب طرح کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا۔ گھاتیں بتائیں۔ نیک راہیں سجھائیں۔ قصہ مختصر۔ نواب لکھنؤ میں داخل اور بڑی آن بان سے داخل ہوے۔ نہ مقابلہ ہوا۔ نہ صف آرائی کی نوبت آئی۔ بعد چندے کچھ زور شمشیر اور کچھ حسن تدبیر سے تمام صوبے پر تسلط ہو گیا۔ سرکش زیر۔ سرہنگ پامال ہوے انتظام کی چول بیٹھی۔ مالی ملکی آئین بندھے۔ بدامنی دور۔ بے امنی کافور ہوئی۔ اسے نواب کا اقبال سمجھو یا کارگزاروں کی حسن کارگزاری کہو کہ وہی صوبہ جسکی نادہند اور سرکش رعایا نے کبھی صوبے کی جمع سرکاری ستر لاکھ سے بڑھنے ندی پہلے ہی سال بلا جبر و اکراہ ایک کرور سات لاکھ وصول ہوا۔ اور آخر آخر تو معافیات جاگیرات ملا کے دو کرور کے قریب تحصیل ہو گئی۔ نیت بخیر تھی۔ تو کام بھی اچھے بن پڑے۔

اور انجام بھی نیک ہوا۔ اقبال بھی یاور تھا کہ جس معرکہ میں گئے فتحمند لوٹے۔ جس مہم کو سر لیا سر کرکے چھوڑا باجی راؤ مرہٹہ کا کالپی کے مقام پر مقابلہ اسکا شاہد ہے کہ اُدھر لاکھوں کا دل بادل ادھر صرف چودہ ہزار سوار اور پھر فتح کا سہرا نواب ہی کے سر رہا۔ مرہٹے پسپا اور شکستہ دل ہو کے میدان سے نکل بھاگے اسی طرح نواب کے فکر صائب کا حال اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ نادر شاہ کے معاملے کو دو کرور روپیے پر طے کر لیا تھا۔ مگر در اندازوں اپنی بات بالا رکھنے والوں نے رخنہ ڈالا۔ معاملہ بگاڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بائیس کرور زر نقد نوے لاکھ کے جواہرات اور مزید براں شاہجہاں کی جان تخت طاؤس اور اُس کے ساتھ دریاے نور اور کوہ طور دونوں ہیرے بھی گئے اور خزانۂ ہند بے چراغ کر گئے۔ طرہ یہ کہ غمازوں نے اُلٹی گنگا بہائی۔ بھولے بھالے بادشاہ کا دل نواب سے آزردہ کر دیا۔ دونوں طرف کدورت نے راہ پائی۔ آئینۂ خاطر زنگ آلود ہو گئے۔ نواب کو اسکی تاب کہاں تھی۔ گھبرا گھبرا کے دعا مانگنے لگے کہ "الٰہی عزت و آبرو کے ساتھ جلد خاتمہ بخیر کیجیو" آخر دعاے سحرگاہی اور نالہ ہاے نیم شبی نے رنگ دکھایا۔ داعی اجل کو لبیک کہی سنہ ۱۱۵۱ ہجری کا چل چلاؤ یعنی ذی الحج کی آخری تاریخ میں بصد حسرت دنیا سے عاجز اور اہل دنیا کے ہاتھوں پریشان ہو کے عالم جاودانی کی راہ لی۔

نواب بُرہان الملک کے محاسن اخلاق کے بیان میں سب مورّخ رطب اللسان ہیں۔ انگریزی مورخ بھی مانتے ہیں کہ بُرہان الملک نے اودھ میں بہت انتظامات قائم کیے۔ زیردستوں کو زبردستوں کے آزار سے پناہ دی۔ اور غریب رعایا کو سنگدل زمینداروں کے جور و جفا سے گلوخلاص کیا۔ اور وہی پہلا شخص تھا جسنے یہ منصوبہ باندھا کہ اودھ میں ایک مستقل حکومت کسی وسط کے مقام پر قائم کرنا چاہیئے اور غالباً ایسا ہی کوئی منصوبہ تھا جسکی وجہ سے اجودھیا اور لکھنؤ میں اُنکا زیادہ تر قیام ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ اودھ کی صوبہ داری ملنے کے بعد بھی درباری سازشوں اور پولیٹکل پیچیدگیوں میں بہت کچھ حصہ لینا پڑتا تھا۔ مگر حتی الامکان نواب نے اپنی تمام تر ہمت اپنے صوبہ کی ترقی اور وہاں کی رعایا کی فلاح بہبود پر مصروف رکھی۔ چنانچہ جسقدر اس ملک کے لوگ نواب سے مانوس اور اُنکے گرویدہ ہو گئے تھے اتنا کسی سے نہوے۔ نواب نے اپنے مرنے پر خزانہ مالامال چھوڑا۔ جسکے بابت ایک منصف مزاج مورخ کا بیان ہے کہ "ممکن ہے کہ یہ خزانہ رعایا سے جبر و تعدی کرکے بھرا گیا ہو۔ لیکن اتنا ضرور ہی کہ جو کچھ وصول کیا گیا تھا امیروں دولتمندوں سے وصول کیا گیا تھا۔ غریبوں فاقہ کشوں کے مُنہ سے نوالہ چھینا نہیں گیا" خیر۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

نواب برہان الملک نے کوئی اولاد نرینہ نہ چھوڑی۔ اس لیے اُنکے مرنے پر اودھ کی صوبہ داری کے دعویدار ادھر تو شیر جنگ (بھتیجے) اُدھر صفدر جنگ (بھانجے اور داماد) اُٹھ کھڑے ہوے۔ ایک نے اسلام کا قانون وراثت اپنے حق کے مرجح ثابت کرنے کو پیش کیا۔ دوسرے نے برہان الملک کے برتاؤ اور اپنی سابقہ جاں نثاریوں کو وسیلہ گردانا۔ دونوں طرف سے سازشیں ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ شیر جنگ نے نادرشاہ کا دامن تھاما۔ لیکن صفدر جنگ کی پیشانی پر کاتب تقدیر نے اقبال ہی اقبال لکھ دیا تھا۔ اُسکی بات بالا رہی اور اُسکے دعوے کے سامنے کسی کی کچھ نہ چلی۔

نواب برہان الملک کے عہد حکومت میں اس صوبہ کے حدود یہ تھے۔ جنوباً کنارہ دریاے گنگ اور شمالاً دریاے راپتی۔ شرقاً عظیم آباد غرباً شاہ آباد۔ کُل رقبہ ۲۳۹۲۳ میل۔

(۳) عہد حکومت ابوالمنصور خاں صفدر جنگ

اصلی نام مرزا محمد مقیم تھا۔ برہان الملک کے بھانجے اور جعفر خاں بیگ کے بیٹے قوم قرا ترکمان سے تھے۔ چھ مہینے کے تھے کہ ماں کا سایۂ عاطفت سر سے اُٹھ گیا۔ بے سروسامانی یہ تھی کہ خالہ نے اپنا دودھ پلا کے پالا۔ بھلا اُسوقت نیشاپور میں کسے یہ تصور ہو سکتا تھا کہ یہ بچہ ایسے فرخندہ طالع لیکر آیا ہے کہ کسی زمانہ میں امیر تیمور اور بابر کی اولاد کی دستیاری کریگا۔ اور اُسکی نسل مملکت ہندوستان کی پولیٹکل شطرنج میں معرکے کی چالیں کھیلے گی لیکن جسوقت گلشن ہستی میں یہ شگوفہ کھلا تھا اُسیوقت قضا و قدر کے محکمے سے یہ حکم محکم جاری ہو چکا تھا کہ اسکے زائچے میں ماموں کے زائچے سے زیادہ ستارے اکٹھا کر دیے جائیں۔ وزارت اور بادشاہت سب کچھ لکھ دیا جائے۔

ابتدائی حصۂ زندگی جیسی کچھ افسردگی اور پریشانی خاطری سے گزرا ہوگا اُسکا پوچھنا کیا ہے۔ نانا اور ماموں فکر معیشت سے تنگ ہو کے آوارہ وطن ہوے۔ خالہ کے دودھ نے جان بچائی۔ دائی تک میسر نہ تھی۔ لیکن ادھر بچے کے دماغ میں باغ نوجوانی کی بو پہونچنے لگی۔ اُدھر ہندوستان سے ماموں کی شمیم اقبال کی مہک گھر بھر کو خوش دماغ بنانے لگی۔ برہان الملک کے اقبال و دولت کی جوانی بھانجے کے شباب سے معاصر ہوئی۔ برہان الملک نے بہن اور بھانجے کو ہندوستان بلا بھیجا اور اپنی بیٹی صدر جہاں بیگم سے شادی کر کے عروس سلطنت سے وابستہ کر دیا بلکہ یہ کہنا چاہیے خانہ داماد سلطنت بنا دیا۔ پھر دربار میں تقریب کر کے خطاب بھی دلوا دیا۔ اور کچھ خدمتیں بھی سپرد کرا دیں۔ جس طرح نواب برہان الملک کے وقت میں نادر شاہ کا واقعہ پیش آیا تھا اُسی طرح صفدر جنگ کے وقت میں

احمد شاہ ابدالی کا ہنگامہ درپیش ہوا۔ برہان الملک کا ستارہ اقبال اُسوقت جھلملانے لگا تھا سو جسسے اُنکے ہاتھوں ہم سر نہ ہو سکی۔ برخلاف اسکے صفدر جنگ کا دریائے اقبال زوروں پر تھا جب یہ ہنگامہ اُٹھا اگرچہ حاسدوں بداندیشوں نے بہتیرا چاہا کہ یہ اس معاملے سے الگ تھلگ رہیں مگر ؎

چراغے را کہ ایزد برفروزد
کسے کو پف زند ریشش بسوزد

خدا کی مشیت تو یہ تھی کہ اس معرکے میں صفدر جنگ کی سرفروشی اور جان نثاری کے جوہر آشکارا ہوں اقبال منہ دکھائے۔ جاہ و حشم زیادہ ہو۔ چنانچہ شاہزادہ احمد شاہ کی رفاقت میں یہ بھی میدان جنگ میں تھے۔ اور اپنی دلیری و جانبازی سے شاہزادے کا دل اپنے ہاتھ میں لے رہے تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ نواب نے فقط اپنی قوم مغلیہ سے بڑی جوانمردی سے معرکہ آرائی کی اور ابدالی کو شکست دی۔ اسی لڑائی میں نواب کی بائیں آنکھ میں تیر لگا۔ آنکھ جاتی رہی اور حدقۂ چشم میں بلوری آنکھ رکھنے لگے۔ پھر۔ بعد فتح و فیروزی شاداں و فرحاں دہلی آرہے تھے کہ پانی پت کے مقام پر رنگیلے بادشاہ کے مرنے کی خبر ملی۔ اور صبح گجردم شاہزادے کے حضور میں حاضر ہو کے تخت و تاج کی مبارکباد دی۔ کہتے ہیں اُسوقت تاج نہ ملا تو بانس کی تیلیوں کا تاج بنا کے اُسمیں جواہر ٹانکے۔ موتیوں کی جھالر لگائی۔ اور اپنے ہاتھ سے شاہزادے کے سر پر رکھا۔ مبارک سلامت کا غل مچایا۔ شاہزادے کے مُنہ سے مسرت کے جوش میں بے اختیار نکل گیا کہ "ہمیں یہ سلطنت تمھیں اسکی وزارت مبارک" نواب نے نذر دکھائی آداب شکریہ بجا لائے اور جلد جلد سفر کر کے شاہجہاں آباد داخل ہو گئے۔ تقدیر کے کارخانے دیکھو تو ابدالی کے معرکے میں دربار کے بڑے مقرب اور سرکار کے بڑے جان نثار نذر اجل ہو چکے تھے۔ صفدر جنگ کے واسطے میدان خالی تھا۔ دہلی پہونچتے ہی پہلے میر آتش یعنی افسر توپخانہ کا عہدہ اور بعد چندے سنہ ۱۷۴۷ء میں وزیر الممالک کا خطاب اور اس عظیم الشان شاہنشاہی کا قلمدان وزارت ملگیا۔ ماموں نے جس بات کی تمنا میں جان دی۔ بہت کچھ پاپڑ بیلے۔ اور نہ ملی۔ بھانجے کو بے کشش و کوشش باتوں باتوں میں مل گئی۔ اب وہ صوبہ داری کا لقب اُڑ گیا اور اُسکی جگہ نواب وزیر اودھ لکھا جانے لگا۔

صفدر جنگ کا زمانہ اودھ کے واسطے سکون و اطمینان کا زمانہ نہ رہا۔ دربار کے کاروبار سے مہلت بہت ہی کم ملی۔ کہ اسطرف توجہ کیجاتی۔ حتیٰ کہ ایکبار چند روز کے واسطے اودھ پر احمد خاں بنگش نواب فرخ آباد اور اُسکے ساتھی پٹھانوں کا عمل دخل ہو گیا۔ اور جب صفدر جنگ کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہ سورج مل جاٹ (سردار بھرت پور) کو ساتھ لے کے دہلی سے چلے۔ لیکن احمد خاں نے جمعیت قلیل سے ہزیمت دی۔ صفدر جنگ کو ناشاد و نامراد پلٹنا۔ اور صوبے کو پٹھانوں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا پڑا۔ لیکن اِدھر تو

پٹھانوں میں باخود باہم مناقشات شروع ہوگئے۔ جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ اُدھر سفدر جنگ نے ملہار راؤ کو بسر کردگی اسّی ہزار مرہٹہ کے ایک کروڑ کا وعدہ دیکر ساتھ لیا اور اُسکے بل پر یلغار کردی۔ اس جمعیت کثیر کے مقابلہ کی تاب و طاقت پٹھانوں کو کہاں تھی۔ بھاگ نکلے۔ اور سفدر جنگ کی حکومت کا نقشہ پھر اودھ کی بساط پر جمگیا۔ لیکن بعد چندے بعض واقعات ایسے پیش آئے جیسے حریفان غماز کو موقع ملگیا اور اُنھوں نے بادشاہ کو نواب سے برانگیختہ کردیا۔ ایک خواجہ سرا کے قتل کی شرکت کا جُرم قائم کرکے اپنے معتمد الخدمت رُکن رکین سلطنت کو نظروں سے گرانا چاہا۔ اُسوقت اگر اتنی ہی عقلیں درست ہوتیں کہ قاتل و مقتول کی جانوں کی قدر شناسی کیجاتی تو سلطنت ہی کیوں جاتی۔ اندھا دُھند کارخانہ تھا جسنے جو چاہا لگائی بجھائی کردی اور جس جان نثار "یار وفادار" کو چاہا نظروں سے گرادیا۔ جب صفدر جنگ نے دربار کا رنگ بدلا دیکھا۔ بادشاہ کی آنکھ پھری پائی آشفتہ و دلگیر ہوکے اپنے صوبے کی راہ لی۔ اور آخر عمر کے ۱۵۔ برس فیض آباد میں بسر کیے۔ اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ ہر طرف صوبہ دار تمرد اور سرکشی پر آمادہ ہو رہے تھے۔ ہر فرعون بے سامان انا و لا غیری کا نعرہ بلند کررہا تھا۔ مرہٹے۔ جاٹ اور سکھ انانیت سے مست ہوکے اسطرح شورش کررہے تھے جیسے جسم بیمار میں پھوڑے پھنسی۔ امن و امان کے دشمنوں نے بیچارے بادشاہ کی زندگی تلخ کردی۔ اور آخرکار جب کھرے کھوٹے کا حال کھل گیا۔ مرغان دست پرور کی بیمہری و طوطا چشمی کے جوہر آشکارا ہوگئے۔ تب بادشاہ نے صفدر جنگ کو یاد کیا کہ "جلد فوج قاہرہ لیکے حاضر ہو۔ کور نمک بدخواہوں نے جاں لب کر رکھا ہے" لیکن صفدر جنگ کا پیمانہ عمر لبریز ہوچکا تھا۔ جان نثاری نے کئی بار اُکسایا کہ چلنا چاہیے مگر مرض الموت نے ہر مرتبہ قدم پکڑ لیے کہ "ابھی کہاں چلے۔ چار کے کاندھوں پر چلنا" چنانچہ سنہ ۱۷۵۴ء اکتوبر کا مہینہ تھا کہ اُسی عارضے میں انتقال کیا جو ماموں سے صوبہ داری کے ساتھ ورثہ ملا تھا۔

اودھ میں صفدر جنگ کی یادگار۔ فیض آباد ہے۔ اسکی بنیاد تو برہان الملک ہی ڈال گئے تھے۔ لیکن اُسکی ساری آبادی صفدر جنگ کے دم قدم سے ہوئی۔ لکھنؤ میں بھی گومتی کا پُل انہیں صفدر جنگ ہی نے بنوانا شروع کردیا تھا۔ ناتمام رہا۔ آصف الدولہ کے ہاتھوں انجام کو پہونچا۔

(۴) شجاع الدولہ بہادر

انکا اصلی نام جلال الدین حیدر مرزا۔ اور پورا خطاب شجاع الدولہ بہادر ابو المنصور خاں اسد جنگ فدوی احمد شاہ بادشاہ تھا۔ صفدر جنگ کے بیٹے اور برہان الملک کے نواسے تھے۔ سنہ ۱۱۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ہوئی ؎

ز دولتخانۂ نواب منصور　　بر آمد آفتاب از مطلع نور

ابتدائی عمر شاہزادگی کی شان سے بسر کی۔ ۱۱۶۶ھ میں مطابق ۱۷۵۲ء بائیس برس کے سن شباب میں مسند نشین وزارت ہوئے۔ کچھ آمنگ جوانی کی کچھ حکومت کا نشہ۔ طبیعت میں مے دو آتشہ کا زور تھا۔ اُسپر مغلیہ سلطنت کے روز افزوں تنزل اور تباہی کو دیکھکر یہ بھی سوچے کہ بہتے دریا میں ہاتھ دھو لینا چاہیے کشور کشائی کا حوصلہ پیدا ہوا۔ ہمت عالی اور عزمیت بلند نے نچلا بیٹھنے نہ دیا۔ اتفاق یہ کہ اس زمانہ میں عالمگیر ثانی تخت دہلی پر جلوہ فرما تھے۔ اور غازی الدین وزیر کے ظلم وستم سے تنگ ہو کے شہزادہ علی گوہر ولیعہد سلطنت اپنی جان چھپاتے پھرتے تھے۔ ۱۷۵۸ء میں شجاع الدولہ سے ملاقات ہوگئی۔ اُنھوں نے شہزادے کی دلجوئی کی۔ تسلی دی۔ محمد قلی خان سے ساز کیا اور دونوں نے مل کے شہزادے کی رفاقت میں بنگال پر حملہ کر دیا۔ لیکن یہاں انگریزوں کا سال بھر سے (یعنے فتح پلاسی کے بعد سے) عملہ دخلہ تھا۔ ولیعہد بہادر تو ان افکار میں مصروف و منہمک تھے اُدھر پایۂ تخت کا یہ حال تھا کہ بیس پچیس لاکھ مرہٹے دہلی کو گھیرے ہوئے تھے۔ خلقت دھڑکوں سے جاں بلب تھی اور بادشاہ سلامت کے ارکان دولت بالکل دست پاچہ ہو رہے تھے۔ آخرکار۔ ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کا معاملہ ہوا۔ یعنی احمد شاہ دُرّانی نے یہ حال دیکھ کے بیکس اور بے بس بادشاہ کی ہمدردی کی اور اپنی فوج سے مرہٹوں کا مقابلہ کرنا چاہا۔ چنانچہ پانی پت کے میدان میں ہنگامۂ کارزار گرم ہوا۔ شجاع الدولہ کی بجلی طبیعت۔ جوانی کے زور۔ رفاقت وہوا خواہی کے جوش سے بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے آڑے وقت آنکھ چُرا جائیں۔ یہ بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت میداں میں پہونچگئے۔ اور شجاعت کے جوہر دکھانے لگے۔ ہنوز یہ قضیئے طے نہیں ہوے تھے کہ نومبر ۱۷۵۹ء میں عالمگیر ثانی کو وزیر الممالک نے شہید کر ڈالا۔ پانچ چھ دن تک بڑی گڑبڑ مچی رہی تخت سلطنت خالی رہا۔ بالآخر شہزادۂ علی گوہر شاہ عالم بنکے سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اور شجاع الدولہ کو وزارت کی کرسی ملی۔ شجاع الدولہ کی بلند حوصلگی کے واسطے اب بڑا میدان ملگیا۔ نئی بساط بچھی۔ نئے مہرے قائم ہوے۔ نئی چالیں کھیلی جانے لگیں۔ اتفاق یہ کہ اب شطرنج کھیلنے والوں میں ایک نیا فریق پیدا ہوگیا تھا۔ یہ انگریز تھے۔ جنھوں نے بنگال کی سرزمین میں اپنی ڈال رکھی تھی۔ پلاسی کی لڑائی میں انگریزی اسلحہ کے جوہر کھلے تو ایسے کھلے کہ بہتیروں کی آنکھوں کو چکا چوندھ لگ گئی۔ اُس ہنگامے نے ہر خفتہ وبیدار کو خبردار کر دیا اور اب اُنپر رقابت کی کڑی نگاہیں سب طرف سے پڑنے لگیں۔ شجاع الدولہ کی نئی نئی اُمنگ سے دیکھتے یہ کچھ بعید نہ تھا کہ اُنھوں نے بھی ابتداءً انگریزوں

کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ وہ خود دل میں ہزاروں منصوبے باندھے ہوئے تھے۔ انھیں سنگ راہ دیکھ کے ضبط نہ ہو سکا۔ سمجھے لاؤ پہلے انھیں کا وارا نیارا کر ڈالیں۔ اُدھر نواب قاسم علیخاں انگریزوں سے چرکا کھا کے جو چلے تو شجاع الدولہ کو مرد میدان سمجھ کے انھیں کیطرف مُڑے۔ یہ تو ایسا موقع خدا سے چاہتے تھے۔ فوراً حمایت و سرپرستی پر رضامند ہو گئے۔ مستزاد یہ کہ شاہ عالم بھی انھیں سب کے شریک حال ہو گئے اور شہ دینے لگے۔ القصہ ایک مدت تک ہنگامۂ جدال و قتال بمقام پٹنہ گرم رہا۔ دونوں طرف سے دلیران جانباز نے داد شجاعت خوب دی لیکن فتح و شکست امور تقدیری ہیں۔ اور محکمۂ قضا و قدر سے انگریزوں کے خورشید اقبال کا طلوع اسی مطلع سے مقدر ہو چکا تھا۔ اتحاد ثلثہ نے لاکھ زور مارے۔ بیحد جد و کد کی۔ لیکن تثلیث کے ماننے والوں کی یکتائی اپنا کام کر گئی۔ بکسر کے مقام پر سارا بھرم جاتا رہا۔ انگریز غالب و فتحمند۔ میر قاسم اور شجاع الدولہ مغلوب و ہزیمت خوردہ ہو گئے۔ قسمت کی نیرنگی تھی کہ قلت نے کثرت پر فتح پائی۔ یکہ و تنہا نے دوہری تہری چوٹیں بچائیں۔ اور سب کو میدان سے بھگا دیا۔ خیر۔ جنگ کا جو انجام ہوا وہ ہوا۔ شجاع الدولہ پھر بھی گھاٹے میں نہ رہے۔ انھیں تین سو اسی ہاتھی جنپر مرشدآباد کی صدہا برس کی کمائی بار تھی۔ خزانہ۔ زر و جواہر۔ اشرفیاں۔ اور خدا جانے کیا کیا نفائس تھے ہاتھ لگ گئے۔ مورخین کا بیان ہے کہ جب شجاع الدولہ شکستہ دل ہو کے بکسر سے لوٹے تو بیوی بچوں کو بخشی الممالک[1] کی حفاظت و حراست میں چھوڑ کے آپ جریدہ بریلی ہوتے ہوئے نواب احمد خاں بنگش پاس فرخ آباد پہونچ گئے۔ اگرچہ احمد خاں بنگش کے دل میں صفدر جنگ کے وقت کا کینۂ دیرینہ باقی تھا۔ لیکن شجاع الدولہ کو اسطرح سراسیمہ اور طالب ہمدردی و اعانت دیکھ کے اُنھوں نے شان ریاست دکھائی۔ دل کھول کے ملے تواضع تکریم سے پیش آئے اور یہ صلاح دی۔ کہ انگریزوں سے صلح و آشتی کرنا۔ اور بہ لطف و آشتی پیش آنا چاہیے چنانچہ شجاع الدولہ نے اُسے قبول کیا اور اسباب میں ریشہ دوانی شروع کی۔ آخر کار ۱۷۶۵ء میں بمقام بنارس ایک عہدنامہ انگریزوں سے ہو گیا۔ جس کی رو سے یہ طے پا گیا کہ نواب اور کمپنی دونوں ایک دوسرے کے معین غمخوار و غمگسار ہو جائیں۔ ایک کا دوست دوسرے کا دوست ہو اور ایک کا دشمن دوسرے کا بھی دشمن۔ نواب اپنی فوج کی تعداد صرف پینتیس ہزار کر دیں جنمیں دس ہزار سوار ہوں۔ دس ہزار پیدل پانسو توپخانے والے۔ اور ساڑھے نو ہزار بقاعدہ جمعیت۔ اور اسمیں صرف پیدل فوج کی ترتیب اور ہتھیار یوروپین ہوں۔ اس عہدنامے سے شجاع الدولہ کے دوستانہ تعلقات انگریزی کمپنی سے قائم

---

[1] ان کا پورا خطاب مظفر الدولہ بخشی الممالک ابو البرکات خاں تہور جنگ تھا۔ یہ قصبۂ کاکوری کے رہنے والے اور راقم کے اجداد میں تھے۔ مولف

ہو گئے۔ بڑا کھٹکا تھا۔ دل مطمئن ہوگیا۔

۱۷۷۳ء میں ایک نیا شگوفہ کھلا۔ کسی رقیب امن و عافیت نے وارن ہیسٹنگز (گورنر جنرل) کو شجاع الدولہ سے بدظن اور مشکوک کر دیا۔ وہ گھبرا کے بنارس چلے آئے اور شجاع الدولہ سے ملاقات کی آرزو ظاہر کرنے لگے۔ چنانچہ یہ بھی بنارس پہونچے۔ ملاقات ہوئی۔ ملاقات ہوتے ہی طرفین کے آئینۂ خاطر صاف ہو گئے۔ کدورتیں ہٹ گئیں۔ اور ایک جدید عہدنامہ ہوگیا۔ جسکی رو سے یہ طے پا گیا کہ الہ آباد اور کوڑا کے ضلع جو شاہ عالم کو واسطے دے رکھے گئے تھے کہ عزت و آبرو سے زندگی بسر کریں۔ اور بادشاہت کی پگڑی سنبھالے رہیں اب اُنسے لے لئے جائیں کیونکہ وہ بالکل کٹھ پتلی کی طرح مرہٹوں کے ہاتھ میں ہوگئے ہیں۔ اور خلاف عہدنامہ ۱۷۶۵ء اُنھوں نے یہ ضلعے بھی مرہٹوں کے ہاتھ میں دے رکھے ہیں۔ اور پھر یہ کہ اضلاع نواب وزیر کو تفویض کر دیے جائیں اور وہ اُنکے معاوضے میں پچاس لاکھ روپیہ کمپنی کی نذر کریں۔ یہ بھی اس معاہدے میں طے ہوگیا کہ اخراجات فوجی کیواسطے دو لاکھ دس ہزار روپیہ ماہوار کمپنی کے خزانے میں داخل ہوا کرے۔ جس سے دو یورپین۔ اور چھ سپاہیوں کی پلٹنیں اور ایک کمپنی توپچیوں گولہ اندازوں کی اودھ کی اعانت اور کمک کے واسطے ہر وقت طیار رہے شجاع الدولہ نے یہ سب شرطیں منظور کرلیں۔ زیادہ تر اسوجہ سے کہ اب اس زمانے میں روہیلوں سے کسی قدر ان بن ہو چلی تھی اور شجاع الدولہ کا منصوبہ یہ تھا کہ اُنکو پامال کرنا چاہیے۔ چنانچہ اُنھوں نے وارن ہیسٹنگز سے اپنا مکنون خاطر ظاہر بھی کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ روہیلے انکے پر حملہ کرنیوالے ہیں۔ لہذا اُنکی روک تھام کرنا ضروری ہے۔ پھر مرہٹوں کے معاملے میں جو چالیس لاکھ روپیہ اُنپر واجب الادا ہے وہ بھی ہنوز وصول نہیں ہوا ہے۔ لہذا اگر ایک بریگیڈ انگریزی فوج کی مل جائے تو وہ دو لاکھ دس ہزار روپیہ ماہوار بخوشی دیا کرینگے۔ وارن ہیسٹنگز نے بھی اسے مصلحت وقت جانکے قبول و منظور کرلیا۔ اسی عہدنامہ کی رو سے یہ بھی قرار پا گیا کہ ایک انگریزی رزیڈنٹ دربار اودھ میں رہا کرے۔ اس عہدنامے کا نتیجہ یہ ہوا کہ روہیلوں سے لڑائی چھڑ گئی۔ اگرچہ اس جنگ و جدل کے نتیجے شجاع الدولہ کے حق میں زیادہ اہم نہیں ہوئے البتہ اتنا ضرور ہوا کہ روہیلے جو اپنی بہادری پر نازاں۔ سرفروشی پر ہر وقت کمربستہ اور جاہلانہ جوش شجاعت سے ہمیشہ مست و بیخود رہتے تھے نیچا دیکھ گئے۔ پست پڑ گئے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تباہ و برباد ہو گئے۔ حافظ رحمت خاں مارے گئے اور اُن کے زن و فرزند بلا میں مبتلا ہو گئے۔

ہنوز روہیلکھنڈ کے معاملات زیر بحث تھے۔ فتح کی مسرت کا آوازہ بلند تھا کہ مرض الموت نے منہ دکھایا۔ ایک مہینے تک زندگی اور موت کی کشاکشی رہی۔ ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء کو یہ جھگڑا بھی طے ہوگیا

موت نے زندگی کو شکست دی۔ اور ۲۶ برس کے سن میں شجاع الدولہ کو بھی وہی دن دیکھنا پڑا جو بہتیروں نے دیکھا ہے اور ہر انسان کو ایک نہ ایک دن دیکھنا ہے۔

شجاع الدولہ کے مرنے سے اودھ کی ترقی اور وسعت کا ایک دور تمام ہوگیا۔ کیونکہ ابھی تک حکمرانان اودھ کی ہمت توسیع مملکت ترقی جاہ و منصب۔ اور اضافۂ اقتدار و سطوت پہ تمامتر مصروف رہی تھی۔ لیکن شجاع الدولہ کے وقت میں انگریزوں کی پشت پناہی اور حفاظت کا سہارا پاکے جو اطمینان و دلجمعی نصیب ہوئی اُسنے آیندہ حکمرانوں کو اپنے مقبوضات پر بخیر و عافیت قابض و متصرف رہنے اور عیش و کامرانی کے ساتھ بفراغت بسر کرنے ہی پر مائل رکھا۔ شجاع الدولہ کی حُسن صورت و سیرت کے باب میں انگریزی مورخین بہت تر زباں ہیں۔ چنانچہ مسٹر وڈ (جو غالباً دل میں شجاع الدولہ سے عناد بھی رکھتے تھے) معترف ہیں کہ "وہ بہت حسین اور خوشرو جوان تھے۔ قد بلند پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ ہاتھ پاؤں چوڑے چکلے تھے۔ بدن پھرتیلا کسیلا تھا۔ تلوار کی ایک ضرب سے بھینسے کا سر اُڑا دیتے تھے۔ ساتھ ہی اسکے بڑی جات پھرت کے آدمی تھے۔ محنت و مشقت کے عادی۔ تکلیف و مصیبت جھیلنے کے خوگیر، اولوالعزم اور عالی حوصلہ۔ چمکیلی آنکھوں اور خارا شگاف نظر سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دل میں جوش اور سینے میں امنگیں بھری ہوئی ہیں۔ وہ صبح گجردم اُٹھ بیٹھتے اور گھوڑے پر سوار ہوکے سیر و شکار کو جنگل کی طرف نکل جاتے وہاں ہرن۔ بارہ سنگھے یا چیتے کا شکار کھیلتے۔ دوپہر ہوتے گھر آتے اور آتے ہی آتے ٹھنڈے پانی سے نہا ڈالتے پھر حرم سرا میں داخل اور عیش و نشاط میں مصروف ہو جاتے۔ یہ حالت ابتدا کی تھی۔ لیکن بکسر کی لڑائی میں شکست کھا کے طبیعت کا رنگ بدل گیا تھا۔ اب فوج کی درستی۔ محاصل ملک کی افزونی پر زیادہ توجہ ہو گئی تھی۔ حرم سرا کی دلچسپیاں کم ہوگئیں۔ مہمات ملکی و مالی میں انہماک بڑھ گیا۔ جس سے اُنکی دھاک ہر چہار طرف بندھ گئی۔ ملک کی آمدنی بڑھ گئی۔ فوج بھی ایسی مرتب ہو گئی کہ شمار میں آنے لگی۔" اروِن صاحب لکھتے ہیں کہ "شجاع الدولہ کے کارگزار ہونیکی قابلیت مسلّم ہے۔ بکسر کی لڑائی کے بعد چار ہی برس کے اندر اُنھوں نے تمام پچھلے مطالبات کو پاک کر کے خزانہ مالامال کر دیا۔ اور ملک کو ایسا مرتب و منتظم بنا دیا کہ محاصل بغیر خرخشہ وصول ہونے لگے۔ فوج بھی آراستہ اور باقاعدہ ہو گئی۔ فرینکلن اور اسکاٹ جیسے مصنفین جنکے دل مسٹر وڈ کیطرح مکدر نہیں کہتے ہیں کہ "شجاع الدولہ ایک اچھے مجسٹریٹ۔ معدلت پسند اور دل و جان سے اپنے ملک کی فلاح و رفاہ چاہنے والے نواب تھے۔ انداز و ادا میں اپنے کو نہایت لیئے دیئے۔ عاقل و فرزانہ خلیق و متواضع۔ رحمدل اور کشادہ مزاج۔ رعایا کے محبوب۔ اور ہر طبقے میں ہردلعزیز۔ حتیٰ کہ اُنکی موت پر حافظ رحمت خاں کے بیٹے تک طول دعا سنتے تھے۔"

فی الحقیقت شجاع الدولہ میں خدا نے بہت سی خوبیاں اور فضیلتیں جمع کر دی تھیں اور اس پر آشوب وقت میں جبکہ مغلوں کی شمع اقبال جھلملا رہی تھی۔ بابر اعظم کی نسل سے سطوت وجبروت شاہی گیا تھا تمام فضائل و محاسن بھی معدوم ہو چلے تھے۔ ہندوستان کی پولیٹکل شطرنج میں یہی ایک مُہرا ایسا زبردست تھا جو سب طرف معرکے کی چالیں ڈال رہا تھا۔ اگرچہ خود بادشاہ سلامت پر بھی اُسکے ہاتھوں ایک آدھ بار شہ پڑ گئی لیکن آئین ملک داری اور حکمت عملی کے واقف کاروں کے نزدیک ایسی خطائیں قابل چشم پوشی ہیں۔ کیونکہ شجاع الدولہ کے وقت میں زمانے کا رنگ بہت بدل چکا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل ہی نہ سکتے تھے۔ اُن لوگونکو جو کچھ مقابلہ کرنا پڑا ایرانیوں تورانیوں سے کرنا پڑا۔ اُنکے مقابلے کی شان اور ہی تھی۔ شجاع الدولہ کے وقت میں انگریز۔ اور فرانسیسی بھی میدان میں آ چکے تھے۔ انکی کشتی اور ہی پہلوانوں سے بدی گئی تھی۔ یہ اگر وہی داؤں پیچ کھیلتے کبھی سربر نہ ہوتے۔

ان وجوہ پر نظر کرکے یہ کہنا ہرگز بیجا نہیں ہو کہ شجاع الدولہ میں خدا نے کچھ غیر معمولی جوہر ذاتی ایسے دیے تھے کہ اجنبی راہ اور بیگانہ منزل میں یہ بسلامت چلے اور مقصود کو پہونچ گئے۔ شجاع الدولہ نے ایکطرف روہیلکھنڈ پر قبضہ کیا جسپر اُنکے بزرگوں کا دانت ہمیشہ لگا رہا۔ دوسری طرف فرخ آباد تک نائرہ دولت بجایا۔ ادھر صوبہ الہ آباد میں اضلاع بنارس۔ غازیپور۔ اُدھر۔ فتحپور۔ کانپور۔ اٹاوہ۔ مین پوری تک انھیں کے نام کی دوہائی پھری۔ کُل آمدنی صوبہ کی (جسوقت فرخ آباد بھی شامل تھا) دو کرور ستر لاکھ تھی جسمیں تراسی لاکھ سرکار انگریزی کو دیا جاتا تھا۔

(۵) نواب آصف الدولہ بہادر

شجاع الدولہ کے مرنے پر آصف الدولہ بڑے بیٹے مسند نشین ہوئے۔ انکی مسند نشینی کی ابتدا ہی سے انگریزوں کی مداخلت شروع ہو گئی۔ وہ اپنے صفات ذاتی سے واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ لائق فائق بھائیوں کے سامنے دال گلنا مشکل ہے۔ اسیوجہ سے ہر وقت ڈر لگا رہتا تھا۔ کہ کہیں کوئی دعویدار ایسا نہ اُٹھ کھڑا ہو کہ جسکے سامنے سر جھکاتے ہی بن پڑے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے اول ہی اول انگریزوں کی حمایت و سرپرستی کی جستجو کی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے۔ انگریزوں کی حیلہ جو پالسی ایسے موقع کی منتظر تھی۔ مادۂ قبولیت دیکھتے ہی تمام تر رجوع ہو گئے۔ عنایتیں مہربانیاں شروع ہو گئیں۔ تعلقات دوستانہ کے پردے۔ حمایت و حفاظت کی آڑ میں اپنی برتری اور فضیلت کا سکہ بٹھا لیا۔ ہر بات میں محرم راز اور ہر صلاح میں مشیر بنتے بنتے یہ نوبت پہونچ گئی کہ کوئی کام بلا استصواب بلکہ بلا منظوری کرنا جرم و خطا ہو گیا۔ اب نواب

یہ لگا تھا کہ دربار دہلی سے برائے نام واسطہ رہگیا تھا۔ دُنیا کا انتظام "بیم و رجا" پر منحصر ہے۔ دربار کی بے اثری بلکہ ہیچمیرزی روز روشن کیطرح آشکارا ہوچکی تھی اور جو کچھ بھرم بنا تھا اُسکی قلعی کھل گئی تھی۔ رعب و سطوت کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔ خالی وضعداری کا نباہ تھا۔ کہ لوگ بظاہر گردن جھکاتے اور مراسم حلقہ بگوشی ادا کرتے تھے۔ البتہ انگریزوں کے جاہ و جلال۔ عاقلانہ تدابیر۔ حکیمانہ طرزِ عمل۔ اور فوجی شان و شکوہ کا سکہ ہر طرف جم گیا تھا۔ اُنکی تلوار کا لوہا سب مان چکے تھے۔ اور اُنکے دماغوں کی فراست سب کے دلوں پر نقش ہوچکی تھی ہر عاجز و درماندہ عرض حاجت کرنے اُنھیں پاس دوڑتا۔ ہر مظلوم و بیکس اُنھیں سے داد بیداد مچاتا آصف الدولہ بھی مجبور تھے۔ طبیعت میں نہ وہ جوش اور زور تھا کہ کسی کو خطرے خیال میں نہ لاتے۔ نہ وہ اولوالعزمی اور بے جگری کہ دوسروں کا مال تاکتے۔ اور ہر ایک سے دست و گریبان ہوجاتے۔ اُنکو بنی بنائی سلطنت ملی تھی۔ دل میں جو کچھ اُمنگ اور آرزو تھی اسی کی تھی کہ اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنے مقام پر بیٹھکر داد عیش و کامرانی دیجیے۔ کھائیے کھلائیے۔ دنیا کی بہار دیکھیے۔ اور ہنس بول کے زندگی گزار دیجیے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنکے بائیس برس کے عہد حکومت میں اودھ کا یہ حال رہا کہ جیسے ایک کھلونا تھا جس سے کمپنی بہادر کے نائبان سلطنت اپنے اپنے وقتوں میں کھیلتے اور جی بہلاتے رہے۔

آصف الدولہ نے دربار دہلی سے بہت کم سروکار رکھا۔ وہ ہر معاملے میں انگریزوں سے داد خواہ ہوتے اور اُنھیں کو اپنا حامی و مددگار بلکہ ملجا و ماوا جانتے۔ البتہ ایک بار جب شاہ عالم کو ضابطہ خاں نے بہت ستایا اور وہی ظلم و ستم شروع کردیا جو غازی الدین نے اُنکے باپ کے ساتھ کیا تھا۔ تو آصف الدولہ نے شاہ عالم کو روپیہ اور فوج کی کمک بھیجکے ضابطہ خاں کے ظلم زیادتی سے نجات دلادی۔ اور اسی خدمت کے صلے میں بادشاہ بے مملکت نے اُنکو بھی وزارت تفویض کردی۔

آصف الدولہ کی مسند نشینی پر کمپنی کی جانب سے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ فریق معاہدہ شجاع الدولہ تھے۔ وہ مرگئے اُنکی بات اُنکے ساتھ گئی۔ اب نیا کارخانہ ہوا ہے۔ نئی بساط بچھی ہے۔ نئی چالیں چلی جائینگی۔ معاہدہ اور قرارداد بھی نئے ہونا چاہیئے۔ چنانچہ جدید عہدنامہ ہوا جسکی رو سے یہ طے پایا کہ نواب کسی یورپین کو بلا استرضائے کمپنی اپنی ملازمت میں نہ رکھیں۔ شاہ عالم سے کمپنی اور نواب کوئی بطور خود کسی قسم کی معاملت نہ کرے۔ کوڑا اور الہ آباد نواب کے قبضہ و اختیار میں رہے۔ بنارس۔ جونپور۔ غازیپور (جسکی آمدنی تئیس لاکھ تھی) کمپنی کے پاس رہے۔ ماہواری خرچ فی برگیڈ بجائے دو لاکھ دس ہزار کے دو لاکھ ساٹھ ہزار ٹھہرے۔ شجاع الدولہ کے ذمے جو کمپنی کا واجب باقی تھا اُسکی ادائی آصف الدولہ نے اپنے سر لی اور کمپنی نے وعدہ کیا کہ نواب کے مقبوضجات (جسمیں کوڑا۔ الہ آباد۔ روہیلکھنڈ اور میان دوآب کا ملک بھی تھا) کے محافظ

نگہبان رہیں گے اور بیرونی دشمنوں سے بچائے رکھیں گے۔ اسی کے ساتھ ہی کچھ فوج کا اضافہ بارہ لاکھ سالانہ خرچ پر ہوگیا اور جو رزیڈنٹ دربار میں رہتا تھا اُسکی تنخواہ کے علاوہ ایک اور ایجنٹ لکھنؤ میں مقرر کیا گیا جسکی تنخواہ دو لاکھ بیس ہزار سالانہ نواب نے اپنے ذمے کرلی۔

انگریزوں کے ظلِ عاطفت وحمایت کا سہارا پاکے آصف الدولہ بیرونی دشمنوں حملہ آوروں اور اندرونی دعویداروں اور رقیبوں سے بالکل نڈر اور مطمئن ہوگئے۔ اور نظم و نسق مملکت و آراستگی سلطنت تو کجا۔ دادِ عیش وکامرانی دینے لگے۔ لیکن چونکہ فیض آباد میں ماں اور دادی کا رُعب چھایا ہوا تھا۔ اُنکے سامنے مجال نتھی کہ جوانی کی اُمنگیں نکل سکیں اور کھُلے بندوں جو چاہیں کریں۔ اسلیے یارانِ انجمن نے یہی صلاح ٹھہرائی کہ فیض آباد کو چھوڑ کے لکھنؤ کو آباد کرنا چاہیے۔ آصف الدولہ کی طبیعت تو راحت کی خواہاں آرام کی جویاں تھی ہی یہ خدا سے چاہتے تھے کہ آزاد و مطلق العنان رہکے دلکے شوق پورے کریں حوصلے نکالیں۔ چنانچہ باختلاف روایات ۱۷۷۵ء یا ۱۷۸۱ء میں امارت کے سارے کارخانے لکھنؤ میں آگئے فیض آباد سونا ہوگیا۔ اور لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد پڑ گئی۔ لیکن لکھنؤ آکے آصف الدولہ کو یہ دقت پڑی کہ جو کچھ نقد و جنس۔ زر و جواہر۔ کئی پشتوں کی کمائی کا تھا وہ سب ماں اور دادی کے قبضے میں تھا اُسپر نواب کا دسترس نہ پہونچ سکتا تھا۔ ادھر کچھ تو خلقی سیرچشمی اور فیاضی کے سبب آمدنی پر خرچ بالا رہتا تھا۔ تو فیر کجا اور کچھ انگریزوں کے مطالبات کی وجہ سے روپیہ کی حاجت یوماً فیوماً بڑھنے لگی۔ کمپنی کے مطالبات کا یہ حال تھا کہ ربڑ کی طرح بڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔ اور اب بڑھتے بڑھتے ایک کرور سالانہ تک پہونچ گئے تھے جنمیں سے بڑی کشش و کوشش کرنے سے ستر لاکھ سالانہ ادا ہوتا اور بیس لاکھ سالانہ بقایا کی مد میں پڑتا۔ نوبت باینجا رسید کہ ۱۷۸۰ء میں اس بقایا کی میزان بھی دو کرور دس لاکھ روپیہ ہوئی۔

اگرچہ ان مطالبات کی ادائی کے واسطے بہت کچھ فکر کی گئی لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ بلکہ بعض صورتیں ایسی پیش آتی رہیں جنسے خرابی کے سامان بڑھتے اور مداخل گھٹتے ہی رہے۔ آخر نواب نے مجبور ہوکے ۱۷۸۰ء میں کمپنی سے رحم کی التجا کی۔ اتفاق یہ کہ تھوڑے دن بعد وارن ہیسٹنگز کو روپیہ کی شدید ضرورتیں داعی ہوئیں اور وہ ۱۷۸۱ء میں چنارگڈھ نواب سے ملنے اور کچھ معاملات طے کرنے کی غرض سے تشریف لائے۔ نواب بھی وہیں پہونچے۔ دونوں نے اپنی اپنی حالت اور ضرورت کو بیان کیا۔ چنانچہ یہ طے ہوگیا کہ بجز ایک برگیڈ اور ایک زائد رجمنٹ کے اور جسقدر انگریزی فوج اودھ میں ہو وہاں سے بلالی جائے اور نواب کو اپنے جاگیرداروں کی بابت یہ استحقاق ہو کہ جسکی جاگیر چاہیں ضبط کرلیں۔ البتہ وہ جاگیریں جنکی ضمانت انگریز کرچکے ہیں اُنکے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے کہ بہر نوع اُن کی

آمدنی بذریعہ رزیڈنٹ اُن کو پہونچتی رہے۔ اسی طرح کمپنی کے مطالبجات کی ادائی کیواسطے یہ تدبیر نکالی گئی کہ کسی حیلہ وحوالہ سے ایک رقم کثیر بیگمات شاہی سے وصول کیجائے۔ اگرچہ آصف الدولہ پچپن چھپن لاکھ کے قریب مختلف وقتوں میں ماں اور دادی سے وصول کرچکے تھے۔ لیکن اب کمپنی کی شدید ضرورت اور تقاضے سے مجبور ہوکے اُنکو پھر یہی چال چلنا پڑی چونکہ کمپنی کے واسطے روپیہ وصول کرنا تھا۔ اس لیے اُنکو ہر طرح سے اطمینان تھا۔ کہ اس کارروائی میں جو کچھ تشدد یا ظلم وستم بیگمات شاہی پر کیا جائیگا اُسمیں انگریز مانع ومزاحم نہونگے بلکہ ہر طرح چشم پوشی ہی کرینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سرسٹھ لاکھ روپیہ وصول ہوگیا۔ لیکن چونکہ یہ مقدار ناکافی تھی اسلیے دوسرے شکار کی تلاش کی گئی۔ فیض اللہ خاں نواب روہیلکھنڈ اس دام میں پھانسے گئے۔ اور جب تک اُنھوں نے پندرہ لاکھ روپیہ پیشکش نہ کیے جان نہ چھوڑ اسکے۔

ان تمام کارروائیوں کا الزام چاہے آصف الدولہ کی کمزوری پر رکھا جائے چاہے جلادت جنگ وارن ہیسٹنگز کی دھینگا دھینگی یا کمپنی کی موقت ضرورتوں اور اُسکی سلطنت سازی کے منصوبوں پر بہر تقدیر اودھ کے واسطے یہ زمانہ کچھ اچھا نہ تھا۔ ایکطرف سے روپئے کی مانگ تھی کہ برابر جاری تھی۔ اور نہ ملنے پر دھمکیاں خفگیاں تھیں اور ملنے پر چشم پوشی۔ دوسری طرف خزانے کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ اور کشادہ دلی وبلند نظری کا اظہار بیدریغ زرپاشی پر آرہا تھا۔ ہمت عالی کے سامنے ملکی ضرورتیں۔ انتظامی اور اور سیاسی اصول سب بالائے طاق رکھدیئے گئے تھے۔ چشم مروت باعث خانہ خرابی ہو رہی تھی۔ خیریت گزری کہ یہ حالت زیادہ دنوں قائم نہ رہی۔ اور بعد چندے لارڈ کارنوالس صاحب زیب دہ ایوان گورنری ہوگئے۔ اور ۱۷۸۶ء میں نواب نے اپنی پریشانی حالت اُنپر ظاہر کرنے کیواسطے امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کو کلکتہ بھیجا۔ اُسوقت کی پریشانی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امیر الدولہ کو "۱۸ لاکھ روپیہ سرکار سے سفرخرچ عنایت ہوا اور کرور روپئے تک صرف کی اجازت" دی گئی۔ امیر الدولہ نے لارڈ صاحب سے یہ اسباب پریشانی بیان کیے "ایک تو قلت مداخل۔ کثرت مخارج۔ مصارف امیرانہ لابدی تیسرے نقصان جہاتی جسکا سالانہ قسط چھپن لاکھ ستر ہزار ہوتا ہے۔ ملک بنارس وغیرہ محاصل ۱۲ لاکھ ہدیۂ دوستانہ سرکار کمپنی کو دیا۔ چوتھے لکھا روپیہ صرف ضیافت وسامان روشنی وتماشا ہوئے۔ بسنت وغیرہ محض بلحاظ صاحبان نووارد ہوتا ہے۔ تجار انگریزی اسباب تجارت وغیرہ ولایت سے لاتے ہیں۔ اُنپر محصول نہیں۔ چھٹے تاجران ولایت جو رطب ویابس لاتے ہیں عرض کرتے ہیں ہم بڑی دور سے یہ اسباب تحفہ ولایت فقط حضور کے واسطے لائے ہیں ہندوستان میں سوائے حضور کے کون قدردان ہے

جو ایسے ایشیائی تحفہ و کیاب کو مول لے۔ جناب عالی (یعنے آصف الدولہ) اپنی بلند نامی کیواسطے ملاحظہ فرما کے سب مال۔ تر و خشک لے لیتے ہیں اور جسقدر وہ قیمت لکھ بھیجتے ہیں اُسکی دلائی ہمپر ہوتی ہی ہم حکم حاکم سمجھ کے بجا لاتے ہیں اور اس قرضے کا سود ہمیں دینا پڑتا ہی"

لارڈ کارنوالس نے ان معقول وجوہ پریشانی پر اپنی ہمدردی ظاہر کی۔ چھاؤنی میں دو آسنے موقوف کیے۔ ملک بنارس وغیرہ کا استرداد منظور کیا اور حکم دیا کہ کوئی تاجر بے صاحب رزیڈنٹ یا کوئی تازہ ولایت نواب تک نہ پہونچا کرے اور تجار پر حسب سررشتہ حکم محصول دیا۔ یعنی فیصد پانچ روپے لیے جائیں۔ اَروِن صاحب لکھتے ہیں کہ "لارڈ صاحب نے کمپنی کا ایجنٹ بھی جسکی بابت دس لاکھ سالانہ کے قریب خرچ کرنا پڑتا تھا موقوف کر دیا لیکن ان سب میں استرداد ملک بنارس کو نواب نے "بمقتضائے ہمت عالی" منظور نہ فرمایا۔"

اودھ کے دن اچھے نہ تھے کہ لارڈ کارنوالس کے بعد سرجان شور صاحب گورنر جنرل ہو کے آئے۔ اُنھوں نے جو کیا وہ یہ کیا کہ جب ۱۷۹۷ء میں لکھنؤ تشریف لائے تو دو زائد رجمنٹیں ساڑھے پانچ لاکھ سالانہ کے خرچ سے مسلط کر گئے۔ دوسرا تحفہ لارڈ صاحب یہ دیگئے کہ علامہ تفضل حسین خان کو مُلاگیری سے وزارت پر فائز کر گئے۔ نواب کے منظور نظر میاں الماس تھے اور وہ اُنھیں کو اس منصب کے شایاں سمجھتے تھے۔ لیکن اب زمانہ یہ آلگا تھا کہ اندرونی معاملات اور فروعی انتظامات بھی بغیر صلاح و مشورہ لارڈ صاحب طے نہیں ہوتے تھے۔ اگرچہ میاں الماس کی انتظامی قابلیت ہردلعزیزی اور وفاداری و جاں نثاری کی بابت سلیمن صاحب تک رطب اللساں ہیں۔ لیکن سرجان شور کو اُنکی وزارت بوجوہ نامنظور کرنا پڑی کہ کسی وقت میں لارڈ کارنوالس صاحب اُنکے خلاف کچھ لکھ جا چکے تھے بہرحال مُلا کی قسمت میں ایکبار عروج پانا لکھا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے رتی چمک گئی۔ وزارت پا گئے۔ اور چند ہی روز میں مالامال ہو گئے۔ لیکن آصف الدولہ کا ساغر حیات لبریز ہو چکا تھا۔ مُلّا بیچارے کی تقدیر نے بھی کچھ زور نہ لگایا۔ نواب بیمار پڑے۔ استسقا ہو گیا۔ اور ستمبر ۱۷۹۷ء میں "عدن مقام" ہو گئے۔

آصف الدولہ کا زمانہ اگرچہ گرد و پیش کے حالات و اسباب کے تبدیل ہو جانے کے سبب سے ایسا نہیں ہوا جسے دور ترقی میں شمار کر سکیں۔ لیکن اسمیں کچھ شک نہیں کہ ملک کی عام بے امنی اور طوائف الملوکی کے ہنگامے بھی اُنکا انگریزوں کی رضاجوئی کرنا بھی وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت مناسب اور نتیجہ خیز ہوا۔ اُسمیں یہ بھی شک نہیں کہ آصف الدولہ کے وقت سے جسطرح لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد پڑی اسی طرح ایک جدید دور بھی شروع ہو گیا۔ وہ اپنے جانشینوں کے واسطے ملک گیری اور معرکہ آرائی کی شاہرہ

سے الگ ہو کے ایک نئی سڑک قناعت کے ساتھ اپنی دستار سنبھالے ہوئے چلنے کی بنا گئے۔

داد و دہش زر ریزی اور گہر پاشی کے لحاظ سے آصف الدولہ اپنے وقت کے حاتم تھے نہیں نہیں پارس پتھر کہنا چاہیے کہ جو چھو گیا خاک سے پاک ہو گیا۔ انگریزوں کو جو کچھ ملا اُسکا تو کچھ حساب نہیں کمپنی تو کمپنی۔ ادنیٰ ادنیٰ ملازم لاکھوں روپیہ کما لیگئے۔ دہلی کے شہزادے جو وارد صادر ہو جایا کرتے تھے۔ جب تک رہتے تھے مہماں نوازی کے وہ لطف اُٹھاتے تھے کہ گھر بھولجاتے تھے۔ جب جانے لگتے جیب و دامن پُر کر کے لیجاتے تھے۔ پھر ہندوستانی مقربان بارگاہ کے مداخل و مخارج کا کیا پوچھنا ہے۔ ایک ایک سرکار کے کرّو فر۔ جاہ و حشم وہ تھے کہ اور ملکوں کے بادشاہوں سے دعوائے ہمسری رکھتے تھے۔

ایسے سیر چشم۔ دریا دل حکمراں کے عہد حکومت میں کسی نئے شہر کی بنیاد پڑنے کا راز سمجھ میں آ سکتا ہے کہ یکایک کیونکر جنگل میں منگل ہو گیا۔ خود آصف الدولہ نے آتے ہی آتے تعمیرات کا جو محکمہ کھولا اور اُسکے ساتھ اُمرائے دولت و اعیان ریاست نے عالیشان عمارتوں کا جو سلسلہ شروع کیا اُسنے لاکھوں بندگان خدا کی کفالت کی۔ ہزاروں کو مالا مال کر دیا۔ اور وہ لکھنؤ جو چند دیہات کے مجموعے سے زیادہ نہ تھا جسمیں خرابے اور زمین شور کے سوا کسی طرف کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بنجر۔ بیہڑ زمین۔ اُونچے اُونچے ٹیکرے۔ گہرے گہرے نالے ہر طرف دکھائی دیتے تھے۔ کہیں جھاڑیوں جھنکاریوں سے جنگل کا سماں تھا۔ کہیں پھوس کے چھپروں اور کچے مکانوں سے گانوں کی کیفیت۔ چند ہی دن کی مدت میں ایک اچھا خاصہ شہر بنگیا۔ ہر طرف آبادی ہو گئی۔ بازار لگ گئے۔ گنج بن گئے۔ سڑکیں نکل گئیں۔ اور گلی کوچوں میں کنچن برسنے لگا۔ بڑی بڑی کوٹھیاں اور محلسرائیں بنیں۔ باغ باغیچے لگے۔ پھلواریاں آراستہ ہوئیں۔ امامباڑے بنے۔ مسجدیں تعمیر ہو گئیں۔ اور ہر طرف چہل پہل ہو گئی۔

اتفاق یہ کہ اب وہ پُر آشوب زمانہ آ لگا تھا کہ خاندان تیموریہ کی روز افزوں تباہی اور اسلامی سلطنت کے ضعف و انحطاط سے پایۂ تخت ویران ہو رہا تھا۔ پُرانے پُرانے خاندان مٹنے لگے۔ اور وہ لوگ جو بزرگوں کی ہفت ہزاری اور صوبہ داری کے جاہ و حشم میں ناز و تنعم سے پلے تھے شکستہ حال اور محتاج و فاقہ کش ہو ہو کے خانماں خراب ہو رہے تھے۔ لیکن دہلی سے نکلیں تو جائیں کہاں۔ ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ کہیں امن نہ تھا۔ ملک کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ ایک طرف مرہٹے سر اُٹھائے ہوئے ہیں۔ اُنکے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ادھر راجپوتانہ اُدھر مالوہ۔ بندیلکھنڈ اور گجرات میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ لڑتے بھڑتے لوٹتے مارتے۔ گاؤں کو ویران اور شہروں کو تباہ کرتے ابھی اِدھر سے نکل گئے۔ ابھی اُدھر سے۔

سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے۔ کہیں چین نہیں۔ دوسری جانب پنجاب میں سکھا شاہی کے جور و جفا سے خلقت جاں بلب ہو رہی ہے۔ تعصبات مذہبی کے شعلے آسایش عامّہ کے لیے برق خرمن سوز کا کام کر رہے ہیں۔ چین سے پاؤں پھیلا کے سونا تو کجا۔ جان و مال۔ عزت و آبرو کی ہر شخص خیر منا رہا ہے۔ ایکطرف ٹیپو سلطان کی بجلی طبیعت اور فرانسیسیوں کی سیف و قلم کی دھاک بندھی ہوئی ہے۔ جدال و قتال۔ صف آرائی اور میدان داری کا میدان گرم ہے۔ دوسری طرف پنڈھاریوں کی لوٹ مار سے بستیاں اُجاڑ۔ اور راستے مخدوش ہیں۔ ایسی مصیبت۔ تباہی۔ بے امنی۔ اور جاں بلبی کے وقت جو کچھ سکون و قرار۔ راحت و اطمینان کا سامان نظر آتا تھا تو اودھ کے چھوٹے سے ٹکڑے میں۔ پھر آصف الدولہ کی فیاضی و سیرچشمی کا غلغلہ بھی بلند ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے ہر گوشے و زاویہ سے جو زمانہ کا ستایا اور آفت کا مارا نکلتا۔ اودھ ہی کی طرف جھکتا۔ شریف اور خاندانی امیرزادے۔ سپاہی منش اور تلوار کے دھنی سورما۔ ہر علم کے عالم اور ہر فن کے کامل سبھی رنگ اور سبھی مذاق کے لوگ آتے اور جوہر شناس رئیس اور اُسکے قدردان درباریوں کی داد و دہش اور بذل و ایثار سے یہیں رہجانے لگے۔ اور ان باتوں نے لکھنؤ کو لکھنؤ بنا دیا۔ اور اُسکا آوازہ چاردانگ عالم میں بلند کر دیا۔

خود آصف الدولہ نے جو عمارتیں بنائیں اُنکی صنعت تعمیر اور شوکت و عظمت آجتک بانیوالے کی نیت پر گواہی دے رہی ہیں۔ حسن باغ۔ عیش باغ۔ چار باغ۔ کا نام ابھی تک مشہور ہے۔ دولت خانہ۔ بیبیاپور کی کوٹھی۔ چنہٹ کی کوٹھی کے اب صرف کھنڈر باقی ہیں لیکن بڑا امباڑہ اور رومی دروازہ جسمیں اینٹ اور چونے کی وہ صناعی دکھائی گئی ہے کہ اہل یورپ بھی اُسکی تعمیر دیکھکر دنگ رہجاتے ہیں ابھی تک اُس نیکدل۔ غریب پرور۔ عاجز نواز اور فیاض نواب کی نیک نیتی کو ظاہر کر رہا ہے اور زمانے کے ظالم ہاتھ کی چوٹیں بچاتا اپنی حالت پر قائم ہے۔ یہی امامباڑہ بعد مرگ نواب کی خوابگاہ ہو گیا اور اسوجہ سے مُلّا محمد خطائی شوستری کی یہ تاریخ "ہہنا روحٌ و ریحانٌ و جنّتُ النعیم" سر بالین بہت لطف دے رہی ہے

آصف الدولہ کے بعد وزیر علیخان اُنکے بیٹے بنکے تخت نشین ہوئے لیکن انگریزوں سے دل صاف نہ رکھتے تھے اور اُنکو بھی انپر اطمینان نہ تھا۔ پانچ ہی چار مہینے بیٹھے تھے کہ کچھ ایسے حرکات ناروا و ناسزا بھی صادر ہوئے جنسے قدیمی خانہ زاد معتمد الخدمت اہل دربار۔ بھائی بند اور رعایا برایا میں برہمی پیدا ہو گئی اور اس شورش کی اطلاع ملتے سر جان شور کو کلکتے سے آنا اور لکھنؤ میں نواب کا قلع قمع کرنا پڑا۔ نواب حراست میں کرکے بنارس بھیجدیے گئے۔ تین لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اپنے ہتھکنڈوں سے باز نہ آئے اور کچھ روز سر شوری کے ساتھ ادھر اُدھر دن گزارتے۔ فتنے اُٹھاتے۔ ہنگامے برپا کرتے

آخر عمر میں کلکتہ میں قیدیوں کی طرح زندگی کے دن پورے کرکے ناشاد و نامراد دنیا سے اُٹھ گئے۔ مقام عبرت ہے کہ وہ شخص جسکی شادی کتخدائی میں تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا اُسکے کفن دفن میں ستر روپیہ سے زیادہ نہ صرف ہوا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(۶) نواب سعادت علیخاں

انکا پورا خطاب یمین الدولہ ناظم الملک (بعد چندے افتخار الملک) نواب سعادت علیخان بہادر مبارز جنگ تھا۔ شجاع الدولہ کے بیٹے اور آصف الدولہ کے بھائی تھے۔ لیاقت و کارروائی اور فراست و ہوشمندی کے جوہر خداداد لائے تھے۔ باپ کے وقت میں بریلی کے صوبے کا سارا کام اُنھیں کے سپرد تھا وہیں اپنے جوہر ذاتی کے دکھانے میں معروف رہے۔ جب بڑے بھائی (آصف الدولہ) کو سند نشین اور اپنے سے بدظن پایا۔ بمقتضائے حزم و احتیاط الگ تھلگ رہے۔ نہ دعویدار ریاست ہوئے نہ رقیب مملکت بنے لیکن آصف الدولہ نے اسے گوارا نہ کیا مصلحت اسی میں سمجھی کہ انھیں نگاہ کے روبرو رکھیں۔ بُلایا اور بہت تپاک سے بُلایا۔ یہ نہ آئے۔ اُنھوں نے انگریزوں کو بیچ میں ڈالا۔ اُدھر سے فہمایش بھی ہوئی۔ دباؤ بھی پڑا مجبور ہوکے آئے۔ لیکن صحبت برار نہو سکے۔ یہاں کا قوام بگڑا ہوا تھا۔ نائب الریاست کو سیاہ و سفید کا مالک اور رئیس کو غافل و از خود رفتہ دیکھکے جی نہ لگا۔ آخر بنارس میں جا کے رہنے لگے تین لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوگیا۔ بعد چندے جب آصف الدولہ کو ملک کی بدنظمی پر توجہ ہوئی۔ اہلکاروں کی بداعمالیوں پر آنکھ کھلی۔ مختار الدولہ کی نیابت اُنکے تمرد اور تجبر کی وجہ سے ناگوار گزرنے لگی۔ یہ بھی آسکے۔ اب زمانہ یہ آلگا تھا کہ بعض ارکان دولت کے سروں میں بھی خیالات فاسد راہ پاچلے اپنے ہی مرغان دست پرور آنکھیں دکھانے لگے تھے بسنت علیخان سپہ سالار افواج کے دل میں نواب اور نائب دونوں کی طرف سے بدی آچلی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختار الدولہ اور بسنت علیخان موت کے گھاٹ اُترے اور سعادت علیخان جان بچا کے اکبرآباد کیطرف نکل بھاگے "ایک ہی دن میں نائب الریاست۔ سپہ سالار عساکر۔ اور قوت بازو بھائی نے نواب سے کنارہ کیا"

آصف الدولہ کے مرنے پر جب وزیر علیخان کی سند نشینی کی خبر سُنی سعادت علیخان کو اپنی فکر پڑی۔ یہ پیشتر سے سب بندوبست کرچکے تھے اور انگریزوں کے قول و قرار۔ عہد و پیمان پر مطمئن بیٹھے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی فوراً کلکتے چلے کہ وہیں جا کے کوئی صورت نکالیں۔ معاملہ طے کریں۔ اپنے حقوق اور انگریزوں کے مواعید یاد دلائیں رحم کی درخواست کریں۔ صلہ و مکافات سلوک و مدارات کی پُرپک دیں۔ اقبال پہلے ہی سے یاوری پر کمر بستہ تھا۔ راستے ہی میں تھے لکھنؤ سے طلب پہونچی۔ اُدھر خان علامہ نے ریشہ دوانی کی۔ ادہر بہو بیگم صاحبہ

کاشقہ خاص پہونچا۔ اسے لطیفۂ غیبی سمجھ کے پلٹ پڑے۔ تقدیر کے کارخانے دیکھو کہ جس شام کو یہ کانپور پہونچے اُسی کی صبح کو وزیر علیخان لکھنؤ مین گرفتار ہو گئے۔ انکے واسطے میدان صاف ہو گیا۔ القصہ انگریزونکے ظل حمایت مین بسنت کے دن ۲۱۔ جنوری ۱۷۹۸ء کو بڑے تزک و احتشام سے داخل شہر ہوے۔ کسی نے تاریخ کہی ؎

تاریخ مقدمش را جُستم ز پیر دانش   گفتا بگو سعادت با صد سعادت آمد

مسند نشینی سے پہلے ہی انگریزون سے یہ معاہدہ ہو گیا کہ کمپنی کو چھپن لاکھ کے عوض چھتّر لاکھ سالانہ چہار قسطون مین دیا کرین۔ وزیر علیخان کو ڈیڑھ لاکھ سالانہ رزیڈنٹ کی معرفت پہونچتا رہے۔ بارہ لاکھ روپیہ بطور نذرانہ کمپنی کو بمعاوضہ اُس زیر باری کے دیا جائے جو اس مسند نشینی کے بارے مین اُسکو ہوئی ہے۔ گورنمنٹ انگریزی کی اطلاع و منظوری بغیر نہ کسی بیرونی سلطنت سے کوئی رسم و راہ پیدا کیجائے نہ کوئی یورپین ملازم رکھا جائے۔ الہ آباد کا قلعہ کمپنی لیلے اور آٹھ لاکھ روپیہ اُسکی مرمت و درستی کے واسطے نواب دین۔ کمپنی نے وعدہ کیا کہ اودھ کے واسطے دس ہزار فوج ہر وقت تیار رکھیگی۔ اور اگر کبھی تیرہ ہزار سے زیادہ یا آٹھ ہزار سے کم رکھنیکی نوبت آئیگی تو اُسکے مصارف گھٹتے بڑھتے رہین گے۔

سعادت علیخان کی زیرکی و فراست کی وجہ سے وہ لوگ جو آصف الدولہ کی فیاضی۔ چشم مروت اور درگزر کی بدولت زورون مین بھرے ہوے۔ دولت و ثروت پا کے خودی سے باہر ہو رہے تھے۔ اب بہت ہراسان ہو گئے۔ کاغذی گھوڑے دوڑانے لگے۔ سعادت علیخان بھی ایک ایک کے کچے چٹھے سے واقف تھے اور بھائی کے عہد حکومت کی ابتری و بدنظمی۔ نا اہلونکی ترقی۔ باکمالونکی کس مپرسی۔ عمّال سرکاری کی خیانت و بدکرداری۔ حکّام کی جور و تعدی۔ رعایا کی مظلومی و بیدلی اور زمیندارون تعلقدارون کی شورہ پشتی و نادہندی سے سینے مین ہزارون داغ رکھتے تھے۔ اور خوب سمجھے ہوے تھے کہ پُرانے پرزے نکالے اور نئے لگائے بغیر کام نہ چلیگا۔ جب تک انتظام نئے کینڈے پر نہ ہوگا۔ سیاست و ملکداری کے قانون سختی سے نہ برتے جائین گے۔ یہ بیل منڈھے نہ چڑھے گی۔ اُدھر پولیٹکل تعلقات مین سلطنت مغلیہ کے روز افزون ضعف و انحطاط اور انگرون کی ترقی و اقبال سے جو صورت پیدا ہو گئی تھی اُسکے لحاظ سے بھی یہ بے حد ضروری تھا کہ پھونک پھونک کے قدم رکھین اور اپنی پگڑی سنبھالے ہوے چلین۔ انھون نے سب سے پہلے یہی انتظام کیا کہ کمپنی کے مطالبات معینہ اوقات پر پہونچانے لگے۔ باقی ساقی کا جھگڑا ہی نہ رکھا پھر سال بھر تک اندرونی انتظامات مین ہاتھ نہ لگایا۔ تغیر و تبدل۔ عزل و نصب سب ملتوی رکھا رفتہ رفتہ بہی خواہان دولت اور بدخواہان ریاست کو ایک ایک کر کے دور دفان کیا۔ کسی کو موقع سے ادھر اُدھر ٹالا۔ وہ

پھینکا۔ کسیکو کان پکڑکے نکالا۔ محاصل ملک پر توجہ کی بہت سی جاگیریں معافیاں جو غیر مستحق اور نااہل لوگونکو آصف الدولہ نے محض علو ہمت سے دے رکھی تھیں ضبط کیں۔ تعلقداروں کی ناہنجاریں مٹائیں۔ اجارے اور ٹھیکے توڑے۔ امانی کا بندوبست شروع کیا۔ عُمّال سرکاری کی کرتوتوں سے واقف اور مطلع رہنے کے واسطے اخبار نویسی کا محکمہ قائم کرکے منتخب اور معتمد لوگوں کو اس کام پر متعین کیا۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں لارڈ ولزلی صاحب ہندوستان کے گورنر جنرل ہوکے آئے۔ ہندوستان کی پولیٹکل تاریخ میں یکایک نیا دورہ شروع ہوا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مرہٹوں اور فرانسیسیوں کی اولوالعزمیوں اور معرکہ آرائیوں سے انگریزی مقبوضجات بھی خدشے اور خطرے کیحالت میں پڑگئے تھے۔ اُدھر زماں شاہ کے حملے کی خبریں گرما گرم آرہی تھیں۔ ہر خفتہ و بیدار خبردار ہورہا تھا۔ لارڈ ولزلی صاحب نے نہایت پامردی و استقلال سے ان تمام بلاؤں کا مقابلہ کرنا چاہا اور اپنی قوت کے بڑھانے اور انگریزی اقتدار کے قائم رکھنے بلکہ ایک مستقل اعلیٰ حکومت قائم کرنے پر تمام تر ہمت مصروف کردی۔ اُنھوں نے نواب پہ زور ڈالا کہ آصف الدولہ کے وقت کی جو ستر اسّی ہزار فوج اودھ میں ہے اُسے گھٹا کے اُسکے بجائے انگریزی فوج کچھ اور بڑھائیں نواب کو یہ گوارا نہوا۔ قیل و قال شروع ہوئی۔ اسمیں بات بڑھگئی۔ معاملے نے طول کھینچا۔ بے لطفی کی نوبت پہونچی۔ نواب نے آشفتہ ہوکے خلع حکومت کی دھمکی دی۔ مگر وہاں ایسی دھمکیوں سے کیا اثر ہوسکتا تھا۔ مصالح ملکی اور مآل اندیشی نے دل فولاد کے بنا دیے تھے۔ جو تجویز تھی پتھر کی لکیر تھی کہ دنیا ادھر سے اُدھر ہوجائے وہ نہ مٹے۔ نوبت باینجا رسید کہ انگریزی فوجیں اودھ کی طرف بڑھیں مناقشات و مشاجرات کا دروازہ کھلا ہی چاہتا تھا۔ کہ نواب کی آنکھ کھلگئی۔ مآل کار پر نظر گئی۔ سوچے کہ بگاڑے سے کام نہ نکلے گا اور شامت آجائیگی۔ اُلٹی آفتیں گلے پڑینگی۔ آخرکار فوج جسمیں سراسر آخور کی بھرتی تھی بہت کچھ تخفیف میں آئی اور چوّن لاکھ سالانہ کے صرف سے انگریزی بارہ پلٹنیں اودھ میں متعین ہوگئیں۔ اب کمپنی کے مطالبات کی میزان ایک کرور پینتیس ۱۳۵ لاکھ سالانہ پر پہونچگئی۔ لیکن فوج کی تخفیف سے صرف ایک لاکھ پینسٹھ ہزار کی بچت نکلی۔ جب نواب نے اسپر شکوہ و شکایت کا دفتر کھولا۔ اپنی معذوری مجبوری ظاہر کی تو لارڈ ولزلی صاحب نے یہ بحث پیش کردی کہ اگر بطور خود ادائی مطالبات سرکاری کا انصرام نہیں ہوسکتا تو نصف حصہ ملک بطور ضمانت تفویض سرکار کمپنی کردیا جائے۔ اور اسمیں اسقدر انہماک ظاہر کیا کہ عہدنامے کا مسودہ اپنے بھائی ہنری ولزلی کو دیکے لکھنؤ بھیجا کہ جائیں اور تکمیل کرائیں۔ چنانچہ تھوڑی گفت و شنید کے بعد ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء کے عہدنامے پر دستخط ہوگئے جسکی رو سے اضلاع روہیلکھنڈ۔ فرخ آباد مین پوری اٹاوہ۔ کانپور۔ فتحگڈھ۔ الہ آباد۔ اعظمگڈھ۔ بستی۔ اور گورکھپور کمپنی کے تفویض ہوگئے

اُس زمانے میں اس حصۂ ملک کی آمدنی ایک کرور پینتیس لاکھ تھی۔ لیکن سنہ ۱۸۴۶-۴۷ء میں اسٹامپ اور آبکاری ملاکے دو کرور گیارہ لاکھ ہو گئی تھی۔ اور اب تو تین کرور سے زائد ہے۔ اس کارروائی کا ایک اثر یہ ہوا کہ اودھ تین طرف سے انگریزی مقبوضات کے حلقے میں محفوظ ہو گیا۔ اور چوتھی طرف تو نیپال کا کوہستانی سلسلہ سد سکندر ہی تھا۔ اسی معاہدہ میں یہ بھی طے ہو گیا کہ انگریزی فوج ہمیشہ کے واسطے اودھ سے اُٹھ جائے گی اور اُسکی بابت نواب کو کچھ نہ دینا پڑے گا۔ البتہ نواب کو اجازت ہے کہ اندرونی انتظام کے واسطے چار پلٹنیں پیدل فوج کی۔ ایک رجمنٹ نجیبوں کی دو ہزار سوار اور تین سو توپچی گولہ انداز اپنے ہاں رکھیں۔

نواب سعادت علیخاں کو اتنے بڑے حصۂ ملک کے نکل جانے سے رنج تو کیوں نہیں ہوا لیکن آنکھ پھوٹی پیر گئی سمجھ کے دل کو تسکین دے لی۔ کہ بلا سے ملک گیا تو گیا آئے دن کی جھڑکیوں خفگیوں۔ دانتا کلکل سے تو نجات ملی۔ روز روز کے تقاضے تو نہ ہونگے۔ اب جسقدر ملک ہاتھ میں ہے اُسی پر قناعت کرنا اُسی کے بندوبست میں مصروف رہنا چاہیے۔ چنانچہ اسکے بعد نہایت بیدار مغزی اور معدلت پناہی سے کاروبار ملکی پر متوجہ ہوئے۔ شب و روز کا اکثر حصہ کاغذات کے دیکھنے سننے۔ اراکین سے مشورہ و استصواب کرنے اور حکم احکام جاری کرانے میں صرف کرنے لگے۔ پرچہ نویسوں کی رتی خوب چلی۔ اخبار نگاروں کی بن آئی۔ لیکن کیا مجال کوئی جھوٹی خبر تو لکھے سعادت علیخاں کی فکر صائب و تدبیر عاقلانہ کی روائتیں حکایتیں بہت مشہور ہیں۔ چنانچہ ایک مورخ کا بیان ہے کہ جب آدھا ملک انگریزوں کے سپرد کر چکے تو رات دن اسی فکر میں ڈوبے رہنے لگے کہ کسی طرح اسکی تلافی کرنا چاہیے۔ تلوار کے دھنی نہ تھے کہ کچھ سر اُٹھاتے اور مردانگی کے جوہر دکھانے میدان میں آتے۔ سوچتے سوچتے یہی بات نکالی کہ ایک وکیل لندن بھیجا اور کورٹ آف ڈائرکٹرس کے سامنے تمام مقبوضات کمپنی کی مستاجری کا معاملہ پیش کیا۔ وہاں درخواست پذیرا ہوئی لیکن یہ شرط پیش کی گئی کہ اٹھارہ کرور روپیہ پیشگی داخل ہو جائے۔ چنانچہ نہیں معلوم کس طرح جفا و کفاف سے بسر کرکے سترہ کرور روپیہ نواب نے جمع کر لیا۔ ایک کرور کی فکر باقی تھی وہ بھی ہو جاتی لیکن۔ ع قسمت کی کم نصیبی کو میا دیا کرے۔ موت نے فرصت نہ دی۔ سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ ایک روایت یہ بھی تاریخوں میں لکھی ہے کہ ٹوآسلی صاحب جو نواب کے بڑے دوست اور مصاحب خاص تھے۔ رخصت لے کے ولایت گئے۔ اُنکو نواب کی ہمدردی و اعانت اور فائدہ رسانی کا بڑا خیال تھا۔ اُنھوں نے

ولایت جاکے یہ تجویز ٹھہرائی کہ "لارڈ ہیسٹنگ جو جارج چہارم شاہ انگلستان کے بڑے رفیق ہین بسبب افلاس و بے زری تنگدست و پریشان حال ہیں۔ اُنکے ساتھ اگر کچھ سلوک کیا جائے تو ضرور کوئی راہ نکل آئے" اُنھوں نے نواب کو اُنکے حال پُر اختلال پر متوجہ کیا چنانچہ نواب کی دولت سے اُنکا پاپ کٹا۔ ولذرمنا۔ وہ اس غائبانہ عنایت و مدارات کے بہت مشکور اور احسانمند ہوے۔ اتفاق یہ کہ بعد چندے وہ ہندوستان کے گورنر جنرل ہوکے آئے آتے ہی آتے اُنھوں نے نواب کے یہ گوشگزار کرایا کہ مین تو صرف آپ کے معاملات کی درستی کے لیے ہندوستان آیا ہوں۔ یہ خوشی سے جامے مین پھولے نہ سمائے۔ اکثر یہی بات زبان پر لائے۔ دوستوں دشمنون مین چرچے ہونے لگے۔ آخر۔ کسی بدخواہ نے موقع پاکے زہر دیدیا شب بھر کرب و بیچینی رہی۔ دوسرے دن ۲۴۔ رجب روز دوشنبہ ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۲۔ جولائی ۱۸۱۴ء کو روح نے قالب خاکی سے پرواز کیا "آہ شد گنج سعادت درزمین" تاریخ وفات ہوئی اور جنت آرامگاہ لقب ملا۔

سعادت علیخاں کو ملکی مصلحت سے اگرچہ بہت دنوں تک بیحد کفایت شعاری سے بسر کرنا پڑی پھر بھی لکھنؤ کی زیب و زینت مین اُنھوں نے کوئی کمی نہین کی۔ اُنکے نام کا گنج ابتک آباد ہے۔ اُنکی بنائی اور بنوائی ہوئی کوٹھیوں میں سے بھی بعض ابتک موجود ہین۔ تعمیرات کی مد مین اُنھوں نے بہت کچھ صرف کیا بہت کچھ شہزادوں کو دے کے اُنسے صرف کرایا۔ اُنکے وقت کی عمارتین ایک سلسلے سے شہر کے شمالی حصے میں دو تک چلی گئی ہیں۔ اگرچہ اب اُن مین بہت کم اچھی عمارتین رہگئی ہین پھر بھی اُنکی یاد تازہ کرنے کے واسطے کافی ہیں۔ دلکشا۔ حیات بخش۔ دار الشفا کنکڑ والی کوٹھی۔ نور بخش۔ بادشاہ منزل۔ چینی بازار۔ ٹیڑھی کوٹھی۔ موتی محل۔ دلارام خورشید منزل۔ فرح بخش۔ قصر السلطان اور بیلی گارد کی اینٹوں سے اب بھی سعادت علیخاں کا نام و نشان چلا جاتا ہے۔ محمد باغ کو زمین وسیع سے گھیر کے رمنہ اُنھیں نے بنوایا تھا۔ حضرت عباسؑ کی مصنوعی درگاہ کی تعمیر اور تزئین مین لاکھون روپیہ اُنھیں نے صرف کیا تھا۔ تال کٹورے کی کربلا بھی اُنھین کے عہد مین بنی اور شہر میں اربعین تک عزاداری کی رسم بھی اُنھیں کے زمانے کی نکالی ہوئی ہے۔

* * *

(۷) شاہ زمن غازی الدین حیدر

یہ نواب سعادت علیخاں کے بڑے بیٹے تھے۔ باپ کی عہد حکومت میں کچھ تو فطرتی نقص دماغی سے وارفتہ کچھ کثرت منشیات سے مست الست رہتے تھے۔ مدت تک باپ انسے اور یہ باپ سے آشفتہ و آزردہ رہے۔ دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا۔ ایک گوشۂ عافیت میں خاموشی اور اطمینان سے بسر کرنے لگے۔ جب باپ کے "جنت آرامگاہ" ہونے کی خبر سنی فوراً در دولت پہ پہونچے۔ وہاں شمس الدولہ دوسرے بھائی دعویدار ریاست کا نقشہ جما نظر آیا۔ لیکن انکے پہونچتے ہی ہوا کا رُخ بدلگیا۔ بیلی صاحب رزیڈنٹ نے انھیں کو مسند نشیں کرکے پہلے شمس الدولہ سے نذر دلوائی۔ شلک چلی۔ سلامی اُترنے لگی۔ شہر میں منادی ہوگئی۔ سارے قضیے طے ہوگئے بہتیروں کی امیدوں تمناؤں پہ پانی پھر گیا۔ لیکن اب لوگوں نے نیابت کے واسطے خاک اُڑانا شروع کی۔ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں پڑگیا۔ کسیکو یہ خبر نہ تھی یہ "ہمارے اوج سعادت" کسکے "دام" میں گرفتار کس کے سر پہ سایہ فگن ہوگا۔ لیکن یہ معاملات تقدیری ہیں۔ اس میں کشش و کوشش بے سود ہوتی ہے۔ اگرچہ بہتیرے قدیم الخدمت جان نثار موجود تھے اور سب اپنے اپنے حقوق و خدمات پیش کررہے تھے لیکن نواب کی نظر ایک پر نہ جمی۔ آغا میر سے دل ملا ہوا تھا اُنھیں پر نگاہ پڑی۔ قلمدان نیابت اور اُسی کے ساتھ معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خاں ضیغم جنگ خطاب عطا ہوا۔ دو گھڑی میں یہ عروج پایا کہ خاک سے پاک ہوگئے۔ ہر طرف طوطی بولنے لگا۔ غازی الدین حیدر کے عہد حکومت میں پھر نئی بساط بچھی۔ آصف الدولہ کے عہد کا نقشہ جمگیا۔ انکو باپ کے وقت کا بھرا پُرا خزانہ لٹانے کو مل گیا تھا۔ خوب کھُل کھیلے۔ ایک تو خود ہمت عالی رکھتے تھے۔ اُسپر نائب الریاست ملے وہ بھی اول درجے کے سیر چشم۔ دونوں نے ملکے بیحد زر پاشی کی۔ لاکھوں کے گھر بن گئے۔ مالامال ہوگئے۔ سعادت علیخاں کی گاڑھی کمائی کا روپیہ ارباب نشاط پہ وقف ہوگیا۔ دولت و ثروت کی اس فراوانی اور ایثار سے لکھنؤ میں گلی کوچے مینا بازار لگ گیا۔ حسینان عالم جمع ہونے لگے۔ حسن پرست بیفکروں کے دم قدم سے ہر طرف تازہ چہل پہل شروع ہوگئی۔ غازی الدین حیدر کو زمانہ بھی اچھا ملا تھا۔ حکومت پائی تو ہر ایک طرح کے خرخشے سے پاک صاف پائی۔ ملک گیری کی بلند حوصلگی تو عرصہ ہوا ختم ہوچکی تھی۔ سعادت علیخاں کے عہد میں جو انکار جدید وسعت اقتدار یا اضافۂ قوت کے شروع ہوئے تھے اب وہ بھی

باقی نہ رہے۔ ادھر لارڈ ہیسٹنگ کی گورنر جنرلی کا زمانہ آگیا تھا۔ وہ ہر طرح سے اعانت و ہمدردی پر آمادہ تھے۔ سب سامان فارغ البالی کے جمع ہوگئے ان سب پر مستزاد یہ کہ سعادت علیخاں کے جمع کیے ہوے سترہ اٹھارہ کرور روپیہ نے نہیں معلوم کتنی بوتلوں کا نشہ پلا دیا کہ نواب نائب بلکہ سارا دربار متوالی کو دوں کھا گیا۔ اور متوالا ہوگیا۔ عیش و نشاط کی لے بڑھی۔ خود فراموشی اور سیہ مستی کا راج ہوگیا۔ اب نہ کوئی سرکش اور نادہند تعلقداروں زمینداروں کی خبر لینے والا رہا۔ نہ امانی بندوبست کا نگرانی کرنے والا۔ ناظم اور چکلے دار پھر لوٹ مار کرنے لگے۔ پرچہ نویس اور اخبار نگار دھمکا دھمکا کے جیب و دامن بھرنے لگے۔ بیگمات شاہی اور اُنکے ادنیٰ ادنیٰ متوسل کو وہ عروج نصیب ہوا کہ جاں نثاران سلطنت مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ جسنے کسی محل سے کچھ سلسلہ ملایا۔ بازار حُسن کی دلالی کی اُسی کا مرتبہ بلند ہوگیا۔ ان باتوں سے دلسوزی اور دیانت سے کام کرنیوالوں کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ ساری ترقی کا دارمدار جوڑ توڑ اور سازش پر آرہا۔ نہ صلۂ خدمت پر کسیکو نظر تھی۔ نہ قدرشناسی اہل کمال کا کسیکو خیال۔ اک عجب عالم بےفکری و شادمانی تھا۔ کہ ہر شخص اُسکے مزے لے رہا تھا۔ بنتے بگڑتے کسیکو دیر ہی نہ لگتی تھی۔ اُمید و آرزو کا سبز باغ ہر وقت ہر شخص کو شاداں و فرحاں رکھتا تھا۔ جو آج گردش زمانہ سے بگڑ گیا ہے اُسے بھی اُمید لگی ہوئی ہے کہ دو گھڑی میں پھر وہی کارخانے ہوجائینگے القصہ حاکم و محکوم سب ایک ہی رنگ میں شرابور۔ توکل اور فارغ البالی کی شراب سے مدہوش تھے۔ خیریت اتنی تھی کہ اس ابتری اور بےخبری کے حال میں بھی کچھ سنجیدہ اور فہمیدہ اشخاص بھی دربار میں پہونچے ہوے تھے اور وہ بہت کچھ پولیٹکل معاملات کو سنبھالے اور لیس پونت سے ظاہر درست کیے رہتے تھے۔ درحقیقت انھیں لوگوں کی بدولت بقا و قیام ریاست تھا۔ ورنہ رئیس کی غفلت اور اہلکاروں کی بدکرداریوں سے جو ہوتا تعجب تھا۔ انھیں سے مفتی خلیل الدین خاں (کاکوروی) اور سبحان علیخاں تاج الدین حسین خاں (جنمیں سے ہر ایک اپنے زمانے کا افلاطون و جالینوس تھا) زیادہ ممیز و ممتاز تھے۔ انھیں کو معتمد الدولہ کے مزاج میں درخور بھی بہت تھا۔ اور وہ انکی عقلمندی و فراست پر اعتماد کلی بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ بہت کچھ دارومدار اہم معاملات ملکی کا بھی انھیں لوگوں پر تھا۔ انمیں سے مفتی خلیل الدین خاں صاحب کو سرکار انگلشیہ میں بھی بہت رُسوخ حاصل تھا۔ اکثر میران کونسل اُنکے باپ قاضی القضاۃ نجم الدین علیخاں کے دوست بلکہ احسانمند تھے۔ اُنھوں نے معتمد الدولہ کو یہ سوجھائی کہ

محکمۂ سفارت جو خان علامہ کے بعد سے شکست ہو گیا ہے از سر نو قائم ہونا چاہیے۔ چنانچہ معتمد الدولہ نے اُنھیں کو یہ کوشش سپرد کی۔ جب اُنکی مساعی مشکور ہوئیں تو معتمد سرکار ریں ہونیکی وجہ سے وہی کلکتہ مین سفیر شاہ اودھ مقرر ہوے۔ یہ از غیبی سامان ایسے جمع ہوگئے جنسے انگریزی گورنمنٹ سے رابطۂ اتحاد و وداد اور بھی مضبوط ہو گیا۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانے میں لارڈ ہیسٹنگ دہلی گئے وہان محمد اکبر شاہ کی بعض بے عنوانیون سے کچھ ایسا رنج ہونچا کہ آزردہ ہو کے پلٹے تو یہ دل مین طے کر کے بیٹھے کہ اب کوئی جوڑ بھڑ کانا اور شاہ عالم پناہ کو جلانا چاہیئے۔ چنانچہ مستقل ارادہ کر لیا کہ کمپنی کو اب اس ملک مین تاج بخش بننا چاہیے۔ اب انتخاب ہونے لگا کہ کون اس منصب کے شایاں ہے۔ سب سے پہلے اودھ پر نظر پڑی۔ لیکن یہ مسئلہ نازک تھا۔ طرح طرح کی دقتین مشکلیں ایسی حائل تھیں کہ بے محابا یہ سخن نہ زبان پر آسکتا تھا۔ نہ تحریر مین لا سکتے تھے۔ مفتی خلیل الدین صاحب کو اسکی سُن گُن ملگئی۔ انکو تو اپنے آقا کی عزت افزائی و سربلندی کے ایسے موقع کے ہاتھ لگنے کی تلاش ہی تھی فوراً معتمد الدولہ کو خبر کی۔ چنانچہ یہاں سے گورنر جنرل پاس تحریر پہونچی۔ استمزاجاً پوچھا گیا کہ اگر ہم برسر خود بادشاہی کا خطاب لین۔ تاج و تخت کے مالک بنیں۔ اپنا سکہ جاری کریں تو کمپنی کسیطرح خلل انداز تو نہ ہوگی۔ گورنر جنرل نے کورٹ آف ڈائرکٹرس سے پوچھا۔ وہاں سے جواب ملا کہ انھیں اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ کسیکو رخنہ انداز ہونے کی کوئی وجہ نہین۔ چنانچہ ۱۸۔ ذیحجہ ۱۲۳۴ھ روز شنبہ مطابق ۱۸۱۹ء کو نواب غازی الدین حیدر تخت نشین ہوے۔ ابو المظفر معز الدین شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ غازی خطاب ٹھہرا۔ ایک کروڑ روپیہ میں تخت و تاج۔ سامان شاہی و اسباب جلوس مرتب ہو گیا۔ جشن ہونے لگے۔ شادیانے بجنے لگے۔ معتمد الدولہ کو بھی وزیر اعظم کا خطاب مل گیا شیخ امام بخش ناسخ نے تاریخ کہی "شہ اسکندر وزیر ارسطا طالیس" اگرچہ واقف کار جانتے ہین کہ کس حد تک شاہ اسکندر گیتی ستان تھے اور وزیر ارسطوے دوران۔ لیکن شاعرانہ نظر سے یہ بھی "گر ضرورت بود روا باشد" البتہ دونکی فیاضی و سیر چشمی۔ جود و سخا کی جسقدر تعریف کیجائے بجا ہے۔ بادشاہ تو خیر بادشاہ ہی تھے۔ معتمد الدولہ کی ہمت عالی اور رفقا پروری سے جو دریاے کرم جوش میں آیا تھا اُس سے ہزاروں تشنہ کام سیراب ہو گئے۔ ایک میر بندہ علی صاحب نے منشیگری میں گیارہ برس رفاقت کی۔ چودہ لاکھ کمایا اُڑایا۔ محمد خاں خدمتگار نے نو مہینے کی خدمت کے صلے میں چالیس ہزار روپیہ کمشت پایا۔ اسی طرح لاکھوں روپیہ رفیق رفقا کو ضرورت کے وقت دیا۔ ہزارہا روپیہ کے شالی

دوشالے معمولی خدمتگزاروں کو بٹے۔ بیٹے کی شادی اس دھوم دھام تزک و احتشام سے کی۔ کہ لاکھوں روپیہ صرف کر ڈالا۔ او نے یہ سنا ہے کہ اس شادی میں مداریہ حقّہ (جو ایک بیسے کو ملتا ہے) پندرہ ہزار روپیہ کا صرف ہوا۔ روشن الدولہ سمدھی نے شربت پلائی کے وقت نواب کی ہمت عالی کو آزمانا چاہا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ "ہمنے سولہ لاکھ روپیہ جو تمھاری نظامت میں باقی ہیں اس شربت پلائی میں دیے" طرّہ یہ کہ جب بادشاہ کو پرچہ گزرا اُنھوں نے وزیر سے پوچھا۔ عرض کی "حضور۔ روشن الدولہ نے اسی پہ قناعت کی۔ اگر کچھ تامل کرتے میں زرتحصیل دوسرے سال کا بھی دیدیتا"

شاہ و وزیر کی اسی سیرچشمی سے انگریزوں کے بھی بہت کام نکلے۔ چنانچہ جب برہما کی لڑائی چھڑی۔ کمپنی کو روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ مفتی خلیل الدین خاں نے بادشاہ سے تحریک کی۔ اور ایک کرور روپیہ بطور قرض مؤید کمپنی کو دلادیا۔ جسکا منافع پانچ لاکھ سالانہ ٹھہرا۔ اور یہ طے ہوگیا کہ ہمیشہ اُن اشخاص کو ملا کریگا۔ جنکے نام دستاویز وثیقہ میں لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح جب نیپال سے لڑائی چھڑی تب بھی بادشاہ نے ایک کرور روپیہ قرض دیا۔ لیکن اُسکے معاوضے میں کھیری گڑھ اور ترائی کا ملک کمپنی نے بادشاہ کے سپرد کردیا۔

مفتی خلیل الدینخاں سے کے شہباز فکر کے بلند پروازی نے گورنر جنرل اور ممبران کونسل ہی تک قناعت نہ کی۔ ولایت تک کی خبر لی۔ اُنھوں نے بادشاہ کو باخفا لکھا کہ "اگر آپ سے اور شاہ جمجاہ انگلستان سے راہ و رسم ارسال ہدایا و تحریر محبت نامہ ہوجائے غالب ہے کہ بہت سے مطلب برآری بے منت و بسہولت ہوسکے گی" چنانچہ یہاں سے "ایک سہری طلائی بہت پر تکلف اور لکھنؤ کی مغرق گرگابی اور ایک تلوار ولایتی جسے نواب آصف الدولہ نے پچاس ہزار روپیے کو خریدا تھا اُسکا قبضہ مرصع کار ڈاب کمر بہت بھاری اور بعض اسباب تحفہ اور پیٹی تلوار جسمیں ہزارہا کا جواہر نصب کیا تھا مع محبت نامۂ شاہی باخفا کلکتے بھیجا۔ وہاں سے باخفا معرفت تاجران نامی کلکتہ روانۂ ولایت ہوا۔ بسلامت بادشاہ تک گزرا۔ اُسے ہدیۂ تکلف و بے منت سمجھ کے قبول کیا اور جواب محبت نامہ بکمال تہذیب از آداب والقاب و عبارات شوقیہ عنایت ہوا اور آخر مضمون یہ تھا کہ تم سب طرح سے اپنے ممالک محروسہ میں مالک و مختار رہو۔ اور ایک گھوڑا ولایتی خانہ زادان شاہی سے جسکی قیمت ولایت میں کئی ہزار تھی مع زین طلائی۔ دامنی مغرق۔ جوڑی تمنچہ۔ قبور کار طلا اور کئی بندوق ساز طلا۔ اور کئی گھڑیاں مع زنجیر جواہر نگار مجموع مالیت سب لاکھ روپے کی معرفت نواب گورنر جنرل بہادر بھیجا گیا"

لیکن افسوس یہ ہے کہ غازی الدین حیدر کی قسمت میں اس جواب باصواب آنے کی مسرت سے لطف اُٹھانا نہیں لکھا تھا۔ جسوقت یہ ہدیہ ہندوستان میں پہونچا ہے۔ اُسوقت بادشاہ خلد مکان ہو چکے تھے۔ وہ لوگ ہی باقی نہیں رہے تھے۔ جو اسکی قدرشناسی کرتے۔

غازی الدین حیدر کا زمانہ اودھ میں ایک طرح سے سکون و اطمینان کا زمانہ تھا کہ بیرونی خرخشوں اور چھیڑ چھاڑ سے پاک صاف رہے۔ انگریزوں سے کبھی ان بن نہیں ہوئی۔ بلکہ محبت کے پینگ انگلستان تک بڑھے۔ اسے چاہے نیکدل بادشاہ کی خوش اقبالی کہو۔ چاہے فیاض طبیعت، وزیر کی سیرچشمی دریادلی کا بدلہ سمجھو اور چاہے عاقل وزیروں مشیروں صلاحکاروں کی حُسن تدبیر و فراست پر محمول رکھو۔ بہرصورت رعایا برایا کی خوشحالی و شادمانی کا دورہ تھا شہر کے باشندے چین سے گھرونمیں پاؤں پھیلا کے سوتے تھے۔ عیش و نشاط۔ سُرور و انبساط کے سوا کسی کو کچھ فکر نہ تھی۔ سونے چاندی۔ مونگے موتی۔ لعل و زمرد کی یہ ریل پیل تھی کہ سبکی آنکھوں کے پردے پھٹ گئے تھے۔ دولت دنیا کی کچھ حقیقت کسیکی نظرونمیں نہ رہی تھی۔ بے محنت بے مشقت چھپر پھاڑ کے دولت برس رہی تھی قدر کیا ہوتی۔

اس دور حکومت و بادشاہت مین شہر کی تزئین میں خود بادشاہ نے بہت کچھ صرف کیا۔ اور معتمد الدولہ نے تو آصف الدولہ کا نام روشن کر دیا۔ پچاس لاکھ روپیہ لگا کے انھوں نے ایک امامباڑہ بنوایا تھا۔ انھوں نے بھی پچاس لاکھ صرف کرکے کوٹھیوں محلسراؤں کا ایک جنگل بنا کے کھڑا کر دیا۔

غازی الدین حیدر کے وقت کے موتی محل اور شاہ نجف سعادت علیخاں اور اُنکی بیوی کا مقبرہ اب تک اچھی حالت میں ہیں۔ باقی شاہ منزل۔ مبارک منزل۔ قدم رسولوں کی عمارتوں کا تو نام و نشان بھی باقی نہیں۔

اسی طرح فرح بخش اور لال بارہ دری کے درمیان بادشاہ نے ایک نہر بھی نکالی تھی۔ اُسکے واسطے سولہ گھوڑے کی قوت کا ایک انجن منگایا تھا۔ جسکے ذریعے سے دریا سے پانی نہر میں آتا تھا۔ اب نہ نہر باقی ہے نہ نہر سے پیاس بجھانیوالے۔

غازی الدین حیدر پینتالیس چھیالیس برس کی عمر مین مسند نشین ہوئے تھے۔ قُولے اچھے تھے۔ آرائش مکان میں خاص سلیقہ رکھتے تھے۔ اور اس باب مین ایجادین کرتے تھے۔ لیکن بدپرہیز بہت تھے۔ یہی بدپرہیزی رنگ لائی اسہال میں مبتلا ہوئے

اور ایسے مبتلا ہوئے کہ یہی روگ مرض الموت ہوگیا۔ آخر۔ ۲۰۔ ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۔ اکتوبر سنہ ۱۸۲۳ء کو روح ریاض جنت کو سدھاری قالب خاکی کو چھوڑ گئی۔ دوسرے دن امامباڑہ نجف اشرف میں دفن کیے گئے۔ کسی نے تاریخ کہی ہے

گشت تاریخ مصرعۂ اُستاد و اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(۸) شاہ زماں نصیر الدین حیدرؔ

انکا خطاب سلیماں جاہ تھا۔ غازی الدین حیدر کے بیٹے تھے۔ ۲۲ جمادی الاول سنہ ۱۲۱۸ھ مطابق سنہ ۱۸۰۳ء کو مسماۃ تاج دولت مخاطب بخطاب ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئے صغر سنی ہی میں ماں کے آغوش شفقت سے اجل نے محروم کردیا۔ بادشاہ بیگم صاحبہ نے اپنی اولاد بنا کے پالا۔ اُنکے سایۂ عاطفت میں زمانۂ شاہزادگی بہ عیش و کامرانی بسر گیا۔ لیکن کچھ موجودہ سامان عیش و راحت کچھ آیندہ کی اُمیدوں نے اتنا سرشار کیا کہ کھل کھیلے۔ ایک تو طفلی تلون۔ تنک مزاجی۔ ضد۔ زود رنجی۔ دوسرے شاہانہ تعلیم و تربیت۔ ہر بات پہ اللہ آمین۔ اُسپر جوانی کے جوش۔ شباب کی اُمنگیں۔ ہر وقت کا سرور۔ عادتیں بگڑنے لگیں۔ بیہودہ مشاغل شروع ہوگئے۔ اُٹھان اچھا نہ اُٹھا۔ یہ رنگ دیکھکے بادشاہ بہت کُڑھنے اور آزردہ رہنے لگے۔ لیکن اسمیں شاہزادے کی خطا نہ تھی۔ اُنھوں نے آنکھ کھول کے دیکھا تو یہی دیکھا کہ سارا شہر رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ حاکم اور محکوم۔ راجا اور پرجا سب عیش و عشرت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُنھیں بھی ابتدا ہی سے دید وادید کا لپکا پڑا۔ آنکھ اچھی صورت دیکھنے کی آرزومند ہوئی تو کان سریلی صدا کے سننے کے مشتاق۔ دل چاند سے مکھڑے کی رونمائی کے لیے وقف ہوا۔ تو جان کسی کے اوپر جانے کے واسطے ہر وقت ہتیلی پہ رہنے لگی۔ باپ کو رتق و فتق سلطنت میں دماغ سوزی کرتے ایک دن نہ دیکھا۔ پھر اُنھیں از خود یہ دردِ سر خریدنے کا حوصلہ کیونکر ہوتا۔ پھر بھی باپ باپ ہی تھے۔ بیٹے کے یہ اطوار کیونکر پسند کرتے۔ اُسپر طرّہ یہ ہوا کہ غمازوں نے موقع پا کے خوب نون مرچ لگایا۔ اور باپ کے دل میں بیٹے کیطرف سے دیوار اُٹھادی بیگم صاحبہ شاہزادے کی حمایتی تھیں وہ بھی معتوب ہوئیں۔ اسی کشاکش میں ایک بار صف آرائی کی نوبت پہونچی۔ انگریزی رزیڈنٹ نے بیچ بچاؤ کیا۔ آخر۔ شاہزادے کو لے کے بیگم صاحبہ شہر کے باہر ایک باغ میں رہنے لگیں۔ اب میدان خالی پا کے حریفان غماز

نے بڑے بڑے جوڑ مارے۔ شاہزادے کو تاج و تخت کیا معنے۔ متاعِ زندگانی سے محروم کر دینے کی کوشش کی۔ لیکن ؎

چراغے را کہ ایزد بر فروزد ٭ کسے کو تف زند ریشش بسوزد

سب نے منہ کی کھائی۔ ایک کی مراد نہ بر آئی۔ وہ شمع کاشانۂ اقبال یعنی شباب آمدی جوانی میں جبکہ دیوالی کے چراغاں سے سارا شہر منور تھا۔ بزم افروز ایوان سلطنت ہو گیا یعنے بادشاہ کے خلد مکان ہوتے ہی بیگم صاحبہ در دولت پہ پہونچ گئیں۔ شہزادے کے سوا اور کوئی دعوے دار سلطنت نہ تھا۔ لہذا انگریزی ریذیڈنٹ نے فوراً تاج شاہی سر پہ رکھدیا۔ نذریں گزرنے لگیں۔ سلامی کی توپ چلی۔ شادی مبارک کی دھوم مچی۔ ابو النصر قطب الدین سلیمان جاہ سلطان عادل نوشیرواں زماں حضرت شاہ زمان نصیر الدین حیدر بادشاہ غازی خطاب ہو گیا۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کے وقت کے کارنامے مورخانہ تحقیق و تنقید کے شایان نہیں ہاں ناول میں لکھے جائیں تو ناظرین کی دلچسپی کا بہت اچھا سامان جمع ہو جائے۔ اسلیے ہم چند خاص واقعات تاریخی کو قلمبند کر کے اپنے ناظرین کو اُس وقت کی ایک سرگزشت سناتے ہیں۔ یہ سرگزشت بادشاہ کے ایک یورپین مصاحب نے لکھی ہے جسنے کئی برس کے قیام لکھنؤ میں یہاں کے ظاہری و باطنی حالات سے اچھی واقفیت حاصل کی تھی۔ اُسکے صداقت بیان کا اندازہ ناظرین کی رائے پر چھوڑ کے اتنا کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جزئی اختلافات یا ناموں کے تغیر کے سوا اور جہاں تک تحقیق کی گئی اکثر واقعات کی تصدیق تاریخ و روایت سے بخوبی ہوتی ہے۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کی تخت نشینی کا پہلا کار نمایاں یہی تھا کہ سامان عیش و راحت کے جمع کرنے پر مقربان بارگاہ مصروف و منہمک ہو گئے۔ ایک سو کئی طائفہ ارباب نشاط کے (جو سرآمد چکلہ تھے) ملازم ہو گئے۔ دولاری فیلبانی (جسکا خطاب ملکۂ زمانیہ ہوا) کا موافق عہد و میثاق سعیدی دور دورہ ہوا۔ چھ لاکھ کی جاگیر مقرر ہوئی۔ پھر والٹر کی بیٹی مخاطب بخطاب مخدرۂ علیا کی باری آئی چھ لاکھ کی جاگیر اُنکو بھی ہو گئی۔ اسکے بعد خورشید محل (جنکا خطاب بعد چندے تاج محل ہو گیا) کا نمبر آیا چھ لاکھ کی جاگیر اُنکو بھی ملی۔ اسی کے ساتھ ہی بادشاہ بیگم صاحبہ کی جاگیر جو نو لاکھ کی جسے معتمد الدولہ نے ضبط کر لیا تھا بحال ہو گئی۔ پھر جب بادشاہ نے انگریزوں کو باسٹھ لاکھ قرض دیا تو اُسکے سود سے ملکۂ زمانیہ کا چودہ ہزار مخدرۂ علیا اور تاج محل کا چھ چھ ہزار ماہوار وثیقہ ہوا۔ ان سب پر شہزاد

قدسیہ بیگم کا دور دورہ ہوا۔ جنکی جود و سخا لاکھوں کیا معنے کروروں پر بند نہ تھی۔ کچھ کم چار برس کے عرصہ میں چار کرور روپیہ خرچ کیا۔ موت نے جلد خبر لی ورنہ سلطنت ناک لگ جاتی۔ ان جاگیرات و وثائق کے علاوہ ہر ایک صاحبات محل کے متوسلین۔ اعزا اقربا کے بیش قرار مشاہرے مقرر ہوگئے وہ لوگ جو نان شبینہ کو محتاج تھے۔ جنھیں "سفید کپڑے چمڑے کی جوتی میسر نہ تھی" فیل نشین ہو ہو کے نکلنے لگے۔ اللہ اللہ

خانہ تھا گنجفے کا ہر ایک قصر شہر عشق ؛ گھر گھر تھیں بادشاہیاں گھر گھر وزارتین

ان نو دولتوں کی وجہ سے شہر میں اک طوفان بے تمیزی برپا ہوگیا۔ انتہا۔ دولت وثروت نمود جاہ وحشمت سے ہر کوچہ و برزن میں اک بہار آگئی۔ امرائے دولت واعیان سلطنت کے جلوس سواری کے کرّوفر سے ہر طرف رونق تازہ پیدا ہوگئی۔ کہیں راہ گلی میں نوبت ونقارہ کی صدا ماہی مراتب کی شوکت وشان سے چشم وگوش لذت اٹھاتے۔ کہیں یاران بے تکلف کی صحبت میں ناؤ نوش کی آوازوں اور پری پیکروں کی جلوہ نمائی سے دل ودماغ پر عالم سرور وسرخوشی طاری ہوتا۔ القصہ بے فکری وبے اندازہ دولتمندی سے جو سامان جمع ہوسکتے ہیں سب جمع ہوگئے تھے۔ ہر شخص بحال خود شاداں وفرحاں تھا۔ اسکی کسے پروا تھی کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اور خلقت پر کیا گزر رہی ہے۔ خود بادشاہ سلامت کو تخت پر بیٹھتے ہی بیٹھتے جو خیال ہوا بھی تو اسی قدر کہ کسیطرح معتمد الدولہ کو معزول بلکہ ذلیل وخوار کرکے کینۂ دیرینہ کا انتقام لینا اور دل کے پھپھولے پھوڑنا چاہیے چنانچہ جب دسمبر ۱۸۲۷ء میں لارڈ کومبرمیر کمانڈر انچیف افواج انگلشیہ تشریف فرمائے لکھنؤ ہوئے تو انکا واسطہ دے کے صاحب رزیڈنٹ کو آمادہ کرایا۔ بالآخر رزیڈنٹ صاحب کے ہاتھوں یہ مہم سر انجام ہوگئی۔ یعنے نواب زیر حراست ہوگئے۔ بادشاہ سلامت اب خود مہمات سلطنت پر موجود ہوئے۔ چندروز میں یہ لہر جاتی رہی۔ بعد چندے جب اعتماد الدولہ میر فضل علیخاں کو منصب وزارت پر سرفراز کیا پھر وہی بیخودی وہی رندی سیہ مستی شروع ہوگئی۔ اعتماد الدولہ نے چند روزہ وزارت میں ایک کرور روپیہ پایا۔ لیکن دربار کا رنگ بدلا دیکھکے بسبب خودداری کنارہ کشی اختیار کی۔ زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ اسی زمانہ میں بادشاہ کی صحبت میں کچھ یورپین لوگ زیادہ دخیل ہوگئے تھے۔ جنکے نام مسٹر ہلٹن نے یہ لکھے ہیں۔ ڈی رسیٹ حجام۔ مسٹر رائٹ معلم۔ مسٹر مانز مصور ومطرب۔ مسٹر کروپلی مہتمم کتب خانہ۔ اور کپتان میگنس۔ انہیں میں ڈی رسیٹ بہت زیادہ منہ لگا تھا۔ ایک روز بحالت مخموری بادشاہ کے سامنے اپنی بیخودی [illegible] حرکات

مسخرگی کر رہا تھا۔ اعتمادالدولہ بھی موجود تھے۔ بادشاہ نے اُنسے کہا کہ تم اس سے ہنسو۔ اُنھوں نے کچھ چھیڑا۔ اُسنے جواب سخت دیا۔ بلکہ پگڑی پر دست درازی کی۔ اُنھوں نے بادشاہ سے شکوہ کیا اور بہت آشفتگی ظاہر کی۔ بادشاہ ٹال گئے اُنھیں کلمات ناملائم کہکے چلے آئے۔ پھر دربار نہ گئے۔ بہت بلائے گئے لیکن اُنھوں نے قدم گھر سے نہ نکالا۔ آخر خود بادشاہ سلامت تشریف لے گئے۔ دروازے پر کھڑے رہے۔ جب وہ گھر سے نکلے تو اپنے ہمراہ خواصی میں بٹھا کے لائے۔ خلعت کو حکم ہوا لیکن انھوں نے بمنت سماجت اپنی گلوخلاصی کرائی۔ وزارت چھوڑ کے گوشہ نشینی اختیار کی بعد چندے مر گئے۔

اب نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی کا ستارۂ اقبال طلوع ہوا۔ یہ ازحد منتظم۔ جزرس۔ کفایت شعار۔ فریں وہوشیار تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُنھیں زمانہ اچھا نہ ملا۔ اُنھوں نے انتظامات تو بہت کرنا چاہے۔ لیکن ایک نہ چلا تخفیف اور سخت گیری نے اتنی نفرت بددلی اور برہمی عوام کے قلوب میں پیدا کر دی کہ جس سے ایک دن بھی انتظام کی چول نہ بیٹھی۔ البتہ اُنھوں نے لکھنؤ میں چند کام انگریزوں کے خوش کرنے یا دنیا کو اپنی روشن خیالی دکھانے کے لیے کیئے اور وہ ہو بھی گئے۔ یعنے اول تو ایک دارالشفا انگریزی اور یونانی علاج کی قائم کی اور اُسکے واسطے چھ لاکھ روپیہ گورنمنٹ کے خزانے میں تفویض کر دیا۔ جسکے منافع سے یہ دونوں اب تک چل رہے ہیں۔ دوسرے لیتھوگراف کا ایک چھاپہ خانہ اشاعت کتب کے واسطے قائم کیا۔ تیسرے لوہے کے پُل کی طیاری شروع کر دی۔ چوتھے گنگا سے نہر منگانے پر بہت کچھ روپیہ صرف کیا۔ پانچویں ایک محتاج خانہ قائم کیا۔ اُسکے اخراجات کے واسطے بھی کچھ روپیہ کے نوٹ خرید ے گئے۔ چھٹے ایک رصدخانہ سلطانی ہو گیا نواب منتظم الدولہ ہی کے عہد وزارت میں نواب معتمدالدولہ کے خارج البلد کرنیکا مسئلہ گورنمنٹ سے یوں طے پا گیا کہ نواب مع اہل وعیال ومال واسباب رزیڈنٹ کی حفاظت مین شہر سے باہر کسی مقام پر عملداری سرکار میں جا کے رہیں۔ اُنکی دعاوی کا بھی فیصلہ ہو گیا یعنے بائیس لاکھ روپیہ جو بابت ضمانت تنخواہ وغیرہ خزانہ رزیڈنٹی میں جمع تھا اور مجموع املاک جسکی تعمیر میں ایک کرور سے زیادہ صرف ہوا تھا دس لاکھ کی محسوب کر کے مجموع ۲۳ تیئس لاکھ

روپیہ دیدیا گیا اور اکتوبر سنہ ۱۸۲۰ء میں وہ روانہ کانپور ہو گئے۔ قیصر التواریخ کے مصنف نے تو نواب کی نقد و جنس کا تخمینہ صرف دو کروڑ روپیہ کیا ہے لیکن ہلٹن صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ نواب کا اسباب آٹھ سو چھکڑوں اور بے شمار اونٹوں ہاتھیوں پر بار ہو کے کانپور گیا۔ جسکی قیمت تخمینی پچیس لاکھ روپیہ تھی۔ اصل حال خدا جانے۔ اتنا ضرور ہے کہ معتمد الدولہ کے وقت میں سلطنت کی ساری آمدنی اُنھیں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ بادشاہ کو لٹانے کیواسطے سعادت علیخاں کی جمع کی ہوئی دولت کیا کم تھی کہ وہ حساب لیتے۔

نواب منتظم الدولہ کی غیر ہر دلعزیزی عوام کے احاطے سے نکل کے خواص تک پہونچی۔ حتے کہ صاحب رزیڈنٹ سے بھی بے لطفی ہو گئی۔ اُدھر محلات شاہی بھی اُنکے غرور و تمکنت سے زچ رہنے لگیں۔ اور وہ بھی بلند پروازی دکھانے لگے۔ یعنے ولیعہد تو ولیعہد خود بادشاہ سلامت پر آڑی آنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے معتوب قہر سلطانی ہوے۔ پھر موقوف کر دیے گئے۔ لیکن اُنھوں نے بھی مدت قلیل میں دولت فراواں جمع کر لی تھی۔ اُنکی آمدنی کا حال اس سے معلوم ہو سکتا ہی کہ ارون صاحب لکھتے ہیں کہ "انکو وزارت کی تنخواہ تین لاکھ سالانہ ملتی تھی اور اُسکے علاوہ مابہ الاحتظاظ کی یہ صورت تھی کہ تمام اعلے عہدہ داران سلطنت کی تنخواہوں میں سے ایک ربع وضع ہو کے اُنھیں ملتا تھا جس کی میزان تخمیناً سترہ لاکھ سالانہ ہوتی تھی۔ یعنے کل بیس لاکھ سالانہ آمدنی تھی" اور پھر اسکے علاوہ جو متفرق رقوم ملتے تھے اور وقتاً فوقتاً جو عطایاے شاہی ہوتے تھے اُنکا کوئی حساب نہ تھا۔

نواب منتظم الدولہ کے بعد نواب روشن الدولہ وزارت پر سرفراز ہوے۔ یہ معتمد الدولہ کی رفاقت کے جرم میں پیشتر معتوب تھے۔ اور اب اُن کی معزولی کے سبب انکی بسر اوقات بھی مشکل ہوتی تھی۔ لیکن منتظم الدولہ کے بعد انھیں کا ستارہ چمک گیا۔ اور اس منصب جلیلہ پر سرفراز ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ صاحب رزیڈنٹ کی نذر کو گئے تو اُنھوں نے کمال دردِ دل سے فرمایا کہ "ہمیں تعجب ہے۔ کہ تمنے وزراے ماضیہ کا حال بخوبی دیکھا ہی۔ پھر بھی دیدہ و دانستہ اس عہدۂ مستعار کو اختیار کیا" نواب نے عرض کی کہ "مرتا کیا نہ کرتا۔ اب میرا حال خانہ نشینی میں حد سے گزر چکا تھا۔ نہ سرکار سے کچھ مقرر تھا۔ نہ مال دنیا میرے پاس رہا تھا۔ اور نہ کسی سے قرض مل سکتا تھا۔ بہرصورت

سا اپنا موت کا تھا۔ میں نے اس خیال سے اختیار کیا کہ اب نواب وزیر اعظم مشہور ہو کے مرئیے تو بہتر ہے“

معزز ناظرین۔ میں اب اس داستان کو یہیں پہ ختم کرتا ہوں اور آپ کو اس عہد حکومت کے بقیہ حالات بادشاہ کے ایک یورپین مصاحب کی زبان سے سُنواتا ہوں امید تو ہے کہ وہ رام کہانی سُنکے آپ کے دل میں اُس وقت کی لکھنؤ کی حالت کا صحیح تصور پیدا ہو جائے گا۔ اور آپ کو نصیرالدین حیدر اور اُنکے درباریوں کی قدآدم تصویریں اس البم میں نظر آ جائیں گی۔

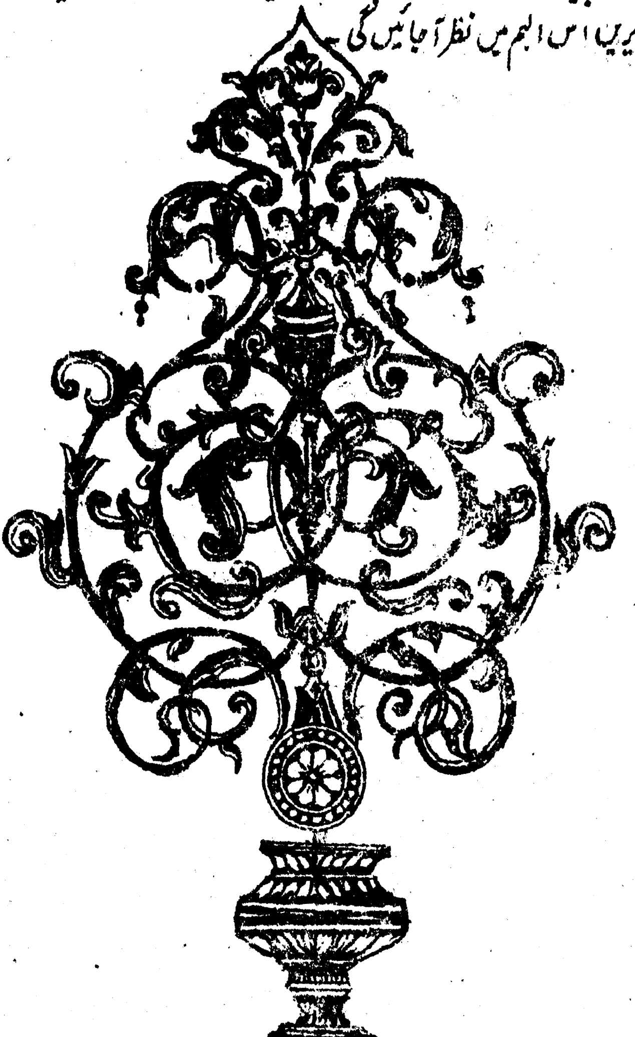

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع اول

از

(یکے از ملازمان خانگی)

مندرجہ ذیل ایک روئداد ہی اصلی واقعات کی اور کسی حالت میں فرضی و خیالی نہیں۔ تین ساڑھے تین برس جب میں لکھنؤ کے دربار شاہی میں رہا تھا تو میں واقعات روزمرہ کو بطور یادداشت ٹانکتا رہا تھا۔ اور انھیں یادداشتوں سے یہ کتاب ترتیب دیگئی ہی۔

عرصہ ہوا کہ نصیر الدین حیدر اپنے آبا و اجداد کے شریک قسمت ہوکر پیوند خاک ہو گئے ہیں۔ اور اُنکے دربار میں جو باشندگان یورپ بطور ملازمان خاص تھے اُنمیں سے خاص لوگ ابھی زندہ و سلامت ہیں اور انگلستان میں موجود ہیں۔ میں نے نہ اُنکے نام ظاہر کیے ہیں نہ اپنا نام ظاہر کرتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں ظاہر بھی کر دیتا تو پبلک کو زیادہ فائدہ نہوتا۔ لیکن اگر میرے بیانات کی صداقت میں کچھ چون و چرا کیگئی یا اگر ناموں کا اظہار روئداد کے تکمیل کرنیکے واسطے ضروری سمجھا گیا تو مجھے اُنکے ظاہر کردینے میں کچھ تامل نہوگا۔

میرے واسطے یہ آسان تھا کہ اپنے قیام لکھنؤ کی سرگزشت میں اپنے دلیرانہ کارناموں کا پتہ تو دکھاتا لیکن میں نے صرف اظہار حقیقت پر قناعت کی ہی اور میری تمامتر کوشش یہ رہی ہے کہ دربار لکھنؤ کی اندرونی کیفیت جو بچشم خود دیکھی ہی اُسی کو تحریر کروں۔ وہاں بہت سے نادرۂ روزگار باتیں تھیں۔ وہاں کے طرز معاشرت میں بہت سے خوفناک اُمور تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے بہتیرے منظر منظر پیش ہوے جنکو بعض اشخاص کی پاس خاطر سے میں نے قلم انداز ہی کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن ناظرین جو کچھ اس کتاب میں ملاحظہ فرمائینگے وہ سب مبالغے سے پاک ہی۔

یہ کوئی راز سربستہ نہیں ہی کہ آسمان کے نیچے اودھ سے زیادہ کسی ملک کا نظم و نسق ابتر نہیں اور اسبات کو ہر شخص تسلیم کریگا کہ اگر ہندوستان کی گورنمنٹ اُسکے ساتھ وہی برتاؤ کریگی جو اُسنے نہایت خوبی کے ساتھ پنجاب سے کیا ہی تو یہ اُسکے متعدد باشندگانکے حق میں ایک رحمت و برکت ہوگی۔ میں نے کوئی پولیٹیکل یادداشت نہیں لکھی ہی یہ صرف ایک سیدھی سادی سرگزشت ہی اور اسیوجہ سے وہاں کی اندرونی اور ملکی حالت کا جو کہیں کہیں اتفاقاً ذکر آگیا ہی وہ محض بر سبیل تذکرہ ہی۔

میں اپنا کام پورا کرچکا۔

لندن اکتوبر ۱۸۵۵ء

۷۸۶

شباب لکھنؤ

باب اول

دربار شاہی میں رسائی

بیس برس سے زائد عرصہ گزرا کہ میں ایک ذاتی کام سے اول مرتبہ وارد لکھنؤ ہوا تھا۔ اسوقت نصیر الدین حیدر خلف وجانشین غازی الدین حیدر بادشاہ فرمانروائے سلطنت اودھ تھے۔ میں نے زمانۂ قیام کلکتہ میں لکھنؤ کی نرالی ادائیں اور بادشاہ اودھ کی عجیب داستانیں سُنی تھیں یعنی وہاں ایک عظیم الشان وحش خانہ بادشاہ نے فراہم کیا ہے۔ یہ کہ بادشاہ اُن باشندگان یورپ کی جو کمپنی کے ملازم نہیں ہیں زیادہ قدر کرتے ہیں۔ یہ کہ باشندگان اودھ کو خاص قدرتی مذاق مبارزت ہے۔ اور یہ کہ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بہت سے مہیب صورت لوگ ڈھال۔ تلوار۔ بندوق اور پستول سے مسلح نظر آتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ میں نے اس قسم کے حالات تواتر سے سُنے تھے۔ تاہم چونکہ کئی موقعوں پر مجھے ناکامی ہو چکی تھی اسلیے اب بھی سب مجھے ناکامی ہی کا خیال پیش نظر تھا۔ لیکن اس مرتبہ مجھے تمام امور کا یقین کامل ہو گیا۔ کیونکہ یہاں میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ میرے وہم و خیال سے بھی زیادہ تھا۔ اول اول تو مجھے ایوان شاہی دیکھکر سخت حیرت ہوئی کیونکہ یہ عمارت فی الحقیقت ایک محل نہ تھا بلکہ گنجینۂ محلات و قصور تھا جسکا سلسلہ دریائے گومتی کے کنارے کنارے (جسپر لکھنؤ آباد ہے) دور تک

چلا گیا ہی۔ محل شاہی اودھ کا بعینہ وہی نقشہ تھا جیسا کہ محلات شاہی قسطنطنیہ یا ایوان شاہ ایران واقعہ طہران یا عمارات شاہی پکن[۵۱] کا سُنا جاتا ہی۔ کیونکہ کل مشرقی سلطنتوں میں محلات شاہی جو دار السلطنت میں ہوا کرتے ہیں محض بادشاہ کے قیام گاہ نہیں ہوتے بلکہ حکومت کے تمام کارخانے وہیں ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا شہر ہوتا ہی۔ اور اُسمیں ایک سلسلۂ محلات ہوتا ہی جسمیں حرم شاہی اور اُنکے حشم وخدم اور متعلقین ولواحقین ہوتے ہیں۔ پھر باغ باغچہ تالاب حوضیں فوارے اور آبشار چوک اور چوپڑ کے بازار۔ خاص خاص وزراے سلطنت اور اعلیٰ حکام مُلکی کے مکانات بھی اُسمیں ہوتے ہیں۔ یہی حالت بجنسہ لکھنؤ میں تھی ایک جانب دریاے گومتی کے (جسکا عرض لندن کی ایک متوسط درجے کی سڑک سے زیادہ نہوگا) سلسلۂ عمارات شاہی چلا گیا تھا اور دوسری جانب وسیع رمنہ تھا جسمیں شاہی توش خانہ تھا اور اسمیں اسقدر تعداد کثیر اور مختلف اقسام کے جانور تھے جسکا اندازہ کرنا غیر ممکن تھا۔ صدہا ہاتھی اور گینڈے تیندوے۔ چیتل۔ پاڑھے۔ ہرن۔ ایرانی بلیاں۔ چینی کتے کچھ کھُلے بندوں کچھ کٹہروں میں بند۔ اس رمنے کے سبزہ زار کی اس طرح ہوا کھا رہے تھے جیسے انگلستان کے کسی مرغزار میں گاے بھیڑوں کے گلّے۔ اگرچہ قصر شاہی جو فرح بخش کے نام سے موسوم ہے اُسکا بیرونی حصہ زیادہ باشان وشکوہ نہیں۔ لیکن اُسکی وسعت وطوالت کی دلربائی نے اُسکی صنعت تعمیر اور شوکت سے زیادہ مجھے محو حیرت کر دیا۔ کیونکہ مجھے زیادہ تر یہی خیال تھا کہ اُسمیں بہت کچھ کاریگری صرف کی گئی ہوگی اور بہت کچھ عظم وشان ہوگا۔ لکھنؤ کی گلیوں نے بھی مجھے نا اُمید نہیں کیا۔ محلات کے گرد کی گلیوں پر بشپ ہیبر صاحب نے ڈریسڈن[۵۲] کی پھبتی کہی ہی اور دوسرے سیاحوں نے لکھنؤ کو ماسکو[۵۳] سے مشابہ بتلایا ہی گو میں نے ان دونوں مقامات کو نہیں دیکھا ہی مگر میرے خیال میں یہ تمثیلات ٹھیک نہیں ہونگی۔ صرف ایک عظیم الشان شہر جسے میں نے دیکھا ہے البتہ میرے نزدیک لکھنؤ کے نشیبی حصہ سے تنگ وتار گلیوں۔ لدے پھندے اونٹوں اور گنجان بازاروں سے مشابہ ہیں۔ اور وہ شہر قاہرہ دار السلطنت مصر ہی۔ ڈریسڈن ماسکو۔ قاہرہ۔ جس سے چاہیے آپ لکھنؤ کو مشابہ قرار دیجیے۔ مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار چیزیں ان مقامات میں سے کہیں نظر نہ آئیں گی۔ اولاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی ان شہروں میں کہیں نہ دکھائی دینگے ماسکو کے باشندے صرف چھُری باندھتے ہیں۔ اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی کبھی دکھائی

---

[۵۱] دار السلطنت چین۔

[۵۲] دار السلطنت سیکسنی متعلقہ سلطنت جرمنی۔

[۵۳] دار السلطنت قدیم روس۔

دیتے ہیں برخلاف اسکے لکھنؤ کے باشندے بالعموم اونچی بنے نظر آئیں گے اُنکے پاس ڈھال۔ تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہوگی۔ حتی کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرہ کرتے ہیں وہ بھی تلوار تو ضرور باندھتے ہیں اور کوچہ گرد حضرات جب سیرگشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر تینچے کی جوڑی اور ڈھال دونوں لگائے ہونگے۔ بھینسے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھال جسمیں پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں اکثر بائیں جانب کاندھے پہ پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس تنتے بررتے نظر آتے ہیں اور اہل لکھنؤ کی پندار خودی و خود پسندی اور جوش نبرد آزمائی کو بخوبی عیاں کرتے ہیں۔ یہ امر کہ کیوں اہل لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ وضع رکھتے ہیں تعجب خیز نہیں ہو سکتا اسلیے کہ کمپنی کے فوجی سیغے میں اودھ ہی کے پرورش یافتہ بکثرت ہوتے ہیں اور احاطہ بنگالہ کی فوج تمام تر یہیں کے باشندوں سے مملو ہے باشندگان لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کرایا جاتا ہے۔ تیر اور برچھے یہاں کے لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں اور جسطرح انگریزی دائیاں بالعموم بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دیدیتی ہیں اُسیطرح یہاں چھوٹے چھوٹے تینچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دیجاتی ہیں۔ اس شہر کے گلی کوچے میری نظروں میں بالکل انوکھے معلوم ہوئے۔ گویا کہ عالم رویا میں میرا گزر دفعۃً کسی ایسے عجیب ملک میں ہوا ہے جہاں کے خاص و عام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جنکے بشرے سے جنگجوئی ٹپکتی ہے اور جسکا تذکرہ میں نے لڑکپن میں قصوں اور کہانیوں کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ ماسکو یا قاہرہ میں ہاتھی بطور جانوران باربرداری کام دیتے نظر نہیں آئینگے سچ یہ ہے کہ پتلی پتلی گلیوں میں ایسے بھاری بھرکم جانوروں کے چلنے سے زیادہ کوئی چیز بے اٹکل اور بے جوڑ اور مضحک نہیں معلوم ہوتی جس طرح پر قاہرہ میں اونٹ اسباب سے لدے ہوئے دونوں جانب شلیطے ڈالے تمام گلی کو روک دیتے ہیں اُسی طرح یہاں ہاتھی راہ بند کر دیتے ہیں۔ لکھنؤ میں ہاتھی اور اونٹ سادی طور سے عام ہیں شہر کے نشیبی اور کثیف حصے میں جہاں بازار واقع ہیں وہاں گھوڑے بہت شاذ و نادر دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ہاتھی اور اونٹ بہت نظر آتے ہیں۔ ایک مدت تک میرا یہ حال رہا کہ جب کبھی ان تنگ گلیوں میں ہاتھیوں اور اونٹوں کو اسطرح لدا پھندا اور راستہ روکے دیکھتا تھا تو بے اختیار میرا جی قہقہہ مارنے کو چاہتا تھا اگرچہ وہاں دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے میری اپنی حفاظت میں دھڑکا پیدا ہو جاتا تھا۔ یہاں ہندو مسلمان باستثناء اسکے کہ ایک ہی قسم کے ہتھیار باندھتے ہیں اور طور پر ایکدوسرے سے بہت مغائر ہیں۔ لکھنؤ کی آبادی تین لاکھ ہے جسمیں دو ثلث ہندو ہیں مگر اکثر نیچ قوم کے بقیہ باشندے مسلمان ہیں اور انھیں کا شمار طبقہ امرا و عمائد میں ہے

کیونکہ یہاں حکومت اُنھیں کے ہاتھوں میں ہے۔ چونکہ اکثر لوگ اُس ملک سے ناواقف ہونگے جسکا دارالحکومت لکھنؤ ہے۔ اسلیے چند جملوں میں اُنکو حقیقت ملک سے مطلع کردینا قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہ ایک قسم کی چٹنی ہے جو "شاہ اودھ کی چٹنی کہلاتی ہے" اور یہ کہ شاہ اودھ بہت گراں ڈیل ہے اور اُسکا انداز تبخترانہ ہے" یہ دو باتیں لندن کے بازاروں میں بہت زبان زد ہیں اور انھیں باتوں کو چارلس آوٹی (واقعہ نگار شاعر) نے خوب رنگا ہے۔ جب صدی گزشتہ کے خاتمہ پر لارڈ ولزلی صاحب گورنر جنرل ہو کر ہندوستان میں وارد ہوئے اُس زمانہ میں ملک اودھ وسعت میں انگلستان سے زیادہ تھا۔ اور ایک صوبہ سلطنت علیۂ مغلیہ کا تھا۔ اور اُسکا فرمانروا نواب وزیر کے لقب سے ملقب تھا۔ وارن ہیسٹنگز صاحب نے نواب وزیر اودھ کے خاندان کی دو بیگموں کو تباہ کر کے اور اُنکے دو رفیق خواجہ سراؤں سے جبراً خزانہ چھین کر نواب اودھ کو باشندگان انگلستان سے چند سال اُدھر متعارف کرا دیا تھا۔ کیونکہ برک صاحب نے اپنے معرکۃ الآرا تقریر میں وارن ہیسٹنگز صاحب کے اس طرز عمل پر خوب گرج برس کے جھاڑ کی تھی اور یورپ والے نواب اودھ کو ایک ستم رسیدہ شخص تصور کرنے لگے تھے حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ نواب اودھ کو اپنے سابق نواب کی بیوہ یعنی بہو بیگم صاحبہ وغیرہ کی تذلیل سے مسرت ہوئی تھی اور خود اُنکو کچھ گزند نہیں پہونچا تھا کیونکہ وہ

جب لارڈ ولزلی صاحب ہندوستان میں داخل ہوئے اُسوقت (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) مُلک اودھ وسعت میں انگلستان سے زیادہ تھا اور انگریزوں کا سب سے زیادہ وفادار دوست رہا تھا لارڈ موصوف نے اُس دوستی کے جلدو میں ملک اودھ کا نصف حصہ نکالکر احاطہ بنگال میں ملحق کر لیا کیونکہ اُنکے ذہن میں اس سے بہتر کوئی صلۂ مکافات نہ معلوم ہوا۔ کہ جس ملک کے بادشاہ نے اُن کے ساتھ وفا پرستی کا اظہار کیا اُسکی رعایا کو اپنی گورنمنٹ کے ماتحت کرلیں۔

مارکوئس آف ہیسٹنگز نے غازی الدین حیدر سے دو کرور روپیہ قرض لیا اور اُس قرضے کے عوض میں نواب موصوف کو ایک غیر آباد قطعۂ ملک جو ترائی کا ملک کہلاتا ہے اور ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے اور جسے کمپنی نے نیپال سے فتح کر کے پایا تھا دیدیا۔ اور اُسی کے ساتھ بادشاہی کا لقب بھی عطا ہو گیا یعنی بجائے ہزہائینس نواب اودھ کے وہ ہز مجسٹی شاہ اودھ سے مخاطب کیے جانے لگے۔ غازی الدین حیدر راضی برضا ہو گئے یا بظاہر بنگئے[۵]

---

[۵] میں نے یہ واقعات جو بیان کیے ہیں یہ بالکل تاریخی ہیں۔ ایک مضمون نگار جو پورے ملک اودھ کے انتزاع پر زور دے رہا ہے لکھتا ہے "بیشک وشبہہ وارن ہیسٹنگز۔ لارڈ ٹینماؤتھ۔ لارڈ ولزلی۔ لارڈ ہیسٹنگز اور لارڈ

یہ روغن قاز کمپنی نے سنہ ۱۸۱۹ء میں غازی الدین حیدر کے ملا تھا اور سنہ ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر بجائے اپنے باپ کے تخت نشین ہوئے۔ یہ ایک نوعمر آدمی ہیں کیونکہ جب میں نے اُن کو دیکھا تھا اُسوقت انکا سن تیس برس کا تھا۔ اس لئے مُتعذ حالت پر مُلک اودھ بشکل مثلث نیپال سے لیکر دریائے گنگ تک واقع ہی۔ اس ملک کا وسیع شمالی حصہ ملک نیپال سے ہم سرحد ہی۔ باقی جنوب کیجانب بوزاویہ بنا ہی وہ اُس مقام پر ختم ہوا ہی جہاں مقدس گنگا بہ رہی ہے۔ اور اُس مُلک کا نشیبی حصہ تدریجاً گوشۂ شمال و مغرب گوشۂ جنوب و مشرق تک واقع ہی صرف وہی قطعۂ ملک بلند ہی جسے مارکوئس آف ہیسٹنگز صاحب نے براہ عنایت بعد جنگ نیپال نواب کو عطا فرمایا تھا۔ لیکن اس ترائی کے ملک میں اگر آبادی ہی تو وحشی درندوں کی اور دولت ہے تو گھنے گھنیرے جنگل کی۔

باوجودیکہ گورنر جنرلوں نے یکے بعد دیگرے ملک اودھ کو شاداب قطع چھین کر اور روپیہ کی نوچ کھسوٹ کرکے بالکل کھوکھل کردیا ہی تاہم بقیہ ملک اودھ کسی حصہ سلطنت جرمنی سے بجز پروشیا و آسٹریا کے آبادی میں ہرگز کم نہیں ہی پھر وسعت کے لحاظ سے وہ ڈنمارک سے اور اگر ہالینڈ اور بلجیم ملائے جائیں یا سوئزرلینڈ سکسنی اور ورٹمبرگ ملائے جائیں تو اُنسے بڑا ہی اگر یورپ میں یہ ملک ہوتا تو مندرجہ صدر ممالک میں ہر ایک سے وہ فائق ہوتا اور نیپلس یا بویریا سے بلحاظ اہمیت بڑھا چڑھا نکلتا البتہ ایشیا میں یہ کسی شمار قطار میں نہیں ہی اگرچہ اُسکی بابت شور و شغب بہت بلند ہی۔ جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں مجھے ذاتی ضروریات کی وجہ سے لکھنؤ جانا پڑا تھا۔ میں وہاں ایک بخت آزما سیاح کیطرح نہیں گیا تھا بلکہ اتفاقاً میرا گزر وہاں ہوا تھا۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب آنریبل کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی) سیاحوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ میں نے محض اسی خیال سے کہ دیکھوں دیسی بادشاہوں کی کیا قطع ہوتی ہی (اور کسی خیال سے نہیں) ایک دوست کے ذریعے سے شاہ اودھ کی حضوری میں باریاب ہونیکی خواہش کی۔ جب سے دہلی کا عروج و اقبال مٹا ہی اور دہلی میں اگلے جاہ و جلال کا صرف ایک خاکہ رہگیا ہی اسوقت سے ہندوستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں ہی جو لکھنؤ سے تمول۔ اور شان و شکوہ کے لحاظ سے دعوائے ہمسری کرسکے۔ چونکہ میری تقریب ملاقات صاحب رزیڈنٹ نے نہیں کی اسوجہ سے بادشاہ مجھسے بہت اخلاق و مہربانی سے پیش آئے۔ رزیڈنٹ ایک انگریزی افسر منجانب گورنمنٹ ہند ملک اودھ میں برٹش اغراض کی نگرانی اور شاہ اودھ کو جادۂ اعتدال پر قائم رکھنے کیلیے متعین رہتا ہی۔ مجھے معلوم

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴ ۔ آکلنڈ اپنی پرائیوٹ لائف میں کبھی یہ برتاؤ پامال خزان اودہ سے نہ کرتے جو انھوں نے بحیثیت گورنر جنرل کیا۔ (کلکتہ ریویو۔ جلد ۳ صفحہ ۲۷۳)

ہوا تھا کہ بادشاہ کے خانگی ملازموں میں ایک جگہ خالی ہے اور اگر میں بادشاہ کی حضور میں باریاب ہوں اور نذر پیش کروں تو نذر قبول ہو جانے پر میں اُس جگہ پہ مقرر ہو سکتا ہوں۔

چونکہ کوئی باشندۂ یورپ بادشاہ کے سلسلۂ ملازمت میں بلا منظوری بلکہ بلا اجازت صاحب ریزیڈنٹ مقرر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسلیے میری دوسری کوشش یہ تھی کہ میں اُنکی منظوری حاصل کروں۔ میری تقریب ملاقات بڑے صاحب سے کی گئی۔ بڑے صاحب جو لندن میں ایک معمولی حیثیت کے آدمی سمجھے جاتے یہاں اُنکے اختیارات ایک بادشاہ اور اُسکی پچاس لاکھ رعایا پر ایسے نامحدود تھے جو یورپ میں کسی بادشاہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ غرضکہ بڑے صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ میرے اُنکے درمیان کچھ سلسلۂ خط و کتابت کا جاری ہوا۔ اور اس شرط سے انھوں نے مجھے اپنی منظوری دی کہ میں اودھ کے ملکی معاملات میں حیثیتاً یا صراحتاً مطلق دخل نہ دوں نہ کسی طرح کا دخل فصل کروں۔ اور نہ کسی ایسی سازش میں کسی فریق کا شریک یا طرف کش ہوں جو وزرائے سلطنت کے باہم بابت کسی تعلقدار کے یا دو زمینداروں کے باہمی مناقشات کے بابت ہو۔ پس اسطور پر مجھے بادشاہ کے سلسلہ ملازمت میں داخل ہونیکی اجازت ملگئی۔

جب اس ملازمت کی ابتدائی مراتب طے ہو گئے تب پھر مجھے بادشاہ کی حضوری میں بطور پنج کے باریاب ہونیکی نوبت آئی۔ مشرقی بادشاہوں کے سامنے کوئی شخص خالی ہاتھ نہیں جا سکتا۔ ایسی صورت میں نذر دکھانی لازمی ہے حتی کہ معمولی درباروں میں بھی نذر دکھانا پڑتی ہے۔ اگرچہ بعد اُسکے بادشاہ کیجانب سے دوسرے پیرایہ میں اُس سے بہت زیادہ خلعت و انعام ہوتا ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ حضوری میں باریاب ہوا تھا اُس وقت میں نے اُنکو دربار عام کے بڑے کمرے کے ایک سرے پر تخت نشیں دیکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ مسند پر پلتھی مارے (زانو توڑے) بیٹھے ہونگے۔ لیکن وہ ایک سنہری طلائی کرسی پر بہت بھاری ہندوستانی پوشاک پہنے اور ایک جواہر نگار تاج جسمیں ہما کے پر کا طرہ لگا تھا سر پر دیے ہوئے جلوہ افروز تھے۔ میری امید کے برخلاف اُنکا اور اُس مکان کی سجاوٹ کا انداز بالکل یوروپین تھا۔ اُسوقت تو میں نے اس تمام ساز و سامان کو صرف سرسری طور سے دیکھا تھا۔ بلکہ بادشاہ سلامت کے چہرے اور خط و خال کو دیکھ بھی نہ سکا تھا۔ لیکن اس دوسری مرتبہ جب میں باغ میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ بادشاہ معہ اپنے چند یوروپین ملازمان خانگی کے قصر شاہی کے ایک باغ میں گلگشت فرما رہے ہیں۔ میں ایک روش کے کنارے بادشاہ کی تشریف آوری کا منتظر کھڑا ہوا لیکہ ہاتھ پر ریشمی رومال رکھکے اُسپر پانچ اشرفیاں رکھ لی تھیں اور بائیں ہاتھ

سے داہنے ہاتھ کو (جسپر رومال اور اشرفیاں تھیں) سنبھالے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں میں بادشاہ کی آمد کا منتظر کھڑا ہو گیا۔ اور یہ میرا پہلا سبق ادب آداب دربار شاہی کے سیکھنے کا تھا۔ جب اپنے کھڑے ہونیکی اس ادا پر خیال کرتا تھا تو اپنی نگاہ میں آپ بیوقوف معلوم ہوتا تھا۔ میری ٹوپی علٰحدہ دوسری کرسی پر رکھی تھی اور میں ننگے سر تھا۔ مگر تمازت آفتاب سے گرمی جو بہت تھی تو میرا یہ حال تھا کہ جب تک بادشاہ سلامت تشریف لائیں لائیں میں سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا تھا۔ خدا خدا کر کے بادشاہ سلامت مع رفیق رفقا کے تشریف لائے اُسوقت وہ ایک انگریزی جنٹلمین کا ایسا ساؤ سیاہ ملبوس زیب تن کیے ہوئے تھے اور سر پر لندن کی بنی ہوئی ٹوپی مزیب تھی۔ اُنکا چہرہ بشاش تھا۔ جسکی رنگت سیپی کی ایسی تھی۔ اور اُسکے ساتھ ہی سر کے بالوں۔ ٹھیکوں۔ اور موچھونکی کالی کالی رنگت اُنکے رخسارونپر بہت کھل رہی تھی آنکھیں چھوٹی۔ چمکیلی۔ اور سیاہ تھیں۔ بدن چھریرا۔ اور قد میانہ تھا۔ جب وہ نزدیک پہونچے تو اپنے مصاحبوں سے انگریزی بولنے لگے۔ مجھے وہ بات چیت یاد نہیں میں اپنے حال احوال میں مبتلا تھا۔ باتوں پر کیا کان دھرتا۔

بادشاہ قریب پہونچ گئے۔ سکرائے۔ اپنے بائیں ہاتھ کو میرے ہاتھوں کے نیچے رکھکے داہنے ہاتھ کی اُنگلیوں سے میری نذر کی اشرفیونکو اُنھوں نے چھوا اور فرمایا۔

"تمنے میری ملازمت منظور کر لی نا؟"

میں نے عرض کیا "جی! خداوند"

اسپر بادشاہ نے فرمایا کہ "ہم میں اب خوب گاڑھی چھنے گی۔ کیونکہ میں انگریزوں کو بہت پسند کرتا ہوں" یہ ارشاد فرما کے بادشاہ نے اپنے مصاحبوں سے پھر گفتگوے سابقہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور آگے بڑھے تب میں بھی ملازمین کے زمرے میں ہو کر اُنکے ہمراہ ہو لیا۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ اپنی نذر کی اشرفیاں جیب میں ڈال لو ورنہ کوئی ہندوستانی ملازم لے لیگا میں نے فوراً اسکی تعمیل کی اور اپنی ٹوپی اُٹھا کر سب کے ہمراہ ایوان شاہی میں داخل ہوا۔ اس محل کے کمرے عام طور سے بہت وسیع اور اعلٰے درجے کے جھاڑ فانوس سے آراستہ تھے۔ بیش قیمت اور نفیس چوکھٹوں میں بہت سی عمدہ عمدہ تصویریں اور مرقعے آویزاں تھے۔ قصہ کوتاہ عجائب صنعت نوادر روزگار کا ایک ذخیرہ تھا۔ جسے دیکھکے بجاے محظوظ ہونیکے آدمی حیران و ششدر رہجاتا تھا۔ جگمگاتے جھاڑ۔ فانوس۔ صندل اور آبنوس وغیرہ نادر الوجود لکڑیوں اور ہاتھی دانت کی میزیں۔ الماریاں نفیس نفیس زرہ بکتر۔ خود۔ اور چار آئینہ کے جوڑ۔ اور جواہرات سے مغرق اسلحہ۔ جواہر جڑی ہوئی ڈھالیں

ہر طرف انھیں چیزوں کی بہتات تھی ۔ جنکے دیکھنے سے نظر خیرہ ہوتی تھی ۔ اس محل میں صرف کھانے کا کمرہ جسمیں بادشاہ اپنے مصاحبین خاص کے ساتھ خاصہ نوش فرماتے تھے بہت سادہ سادہ سجا تھا ۔ اور سجاوٹ کی سادگی میں انگریزی کھانا کھانے کے کمروں سے کچھ فرق نہ رکھتا تھا ۔

مہینہ بھر میں بادشاہ ایک مرتبہ عام دعوت صبح کے کھانے کی کرتے تھے جسمیں فوج کے انگریز افسر چھاؤنی سے (جو شہر سے پانچ میل فاصلے پر دریائے گومتی کے دوسرے کنارے پر واقع ہے) آکر شریک ہوتے تھے ۔ اور کبھی کبھی صاحب رزیڈنٹ اور اُنکے ہمراہی بھی مدعو ہوا کرتے تھے لیکن ایسے موقعوں پر اُنکو بڑی زحمت اُٹھانا پڑتی تھی چنانچہ اکثر ایسی دعوت کے اختتام پر میں نے بادشاہ کو یہ کہتے سُنا ہے "الحمدللہ ۔ یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا ۔ یہ لوگ دور دفان ہوئے ۔ اب لاؤ ۔ اطمینان سے ایک جام شراب پئیں ۔ ارے معاذ اللہ ۔ یہ سب کس قدر خرافات و لغویات ہیں" یہ کہکے بادشاہ یا تو انگڑائی لیتے تھے یا کھڑے ہوجاتے تھے ۔ اور اپنی مکلّل بجواہر ٹوپی اتار کر کمرے کے دوسرے سرے پر پھینک دیتے تھے ۔ پہلے پہل جس شب کو میں ایوان شاہی میں داخل ہوا تھا تو بادشاہ نے اُسی رات کو ایک نچ کی دعوت دی تھی جسمیں معمولاً پانچ یورپین ملازمان خانگی شریک ہوا کرتے تھے ۔ اُنمیں سے بادشاہ کا برائے نام معلّم بھی ہوتا تھا جو اُنھیں انگریزی پڑھاتا تھا ۔ بادشاہ نے بارہا اپنا خیال اس بات پر رجوع کیا کہ دن میں ایک گھنٹہ ضرور انگریزی پڑھنے میں صرف کرتے رہیں کیونکہ اُنکو تیزی کے ساتھ انگریزی بولنے کا بیحد شوق تھا ۔ لیکن مجبوراً اُنکو انگریزی فقروں کے درمیان درمیان اکثر اردو لفظیں ملاکر کام نکالنا پڑتا تھا ۔ میں نے کئی مرتبہ بادشاہ کو معلّم صاحب کے روبرو اور سامنے میز پر کتابیں رکھے ہوئے بیٹھے دیکھا ہے ۔ اُسوقت وہ فرماتے تھے ۔ کہ "ہاں ۔ ماسٹر صاحب اب ہمکو سبق ہی پڑھنا چاہیے" ۔

پہلے ماسٹر صاحب اسپکٹیٹر یا کسی ناول کی تھوڑی عبارت پڑھتے تھے اُسکے بعد بادشاہ اُسی عبارت کو دوہراتے تھے ۔ پھر ماسٹر صاحب پڑھنے لگتے ۔ اور بادشاہ صاحب فرماتے کہ "ارے معاذ اللہ کس قدر خشک و بے نمک مضمون ہے ۔ اور پھر جب اُنکی باری آتی تو انگریزی میں فرماتے کہ ماسٹر صاحب ۔ لاؤ جام شراب کا ایک دور ہوجائے" شراب پیکر بادشاہ سلامت باتوں میں مصروف ہوجاتے ۔ کتابیں پھینکدیجاتیں اور سبق ختم ہوجاتا ۔ اس پڑھائی میں کبھی دس منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے تھے ۔ لیکن اس تعلیم کی تنخواہ ماسٹر صاحب کو پندرہ سو پاؤنڈ (یعنی پندرہ ہزار روپیہ) سالانہ ملتی تھی ۔

اُس زمانے میں انگریزی ماسٹر ایک مصاحب شاہ تھا ۔ دوسرا مصاحب اُنکا لائبریرین (محافظ کتبخانہ

نہ میں انگریزی ماسٹر ایک مصاحب شاہ تھا۔ دوسرا مصاحب اُنکا لائبریرین (محافظ کتبخانہ) ۔ جرمن مصوّر اور موسیقی داں۔ چوتھا کپتان باڈی گارڈ۔ پانچواں اُنکا انگریزی خاصہ[1] تراش (حجّام) نجوں میں ایک راقم الحروف بھی تھا۔ لیکن انہیں سب سے زیادہ مُنہ لگا اور سرچڑھا مصاحب خاصہ تراش تھا۔ شاہ کے مزاج میں اُسکا رسوخ ہندوستانی وزیر اعظم یعنی نواب سے بھی بڑھکے تھا۔ وہ نظر کردہ خاص مصور کیا جاتا تھا۔ اسلیے سب لوگ اُسکی درباراری کیا کرتے تھے۔ اگر اُسکی سوانحعمری بےکم وکاست اور نیک نیتی سے لکھی جائے تو کتاب فطرت میں انسانی زندگی کا ایک عجیب باب اضافہ ہو۔ مجکو جو کچھ علم ہے اُسے ذیل میں لکھتا ہوں۔

یہ شخص کلکتہ میں ایک جہاز کا میٹ مقرر ہو کے وارد ہوا تھا۔ کلکتہ پہونچکر بعد ترک ملازمت جہاز اُسنے اپنا قدیمی پیشہ حجامی جسکی تعلیم اُسکو بچپن سے لندن میں دیگئی تھی شروع کیا۔ انہیں اُسکو بڑی کامیابی ہوئی اور بہت کچھ وہ نمود پیدا کرگیا۔ آخرکار یوروپین سوداگروں کے ساتھ اُسنے کشتیوں پر مال اسباب بھیجنے کی غرض سے سفر کرنا اختیار کرلیا اور تاجر بحری مشہور ہوگیا۔ لکھنؤ پہونچکر اُسنے صاحب رزیڈنٹ سے ملاقات کی (یہ وہ صاحب رزیڈنٹ نہ تھے جو میرے عہد میں تھے) صاحب رزیڈنٹ کو تمنا تھی کہ وہ اپنے بال درست کرائیں اور نوک پلک سے بجل گبرو جوان بنجائیں۔ حجام کو اُنکی اس فرمایش کی بجاآوری میں کب تامل ہوسکتا تھا۔ اُسنے اس کینڈے سے رزیڈنٹ صاحب کے بال بنائے سنوارے کہ گویا کایا پلٹ کردی بڑے صاحب نے خوشی میں آکر اُسکی تقریب بادشاہ سے کردی۔ یہ رزیڈنٹ صاحب اب ولایت میں ہیں اور اپنے نام کے ساتھ ایم۔ پی (یعنی ممبر پارلیمنٹ) تحریر کرتے ہیں۔ بادشاہ کے سر کے بال بھی سیدھے سپاٹ تھے اور گھونگھر کیا معنی کبھی ذراسی لہر بھی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ حجام صاحب نے اُسمیں حیرت انگیز پیچ وخم پیدا کردیے جس سے بادشاہ بہت محظوظ ہوے۔ اور اعزاز وانعام کی بوچھار شروع ہوگئی۔ سرفراز خاں کا خطاب بادشاہ نے مرحمت فرمایا۔ باشندگان اودھ کے سر اُسکے آگے جھکنے لگے۔ اب وہ شخص جو ایک زمانے میں جہاز کا میٹ تھا بڑا آدمی ہوگیا اور چاروں طرف سے دولت کا مینہ اُسپر برسنے لگا۔ دیسی[2] سلطنتوں میں مقربان شاہی کو امیر بنجاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ علاوہ رشوت ستانی کے اس خاصہ تراش کو

---

[1] انگریزی میں مصنف نے "باربر" کا لفظ لکھا ہے۔ جسکے معنی ہیں حجام۔ مگر اُسکے خدمات کے لحاظ سے ہمنے خاصہ تراش کا لقب دیا ہے۔

[2] جی نہیں! سب جگہ یہی حال ہے۔

بہت سے اور بھی موقعے فائدہ اُٹھانیکے ہاتھ آگئے تھے۔ مثلاً بادشاہ کی میز پر جسقدر شراب وغیرہ وہ اُسی کی معرفت خرید ہوتی تھی۔ اس ذریعہ سے اُسنے ہزارہا روپیہ پیدا کیا۔ سچ کہتے ہیں

پی چاہے سہاگن ہے وہی

نصیرالدین حیدر نے اس خاصہ تراش کو بیحد و بے انداز اعزاز و اکرام سے گرانبار کیا اُسپر بہت اعتبار کرنے لگے تھے۔ نوبت باینجا رسید کہ شاہی میز پر وہ روزمرہ کھانا کھانے لگا۔ بادشاہ کی میز پر بادشاہ کے پہلو میں استحقاقاً بیٹھنے لگا۔ حتیٰ کہ بادشاہ بجز اُسکے کسی کے ہاتھ کی کھولی ہوئی بوتل سے شراب نوش نہیں کرتے تھے۔ بادشاہ پر اپنے اہل خاندان کیجانب سے زہر دینے کا ایسا خوف طاری تھا کہ ہر شراب کی بوتل پر پہلے خاصہ تراش کے مکان میں مُہر لگا دیجاتی تھی تب صرف کیواسطے شاہی میز پر آتی تھی۔ قبل بوتل کھولنے کے وہ ہمیشہ مُہر اور دیگر علامات کا امتحان بخوبی کر لیتا تھا۔ پھر تھوڑی آپ چکھ لیتا تھا۔ اُسکے بعد گلاس بھر کے بادشاہ کو دیتا تھا۔ یہی بندھا ہُوا انتظام شاہی میز پر اُسوقت بھی جاری تھا جبکہ پہلی مرتبہ مجھے اعزاز شرکت خاصہ نوشی حاصل ہوا تھا۔

اس حجام پر شاہی الطاف و عنایات اور اظہار اعتماد کی روائتیں۔ کل ہندوستان اور بالخصوص صوبہ بنگال میں زبانزد عام ہو گئی تھیں۔ چنانچہ اس کمینہ مرتبت ملازم کی نسبت رسالہ کلکتہ ریویو میں برابر مضحکہ آمیز جملے۔ ظریفانہ مضامین اور بہت سے ہجویہ اشعار غرضکہ ہر قسم کے حملے ہوا کرتے تھے لیکن اُسکو اپنے روپیہ کمانے کی فکر کے آگے اس بات کی مطلق پروا نہ تھی کہ لوگ اُسے کس طرح یاد کرتے ہیں۔ وہ اُسی میں خوش تھا کہ بلا سے مذاق اور ٹھٹھول کی بازی اور لوگ جیت رہے ہیں۔ وہ تو دولت فراواں جمع کر رہا ہے۔ اُسپر سب سے زیادہ مسلسل حملہ کرنیوالا "آگرہ اخبار" تھا (یہ اخبار بعد کو بند ہو گیا) میرے لکھنؤ سے جدا ہونیکے بعد اس خاصہ تراش نے ایک یوروپین منشی کو کلکتہ کے کسی اخبار میں آگرہ اخبار کے تردیدی مضامین شایع کرنیکے لیے سو روپیہ ماہوار پر نوکر رکھ لیا تھا۔ اگر اس خاصہ تراش کے پاس لندن کے درزیوں کی طرح خود اپنے نج کا شاعر نہیں تھا تو لندن ٹائمس کیطرح اُسکی ملازمت میں "ہمارا نامہ نگار" ضرور تھا جب میں شاہی کھانے کی میز پر پہلی مرتبہ پیش کیا گیا اُسوقت میری سب سے بڑی دلی تمنا بادشاہ اور اُنکے مصاحب خاصہ تراش کے دیکھنے کی تھی۔

میں نے دیگر اُمور کے قلمبند کرنے میں بہت وقت صرف کیا اب باب آیندہ میں شاہی کھانے کی کیفیت تحریر کرونگا۔

باب دوم

ایک بادشاہ کے مشاغل تفریح

ہم لوگ پشت کے ایک کمرے میں بادشاہ سلامت کے منتظر بیٹھے تھے کہ قبل نو بجے کے جو معمولی وقت خاصہ کا ہے بادشاہ سلامت اپنے مصاحب مقرب یعنی خاصہ تراش کے شانے پر سر رکھے ہوئے نمودار ہوئے۔ ان دونوں میں بادشاہ کشیدہ قامت تھے اور اُنکا رفیق پست قد لیکن بہت ہی توانا و تندرست بدن خوب گٹھا ہوا تھا۔ اور وہ اُس زمرے والوں میں معلوم ہوتا تھا جو قد کی کمی کو عرضاً پورا کر لیا کرتے ہیں۔ بادشاہ سلامت سادہ سیاہ انگریزی لباس اُسی قسم کا پہنے تھے جیسا کہ میں نے اُنکو پہلی بار باغ میں پہنے دیکھا تھا۔ فرق صرف اسقدر تھا کہ جیسے اُس مرتبہ فراک کوٹ وہ پہنے تھے۔ اب کی بار بجائے اُسکے ڈریس کوٹ زیب تن تھا۔ وہ معمولی سیاہ گلوبند باندھے اور سیاہ وارنش کا بوٹ پہنے تھے۔ اُنکے چہرے سے سطوت شاہی نمایاں تھی۔ برعکس اسکے اُنکے مصاحب خاص کے چہرے پر کمینہ پن کی قدرتی پھٹکار تھی۔ اگرچہ دونوں کی پوشاک یکساں تھی۔ لیکن اس ظاہری یکسانیت پر بھی خصائل طبعی کا تفاوت عالم آشکارا تھا

کھانے کے کمرے میں جب ہم لوگ جا کے بیٹھے تو عجب سماں نظر آیا۔ مغربی ممالک کا سامان عیش و جیش دیسی نمایش کے ساتھ ملا ہوا دکھائی دیا۔ بادشاہ ایک زرنگار کرسی پر جو زمین سے کچھ اونچے پر بچھی تھی میز کے بیچ میں متمکن تھے۔ اور ہم لوگ اُنکے دونوں پہلوؤں پر بٹھائے گئے تھے۔ میز کا دوسرا رُخ بالکل خالی تھا کچھ تو اس غرض سے کہ ملازمین کو رکابیاں لینے رکھنے اُٹھانے میں دقت نہ ہو اور زیادہ تر اس غرض سے کہ جو کچھ کھیل تماشے اُس شب کیواسطے مخصوص طیار کیے گئے تھے اُنھیں بادشاہ سلامت بآسانی ملاحظہ فرما سکیں۔ ہم لوگ آ کے بیٹھے ہی تھے کہ قریب نصف درجن کے اعلیٰ درجے کی حسینہ و جمیلہ خواصیں ملبوس زرزیب تن کیے ہوے اُس کمرے کے ایک گوشے سے جہاں گاچ کا ایک پردہ پڑا ہوا تھا برآمد ہوئیں۔ چونکہ میں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ ہرگز ہرگز اچنبھے یا حیرت کی وجہ سے بھی اُن کی طرف نگاہ نہ جماؤں کیونکہ یہ خواصیں مثل مستورات حرم شاہی لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ خیال کیجاتی ہیں۔ لہذا میں نظر بچا بچا کے کن انکھیوں سے اُنکا نظارہ کرتا۔ اور اپنے انداز سے یہی ثابت کرتا رہا کہ مجھے اُدھر مطلق التفات نہیں۔

یہ پریجمال عورتیں بہت ہی صورت دار تھیں۔ ہلکا کھلا ہوا گلابی رنگ تھا۔ بہت سُرخی نہ تھی۔ کالے کالے گھونگھروالے بالوں کی لٹیں جنکی چوٹی گندھی ہوئی پشت پر پڑی تھی اور جنمیں زرتار موباف کی بندش تھی۔ اور مرصع سیس پھول چمک رہے تھے۔ گورے گورے چہروں پر یہ سجاوٹ قہر ڈھا رہی تھی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان رخساروں سے خون چھلک رہا ہے اور شوخی و شنگی ٹپک رہی ہے۔ باریک آب رواں کا دوپٹہ بیساختگی کے ساتھ سرونپر پڑا ہوا اور شانونکے نیچے لٹکتا تھا۔ دوپٹوں پر زری کا کام بنا ہوا تھا۔ اور کپڑے کی باریکی کے سبب شانوں اور بازوؤنکی سجاوٹ جھلک دکھلا رہی تھی۔ ان عورتوں کے ہاتھوں میں مور کے پرونکی مورچھل تھی۔ اور جب وہ بادشاہ کی پشت پر مگس رانی کرتی تھیں تو اُنکے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کی ادا غضب تھی۔ پھر سینوں کا اُبھار اور ہر جنبش پر کمر کا جھونک اور بھی قیامت کا سامان تھا۔ انکا جسم زیریں پاجاموں سے پوشیدہ تھا۔ یہ پاجامے۔ سُرخ۔ زرد۔ چمکدار رومی اطلس کے بنے ہوئے تھے۔ اور اُنکی قطع یہ تھی کہ کمر کولوں میں پھنسے پھنسے اور آگے بڑھکے بتدریج ڈھیلے ہوگئے تھے۔ اور ٹخنوں کے پاس سے (جہاں جاکے ایک انبار ہوگیا تھا) اُٹھاکے کمر میں کھونس لیے گئے تھے۔ اور اُنپر ایک زردوزی کام کی زرق برق پیٹی کسی ہوئی تھی۔ پیٹی ہی کے برابر کرتی کی گوٹ بھی باریک دوپٹے سے اپنا جھمکڑا دکھا رہی تھی[1]۔

بادشاہ کی پشت پر یہ عورتیں چپ چاپ۔ مؤدب کھڑی ہوگئیں۔ نہ بادشاہ نے اُنسے کچھ کہا۔ نہ اور لوگوں میں بظاہر کوئی انکی طرف مخاطب ہوا۔ یہی معمولی دستور روزمرہ کے کھانیکے وقت تھا۔ ان عورتوں کے ہاتھ بازو تک برہنہ تھے۔ اور اُنکا لطف اُسوقت نظر آتا تھا جبکہ دو دو باری باری سے بادشاہ کے پس پشت مورچھل کرنے میں اپنی نازک کلائیوں کو آہستہ آہستہ جنبش دیتی تھیں اگر ہندوستانی عورتوں کو دنیا میں اپنے ہمجنسوں پر جسمانی حسن میں کچھ ترجیح حاصل ہے تو اُنکے اعضا کے تناسب اور سڈول پنے کی وجہ سے۔ اور وینس[2] کی تصویر تراشتے وقت اگر کسی نقاش نے کوئی نمونہ پیش نظر رکھا ہوگا تو غالباً انھیں کے شانے اور بازوؤں کا۔ یہ عورتیں نہایت خوشی اور سلیقہ کے ساتھ مگس رانی یا حقہ برداری شاہ کی خدمات اپنی باری باری باضابطہ انجام دیتی تھیں۔ حتیٰ کہ بادشاہ سلامت کھانے کی میز پر سے اُٹھتے اور خود چلتے یا یہی عورتیں سہارا دیکر اُنکو محل میں لیجاتیں۔

---

[1] واہ حضرت! اتنے میں کلمہ پڑھنے لگے۔ ابھی آپنے دیکھا کیا ہے؟

[2] یونان کے علم الاصنام (مائتھالوجی) میں حسن کی دیوی یہی تھی۔ جسکی تصویر قائم کرنے میں مصوروں نے بڑے کمال دکھائے ہیں۔

کھانے کا سامان ہر طرح پر انگریزی طرز کا تھا۔ اور اس تمام دعوت میں بہت ہی کم فرق کلکتہ کے کسی بڑے گھر کی دعوت سے تھا۔ ہندوستانی خدمتگار ادب۔ قاعدے سے بہت ہی خاموش آتے جاتے اور کام کرتے تھے۔ اور ہملوگ بادشاہ سے بے تکلف بات چیت کر رہے تھے۔ معمولی طریقے سے سوپ (یخنی) مچھلی بھنی ہوئی رانیں۔ دال۔ چاول۔ میوہ جات اور تنقلات باری باری ہم پر چنے جاتے تھے۔ کھانا نہایت نفیس و لذیذ تھا۔ کیونکہ ایک اعلیٰ درجے کا فرانسیسی رکابدار مطبخ شاہی کا مہتمم تھا۔ یہ شخص سابق میں بنگال کلب (کلکتہ) کا منتظم رہا تھا۔ برخلاف اسکے انگریزی حجام کی مصاحبت کا ڈنکا پٹا ہوا تھا۔ یہ سب نیرنگیاں تقدیر اور اقبال کی ہیں۔

باوجود مسلمان ہونیکے نصیرالدین حیدر کو ذرا بھی شراب سے پرہیز نہ تھا۔ بلکہ اکثر امراے اودھ بھی محتاط نہ تھے۔ اکثر اوقات میں نے خود بادشاہ کو یہ فرماتے سنا کہ عام لوگوں کے خیال کے موافق قرآن شریف میں شراب نوشی کی ممانعت نہیں ہی۔ البتہ قرآن شریف میں اسکا بے اعتدالی سے پینا منع آیا ہے۔" میری رائے میں اس معاملے میں بادشاہ کا عمل اسپر تھا کہ جب عام لوگوں کو مقدار مناسب تک پینے کی اجازت ہی تو بادشاہ کو بے اعتدالی بھی روا ہے۔ چنانچہ کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ بادشاہ میز پر سے بدست بلکہ سیہ مست نہ اُٹھے ہوں۔ ہم لوگوں کے سامنے جو شراب آتی تھی وہ معمولاً اعلیٰ درجے کی کلارٹ۔ مڈیرا۔ شامپین ہوتی تھی اور جب گرمی تیز پڑنے لگتی تھی تو برف میں لگا کے آتی تھی۔ کہ جس سے اُسکا سُرور اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ کھانیکے بعد مے ناب کا دور پیاپے چلتا تھا اور بادشاہ مع مصاحبین خوب بے تکلف اور بیہوش ہو جاتے تھے۔ اور اکثر ہملوگوں سے مخاطب ہو کے فرماتے تھے کہ "مَیں ہمیشہ یوروپین لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ اسیوجہ سے ہندوستانی لوگ مجھسے ناراض رہتے ہیں۔ اگر میرے اہل خاندان کا بس چلے تو مجھے زہر دینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ لیکن میرا رعب سب پر غالب ہے۔ واللہ۔ وہ لوگ کسقدر مجھسے تھرتھراتے ہیں۔ خاصہ تراش کہتا۔ کہ "بادشاہ سلامت نے اپنا رعب اُنکے دلوں پر بٹھا دیا ہی" بادشاہ فرماتے کہ "ہاں واقع میں نے اُنھیں خوف زدہ کر رکھا ہی" بعد اُسکے وہ بائیں جانب ہم لوگوں سے مخاطب ہو کے دریافت فرماتے۔ کیوں جی۔ تم لوگوں نے لکھنؤ والوں کو آپس میں لڑتے بھڑتے کبھی کبھی دیکھا ہی؟ ہملوگ جواب دیتے۔ کہ حضور۔ بارہا۔ تب وہ فرماتے کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے بھی دیکھا ہی۔ نہ۔ ہملوگ عرض کرتے کہ اکثر۔ تب بادشاہ بول اُٹھتے کہ دیکھو یہ لوگ آپس میں

لڑتے بھڑتے سر پھٹول کرتے ہیں۔ مگر تم لوگوں کو کبھی چھوتے تک نہیں۔ یہ لوگ کہتے کہ حضور کبھی نہیں۔ تب وہ فرماتے ہاں۔ کبھی نہ چھوتے ہوں گے یہ بدمعاش خوب جانتے ہیں کہ اگر وہ تم لوگوں کو بری نگاہ سے دیکھیں گے تو میں اُن کو نیست و نابود کر دونگا۔

بعد اس گفتگو کے عمدہ عمدہ اقسام کے تر و تازہ میوہ جات جو منطقہ حارہ ہی کی فیاضی سے مہیا ہو سکتے ہیں آنے لگتے اُس کے بعد شب کے کھیل تماشے شروع ہو جاتے۔ یہ تماشے مختلف قسم کے ہوتے تھے۔ کبھی بازیگر اپنے کرتب دکھلاتے۔ یہ لوگ اپنے بدن کو ہر پہلو سے اسطرح توڑتے مروڑتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا اُنکے بدن میں کہیں ہڈی کا وجود نہیں۔ اور میمونہ حرکات میں بندروں پر بھی سبقت لیجاتے تھے۔ اور اپنے جسموں کو سخت سخت گراہوں سے بہت کچھ جکڑ بند کرتے اور بآسانی اُن بندشوں سے اس طور پر صاف نکل جاتے تھے کہ دیکھنے والے حیران رہجاتے تھے اور اگر کوئی شخص اُنکے تماشے پر قہقہہ لگاتا تھا تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ کبھی کبھی دربار کے مسخرے آپس میں لطیفہ بازی کرتے اور جگت لڑتے تھے۔ لیکن اُن کی نقالی اور مسخرہ پن میں بدتہذیبی اور بچپن زیادہ ہوتا تھا۔ کبھی سپیرے اور جادوگر اپنے کرتب اور سانپ بچھوؤں پر اپنے تصرف کے تماشے دکھلاتے تھے۔ کبھی مرغ بازی۔ بٹیر بازی۔ تیتر بازی ہوتی تھی۔ لیکن یہ بازیاں بادشاہ کے سامنے والی میز کی ہوتی تھیں۔ اور کبھی کٹھ پتلی کا تماشا ہوتا تھا۔ جسمیں پتلیاں آدمیوں کی طرح تار کی جنبش پر اُسی طرح خوب ناچتی۔ تھرکتی تھیں۔ جیسے زمانہ حال کے تماشہ گاہوں میں انسان ناچتے تھرکتے ہیں۔

اکثر انھیں تماشوں کے ساتھ کمرے کے ایک گوشہ میں عورتوں کا ناچ ہوتا۔ اور اُنکی سنگت میں ہر طرحکا ساز چھڑا رہتا تھا۔

پہلے دن جب میں شاہی میز پر کھانے کے واسطے حاضر ہوا تھا تو کھانیکے بعد کٹ پتلیوں کا تماشا اور معمولی ناچ گانا ہوا تھا۔ بادشاہ ان پتلیوں کے ناچ پر خوب قہقہے مار رہے اور محظوظ ہو رہے تھے۔ خاصہ تراش جب دیکھتا کہ اسوقت بادشاہ سلامت خوش ہو رہے ہیں تو وہ بھی دکھلانے کے واسطے خوب تعریفیں کرتا۔ رنڈیاں اپنی نازک اُنگلیوں۔ اور چشم و ابرو کے اشاروں سے خوب بھاؤ بتاتیں۔ سر پر کبھی ایک ہاتھ اور کبھی دوسرا ہاتھ رکھکر کبھی خوش خرامی سے آگے بڑھتیں اور کبھی اُس خرام ناز سے اُلٹے پاؤں پلٹ جاتیں۔ ان رنڈیوں کی صورتیں ویسی دلکش و دلفریب نہ تھیں جیسی اُن خواصوں کی جو بادشاہ کے پس پشت کھڑی تھیں۔ لیکن انکا ڈیل ڈول بہت موزوں تھا۔ چھب تختی غضب تھی۔ اور شوخی و شنگی چستی و چالاکی بھی کم نہ تھی۔ اُنکے سارے

کمال پر یہی کیا جاسکتا ہے کہ وہ انسان کے جذبات عیش پسندی کو پُرجوش کرنیوالا تھا۔ اِن رنڈیوں کے سنگتی طبلہ اور سارنگی پر اپنے جوہر دکھاتی تھے۔ اور اُنکے ساتھ ساتھ کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے ہٹتے لیکن ہر حالت میں برابر آواز سے ساز ملائے رہتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ساز اصل ہے اور آواز ساز کا ساتھ دیتی ہے۔

ان رنڈیوں کے ناچ گانے۔ اور بھاؤ تاؤ میں بجز میرے اس جلسہ میں کسی اور کو زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ بادشاہ کو کٹھ پتلیوں کے تماشے میں زیادہ مزا ملتا تھا۔ اسلیئے بنفس نفیس وہ خود اور اُنکے رفیق رقاص رنڈیوں کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ ایکبار بادشاہ نے خاصہ تراش کے کان میں کچھ حکم دیا جسے سُنتے ہی وہ اُٹھکے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا اور کوئی چیز ہاتھ میں چھپا کے لایا اور بادشاہ کو دیدی۔ بادشاہ نے کرسی پیچھے کھسکائی۔ اُٹھے اور میز کے گرد گھوم کر آگے پہونچے۔ قریب سے تماشہ دیکھنے لگے۔ تماشے والے سمجھے کہ اب ستارہ چمکا اور انعام و اکرام کا وقت آپہنچا خوب جی لگا کے کرتب دکھانے لگے۔ بادشاہ نے ذرا تامل کرکے اپنا ہاتھ بڑھایا اور آہستہ سے پیچھے ہٹا لیا کہ دفعتہً ایک کٹھ پتلی بے حس و حرکت زمین پر دھم سے آگری۔ یہ ظاہر ہے کہ بادشاہ کے ہاتھ میں قینچی تھی جس سے اُنھوں نے تار کاٹ دیا تھا۔ اور باوجودیکہ ہم لوگوں کی طرح تماشہ گر بادشاہ کی اس حرکت سے واقف تھے تاہم ہمہ تن محو حیرت بنکر وہ اس واقعے کے وقت مُنہ کھول کر رہ گئے۔ ہندوستانیوں کو حیرت زدہ بننے اور بنا دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بادشاہ ہم لوگوں کی جانب بڑے مزے سے اس طرح دیکھنے لگے گویا داد طلب کر رہے ہیں کہ "کیوں کیسی خوبصورتی اور صفائی سے یہ چابکدستی دکھائی ہے" اُسپر خاصہ تراش اور دیگر مصاحبین قہقہہ لگا کر خوب ہنسے۔ بادشاہ نے اتنی ہی شعبدہ بازی پر اکتفا نہ کی بار بار اپنا ہاتھ بڑھاتے اور ہٹا لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ سب پتلیاں تار سے کٹ کر زمین پر بیجان ہو کر آرہیں اور ہر پتلی کے گرنے پر قہقہہ کا شور بلند ہوتا۔ اور تماشہ کا منیجر بار بار عالم سکوت میں حیرت کی تصویر بنجاتا جب سب پتلیاں گر چکیں تو بادشاہ نے اپنے ہاتھ میں شمع لے کر تماشہ گاہ میں آگ لگا دی۔ اور اُسکے شعلے بدشواری فرو ہوئے۔

بعد ازاں اُس رات کو دیر تک ناچنے والوں کی نسبت بڑی آزادی سے بلا لحاظ تہذیب و متانت راسے زنی ہوتی رہی۔ اور شراب بکثرت لُنڈھائی۔ اور برابر دور جام چلتا رہا۔ خود بادشاہ اسقدر سرشار ہوئے کہ جسے عقل سلیم گوارا نہیں کرسکتی تھی۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اس ما بین میں ہم نے اپنی نظر بالکل اُسطرف نہ ڈالی ہو جو ہمارے گرد تھے

میں گلاچ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ باوجود اسکے کہ مجھ سے سختی کے ساتھ ممانعت کر دیگئی تھی۔ کہ اُسطرف ٹکٹکی لگانا آداب دربار کے خلاف ہے۔ کیونکہ حرم شاہی کی بیگمات کو اجازت دیدیگئی تھی کہ وہ پردے کے اندر سے گانیکا تماشہ دیکھیں۔ مجھے اکثر موقع اُسطرف نظارہ کرنیکا بتحفظ آداب دربار کے حاصل ہوتا رہا۔ یہ پردہ اتنا سنگین تھا کہ ہم اُدھر والوں کی صورت نہ پہچان سکتے تھے مگر صرف اسقدر خفیف عکس دیکھ سکتے تھے کہ کچھ لوگ پردے کے اندر چل پھر رہے ہیں۔ انمیں سے ایک عورت زیادہ تشخص کے ساتھ نشستیں معلوم ہوتی تھی۔ یہی بیگم غالباً اُس زمانے میں شاہ کی منظور نظر تھیں اور جب روشنی کا عکس پڑتا تھا تو اُنکے ہاتھ گلے کے زیور کی چمک معلوم ہوتی تھی۔ جسوقت کٹھ پتلیاں کاٹھ کے گرادیگئی تھیں۔ اُسوقت میں نے پردے کے اندر سے دھیمی دھیمی پیاری پیاری زنانہ ہنسی کی آواز سُنی تھی۔ گو ہم لوگ دور ہونے کی وجہ سے پردے کے اندر کی کوئی چیز صاف صاف دیکھ نہیں سکتے تھے۔ مگر پردہ نشین لوگ بخوبی باہر کی چیزیں دیکھ سکتے ہوں گے۔

عیش و نشاط کی لے بڑھی۔ ناچ گانا ہوتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ بادشاہ سلامت شراب سے سرشار ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ وہ بالکل ہی سیہ مست ہو گئے۔ آخرکار خواصوں اور دو قوی الجثہ خواجہ سراؤں نے سہارا دے کر بادشاہ کو پردے کے اندر پہونچایا۔ اور وہ محلسرا میں داخل ہو گئے یہ امر تعجب انگیز تھا کہ بادشاہ سلامت بھی اُسی طرح نشہ میں چور ہو گئے جیسے ایک معمولی رند خراباتی ہو جایا کرتا ہے۔

دوسرے دن میں نے وہ حصہ ایوان شاہی کا دیکھا جو اب تک میری نظر سے پنہاں تھا اس اندرونی حصے میں بھی وہی آراستگی تھی جو ایوان کے دیگر حصص میں تھی۔ یعنی بہت سے مرصع اور زرنگار آئینے اور بیش بہا نفیس شیشہ آلات سے مکان سجا ہوا تھا۔ جنمیں ظاہری آب و تاب بہت تھی لیکن حُسن و خوشنمائی کم تھی۔ مجھے اس قطعے کے ایک حصے کو دیکھکے بہت ہی حیرت ہوئی۔ یہ ایک مصنوعی جھیل تھی جو تمام باغ کو چھائے ہوئے تھی۔ اُسکے بیچوں بیچ میں ایک بہت ہی خوبصورت بارہ دری بنی تھی جو کسی کنارے سے ملحق نہ تھی۔ اس بارہ دری میں باہر کیجانب نہایت نفیس رنگ آمیزی اور گلکاری کی ہوئی تھی۔ اور اُسکی وضع بڑی بانکی تھی۔ اُسپر چھوٹی چھوٹی نکیلی غُرفیاں اور خوبصورت قبے اور مینارے بنے ہوئے تھے۔ اس جھیل کا پانی ایسا صاف شفاف تھا کہ تہ تک کی سب چیزیں بلا تکلف دکھائی دیتی تھیں۔ اور اُسکے اندر بڑی بڑی سُنہری۔ روپہلی مچھلیاں تیرتی تھیں۔ یہ مچھلیاں ایسی نہ تھیں۔ جیسی اکثر انگلستان میں شیشوں کی الماریوں یا چھوٹے چھوٹے

حوضوں کے اندر بند پانی میں تیرتی نظر آتی ہیں۔ بلکہ برخلاف اسکے ایک فٹ یا ڈیڑھ فٹ کی لانبی تھیں۔ اس بارہ دری تک پہونچنے کی صورت یہی تھی کہ بجرے پر سوار ہو۔ یہ بجرا ایک کنارے سے لگا رہتا تھا اور اُسکا رُخ محل کی اُس جانب تھا جدھر سے ہم نکلے تھے۔ میرے رفیق طریق (جو مثل میرے مصاحب شاہی تھے۔ اور اُنکی وقعت بادشاہ کی نظر میں مجھسے زیادہ تھی) کشتی میں بیٹھے اور مجھے بھی اُنھوں نے اشارے سے بلا لیا۔ ملاحوں نے بجرا کھولا اور ہم دونوں اس پرستان کی عمارت میں داخل ہوگئے سچ ہے تو لکھنؤ میں یہی عمارت سب سے زیادہ خوشنما معلوم ہوئی۔ اس بارہ دری میں دو کمرے تو متوسط عرض و طول کے تھے اور دونوں بیحد آراستہ تھے۔ اُسمیں بڑے بڑے ذنگل اور کوچیں دیواروں سے لگی ہوئی رکھی تھیں۔ بڑے کمروں میں سے ایک میں ایک میز پر پورا نمونہ محلات شاہی کا بنا ہوا رکھا تھا جسمیں پورے محل کے ہر ہر جزو کا نہایت باریک بینی اور دیدہ ریزی کے ساتھ چربہ اُتارا گیا تھا اور رنگ ایسے ٹھیک دیے گئے تھے کہ گویا ہوبہو تصویر کھینچ دی تھی۔ یہ بات تو ہندوستانی دستکاروں کا حصہ ہے۔ اسی نقشہ میں اس بارہ دری کی نقل جو ایک اخروٹ سے بڑی نہ تھی اس خوبی سے اُتاری تھی کہ اُسکی جزئی سجاوٹ تفصیل وار معہ کمروں کے دکھلائی گئی تھی۔ کوئی چیز چھوڑی نہ تھی۔ بارہ دری میں کھڑے ہو کر صاف شفاف پانی کا نظارہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا پرستان میں گزر ہو گیا ہے۔ جھیل میں مچھلیوں کا سیماب وشی سے ادھر ادھر تیرنا۔ ڈوبنا۔ اور اُبھرنا بجرے کی سجاوٹ۔ سواحل پر رنگ برنگی پھولوں کی گوٹ۔ اور اُنکے ارد گرد لانبی لانبی گھاس اور گھنی گھنی جھاڑیاں جھنکاریاں۔ جنمیں پھول چھپے ہوئے تھے اور جنکی وجہ سے گرد و پیش کی عمارتیں نظر سے پوشیدہ ہو گئی تھیں۔ یہ سارا سماں مجھے اسقدر دلفریب و دلکش معلوم ہوا کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو سامنے ایوان شاہی کو چھوڑ کر میں اسی بارہ دری میں بود و باش اختیار کرتا۔ بادشاہ سلامت اب یہاں کبھی کبھار آ جاتے ہیں۔ اور اسوجہ سے بے توجہی کے علامات رو بکار ہونے لگے ہیں۔ خادموں کا بیان تو یہ تھا ایک وقت میں بادشاہ کو اس بارہ دری کی جانب ایسی توجہ تھی کہ بیگیات کے جھرمٹ میں اکثر بجرے پر سوار ہوا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں بجرے کو خواجہ سرا لوگ کھیتے تھے۔ مگر اب چند سال سے گویا وہ اسکو بھول گئے ہیں اور اسی وجہ سے وہ بے مرمت معلوم ہو رہا ہے۔

چند روز بعد کھانیکی میز پر دفعۃً رنگین مچھلیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اور لوگوں نے کہا کہ معلوم نہیں مزے میں یہ کیسی ہوتی ہیں" اور خدا جانے یہ کھائی بھی جاتی ہیں کہ نہیں" اس پر بادشاہ نے فرمایا کہ "ہاں کھائی کیوں نہیں جاتیں" اور حکم دیا کہ تھوڑی سی پکوائی جائیں۔ دوسرے دن مچھلیاں

پک کر میز پر آئیں اور کھائی گئیں - انکی بو باس کچھ اچھی نہ تھی - نہ ذائقہ ہی کچھ اعلیٰ تھا اور اگر لذیذ بھی ہوتیں تو کانٹے اس کثرت سے تھے کہ کھانا دشوار تھا - اس سے تو ہلسا مچھلی ہزار درجہ بہتر ہی - حالانکہ اُسکی نسبت ہندوستان میں مشہور ہی کہ اُسمیں کانٹے بکثرت ہوتے ہیں -

مجھے دربار کے نئے نئے آداب - قرینے روز سیکھنا پڑتے تھے - اور میں اُنسے دق ہوگیا تھا -

ایک مرتبہ شاہی دعوت کی نوبت آئی - یہ دعوت معمولی بادشاہ کیجانب سے صاحب رزیڈنٹ اُنکے ایڈیکانگ صاحبان - اور بعض افسران چھاؤنی کی تھی - جلسہ تماشے کے خاتمے پر دفعتہً ایک شخص ملازم کمپنی (جسے ہم جونس کے نام سے یاد کرینگے) کیطرف مخاطب ہوکے فرمایا -

بادشاہ - جونس صاحب - آپ ہمارے ساتھ ڈرافٹ کی ایک بازی کھیلیے گا -

(واضح ہو کہ بادشاہ کو جونس صاحب سے کچھ خلش ہوگئی تھی کیونکہ جب وہ بادشاہ کی مصاحبت میں تھے تو انکو بادشاہ کے زک دینے کی ہمیشہ فکر رہا کرتی تھی -)

جونس - حضور کے ساتھ کھیلنا میرے لیے سرسر باعث اعزاز و افتخار ہی -

بادشاہ - سو اشرفیوں کی بازی بدو گے -

جونس - حضور - میں غریب آدمی ہوں - سو اشرفیوں کا مقدور نہیں رکھتا -

بادشاہ (اپنے ماسٹر کیطرف مخاطب ہوکر) ماسٹر جی - بھلا تم - مجھسے سو اشرفیوں کی بازی کھیلوگے -

ماسٹر - یہ حضور کی سرفرازی ہی - میں تو اسے اپنا فخر سمجھوں گا -

ماسٹر صاحب بادشاہ کے مزاج سے واقف تھے اور اُنکے دل کی لہر بہت اچھی طرح سے پہچانتے تھے - تختہ آیا - مُہرے قائم کیے گئے - میں بھی بادشاہ کے قریب بیٹھا ہوا ہر ایک چال کو بغور دیکھ رہا تھا - چونکہ مجھے ماسٹر صاحب کے ساتھ شطرنج کھیلنے کا اتفاق ہوچکا تھا اسلیے مجھے یقین تھا کہ وہ ڈرافٹ میں بھی بڑے ماہر ہونگے - لیکن اس موقع پر میں نے دیکھا کہ گو بادشاہ سلامت خراب کھیلتے تھے لیکن ماسٹر اُن سے بھی بدتر کھیلنے لگے اور اس سے میں نے آداب دربار کا ایک سبق حاصل کیا - کیونکہ مجھے معلوم ہوا کہ حتی المقدور بادشاہ کو شکست نہیں دینا چاہیے - ماسٹر صاحب کا یہ حال تھا کہ اگرچہ بہت برا کھیل رہے تھے مگر ہر طرح ظاہر ہی کیے جاتے تھے کہ جسقدر غور و فکر اور کوشش سے وہ کھیل سکتے تھے کھیل رہے تھے - باایں ہمہ - بہت دشواری سے اسکا موقع ملتا تھا کہ کسی طرح پر بادشاہ بازی جیتیں - میں نے یہ بھی سُنا کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہی کہ بعض مصاحبین فریق ثانی کو کھیل کے وقت باتوں میں لگا لیتے ہیں اور بادشاہ سلامت آنکھ بچا کر مُہرے ادل بدل کے

رکھ دیتے ہیں۔ باالآخر۔ بازی ختم ہوگئی۔ اور بادشاہ نے ماسٹر صاحب کو شکست دیدی۔ بادشاہ نے خوش ہوکر ماسٹر صاحب سے فرمایا۔ اب میری سو اشرفیاں تمھارے ذمّے واجب ہیں۔

ماسٹر۔ حضور۔ بیشک۔ میں آج ہی شام کو اشرفیاں حاضر کرونگا۔

بادشاہ نے محلسرا جاتے وقت ماسٹر صاحب سے فرمایا کہ "خبردار۔ اشرفیاں بھول نہ جانا" چنانچہ شام کو جب ہم پانچوں مصاحب کھانے کے واسطے جمع ہوئے تو بادشاہ نے ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی فرمایا۔ ماسٹر صاحب "اشرفیاں لائے" ماسٹر صاحب نے کہا۔ جی۔ حضور۔ پالکی میں رکھّی ہیں۔ لے آؤں؟ بادشاہ بول اُٹھے۔ یہ کیا لغویات ہے۔ آپ کو اشرفیاں مبارک رہیں۔ مجکو حاجت نہیں۔ اپنے گھر بھیجدیجئے۔ جونس کو شاید یہ خیال تھا کہ میں اُسکی اشرفیاں لیلونگا۔ تمنے دیکھا تھا سور کس طرح کھانے پر جٹا ہوا تھا۔ واللہ۔ مجھے اُسکی صورت سے نفرت ہے"

ناظرین کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا جونس صاحب سے کسی نے بادشاہ کی طبیعت کا حال نہ بیان کیا ہوگا۔ لیکن بات یہ ہی کہ جو شخص اُسکو یہ صلاح دیتا کہ اگر ایکبار موقع آجائے تو بازی بدلے تو گویا وہ اُسکے ایک سو ساٹھ پاؤنڈ کا نقصان کرتا۔ کیونکہ بادشاہ سلامت ایسے متلون مزاج تھے۔ کہ اُنکے اقوال وافعال کا کچھ بھی ٹھیک نہ تھا۔ بادشاہ کے خانگی ملازموں میں سے ہر شخص بخوبی جانتا تھا۔ کہ اگر بادشاہ شرط کا روپیہ لیلیں گے تو اُسکا دوچند اُسکو وصول بھی ہوجائیگا۔ یا خود بادشاہ انعام اکرام کے حیلے سے دیدینگے یا وزیر۔ لیکن جس شخص سے بادشاہ کا دل پھرا ہوا ہو اُسکے حق میں البتہ نتیجہ

سچ یہ ہی کہ بادشاہ کے ساتھ شطرنج یا ڈرافٹ وغیرہ کھیلنا ذرا بیڈھب تھا کیونکہ خواہ مخواہ اُن کو جتانا پڑتا تھا۔ وہ دونوں کھیل کھیلتے تھے۔ اور بُرا کھیلتے تھے۔ مگر ہمیشہ جیتتے تھے۔ کیونکہ یہ بات آداب دربار میں داخل تھی کہ کبھی اُنکو شکست نہ ہونے پائے۔ مجھے بھی بادشاہ کے ساتھ کھیلنے کا اکثر اتفاق پیش آیا اور میں نے ہمیشہ اُس سبق کو یاد رکھا جو ماسٹر کے کھیل کو دیکھ کے پڑھا تھا۔ بادشاہ کے ساتھ اتنا کھیلنا بھی آسان نہ تھا۔ کیونکہ یہ لازم پڑتا تھا کہ کوئی مصاحب قریب کھڑا ہو اور آنکھ بچا کے گیند کو اسطرح پر اُچھال دے کہ بادشاہ کا گیند فریق ثانی کے گیند سے آگے نکلجائے یا ایسی چابکدستی سے چھوڑ دے کہ کھیل بادشاہ کے موافق پڑجائے۔ یا ایک گیند تھیلی میں پہونچ جائے اور ایک تھیلی میں پہونچنے سے رُک جائے۔ لیکن یہ ساری ہٹ پھیریاں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے کرنا پڑتی تھیں تاکہ ظاہر نہ ہونے پائیں۔ کیونکہ بادشاہ اُسیوقت راضی وخرسند رہ سکتے تھے

جبکہ اُنکا مقابل اِس فریبی کارروائی سے سراسر بے خبر اور اُسکے نتیجے پر حیران و پریشان رہے۔

گو اسمیں کچھ شبہہ نہیں کہ اس قسم کے طفلانہ حرکات اور پھر ایک بادشاہ کے شایانِ شان کسی طرح نہیں۔ لیکن اگر اس بنا پر ہمارے ناظرین یہ سمجھیں کہ ایسی باتیں لکھنؤ میں محدود تھیں اور یہ کہ دیگر مقامات پر شاہی ایوانات اور اُن ممالک میں جو اودھ سے بدرجہا زائد تہذیب یافتہ ہیں نہیں ہوتے تو یہ اُنکی غلطی ہی۔ مثلاً کسی مصاحب کی مجال نہیں کہ وہ شہنشاہ روس کو شطرنج۔ انٹا۔ ڈرافٹ وغیرہ میں شکست دیدے باوجودیکہ شہنشاہ روس نادان۔ ناسمجھ بچے نہیں تاہم ہر صورت سے ایسی کوئی چال چلی جاتی ہے جس سے وہی بازی جیت لے جاتے ہیں۔ خیر۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم یورپ کے ایک بادشاہ کے شکار کی واقعی روئداد بیان کرتے ہیں جسکے واقعات بعینہ ویسے ہی ہیں جیسے کہ ہمارے نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ ظل سبحانی کے۔ یعنے بروز سینٹ ہوبرٹ ہر سال کی ۳ نومبر کو دربار برلن میں بمقام گرونیو الڈ جنگلی سور کا شکار ہوتا ہے جسمیں حضور شاہ پروشیا نفیس پوشاک (یعنے سیاہ اعلیٰ درجے کے رنگ کی مخمل کا فرغل اور سفید براق پتلون زیب تن کرکے میدان میں آتے ہیں اور اُنکے ہمراہ بہت سے شکاری سرخ کوٹ اور چرمی وردی پہنے اُس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ اور سور طیار کرکے چھوڑا جاتا ہی (یعنے اُسکے دانت کاٹ ڈالے جاتے ہیں تاکہ کوئی نقصان نہ پہونچائے) پھر اُسکے پیچھے بادشاہ معہ رفیق رفقا اور شکاری کتوں کے اور سب لوگ میدان میں دوڑتے ہیں۔ پھر ایک جست میں بادشاہ اور اُسکے پیچھے پیچھے ساری بھیڑ سکتے۔ اور سرخ کوٹ اور چرمی وردی والے اُسکے قریب پہونچ جاتے ہین۔ کتے اُسکو سب طرف سے دبوچ لیتے ہیں اور بالکل بے قابو اور پست کر ڈالتے ہیں۔ اُسوقت چند شکاری اپنے گھوڑوں سے اتر کر جانور کو پکڑ لیتے ہیں اسطور پہ کہ سر اوپر اُٹھا ہوا رہی۔ کتے واپس بلائے جاتے ہیں اور اُسوقت بادشاہ قریب آتے ہیں۔ اُنکے ہاتھ میں ایک شمشیر آبدار دیجاتی ہی اور وہ گھوڑے سے اُترکر سور کے پاس جاتے ہین اور اسکی گردن پر ایک ضرب لگاتے ہیں۔ اسپر بادشاہ کی شجاعت و استقلال۔ دلیری و جوانمردی پر چاروں طرف سے واہ واہ و سبحان اللہ کا غل بلند ہوتا ہی۔ اور وہ مارے خوشی کے جامے میں نہیں سماتے اور خوش خوش محلسرا میں جاتے ہیں۔ اس حکایت کے سننے سے معلوم ہوگا کہ لکھنؤ کے ایوان شاہی کی جو حالت ہے وہ یورپ کی سلطنتوں کے ایوانات شاہی سے زیادہ مغائر نہیں۔

دربار اودھ میں یورپین ملازمان شاہی کا جو کچھ رسوخ و اقتدار تھا اُسے ہندوستانی امراء و عمائد سلطنت ہرگز اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ ان لوگوں کو یہ باتیں بہت خار گزرتی تھیں اور ادر کے

انصاف پہ کچھ بیجا اور غیر معمولی بھی نہ تھا۔ کیونکہ نواب یعنی وزیر یا سپہ سالار عساکر جو پولیس کا حاکم اعلیٰ بھی تھا (یعنے راجہ بختاور سنگھ جسکی بابت میں آگے چلکر بہت کچھ لکھونگا) انکی کسی کی بادشاہ کے سامنے بمقابلۂ خاصہ تراش کے کچھ نہ چلتی تھی۔ ایک مرتبہ نواب وزیر نے بادشاہ سے عرض کیا کہ ان یورپین مصاحبون کو زیب نہیں ہو کہ جہاں پناہ کے حضور میں جوتا پہن کے حاضر ہوں ہم لوگ تو یہ بات اپنے واسطے بھی روا نہیں رکھتے۔ حضور نے اس قسم کی مراعات سے ان لوگوں کو خیرہ کر رکھا ہو اور میں بالتخصیص عرض کرتا ہوں کہ حضور کے والد بزرگوار نواب غازی الدین حیدر مغفور کبھی اسکو جائز نہ رکھتے بادشاہ کو ایسے منکسر متواضع اور باتمیز وزیر کی یہ تقریر سنکے تھوڑی دیر سکوت رہا۔ لیکن۔ روشن الدولہ نے اس عنوان سے یہ گفتگو کی تھی کہ بجائے اشارۂ چشم وابرو کے بادشاہ کو زبان ہی سے جواب دینا پڑا۔ چنانچہ اُنھوں نے ارشاد فرمایا۔

بادشاہ۔ نواب۔ کیا میں شاہِ انگلستان سے بھی عظیم المرتبت ہوں۔

وزیر۔ خداوند۔ شاہان ہندوستان میں تو کوئی حضور کا ہمسر نہیں۔ بلکہ شاہ دہلی کی بھی اب یہ شان نہیں ہو۔ خدا قبلۂ عالم کو ہزار برس زندہ رکھے۔

بادشاہ۔ روشن الدولہ۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ انگلستان کے بادشاہ سے بھی میرا رتبہ بڑا ہو۔

وزیر۔ غلام کی تو یہ مجال نہیں کہ کسی بادشاہ کو قبلۂ عالم پر ترجیح دے سکے۔

بادشاہ۔ نواب سُنو! اور جنرل تم بھی سنو! کہ بادشاہ انگلستان ہمارا حاکم ہو۔ اور یہ لوگ اُسکے سامنے جوتا پہنکے جاتے ہیں۔ پھر میرے سامنے جوتا پہنے رہنے میں کیا مضایقہ ہے۔ کیا یہ لوگ میرے حضور میں ٹوپی دیکے حاضر ہوتے ہیں؟ نواب۔ اسکا جواب دو۔

نواب۔ نہیں خداوند۔ انکے سر پر ٹوپی تو بیشک نہیں ہوتی۔

بادشاہ۔ بس۔ تو انکا طریقہ اور اُنکے ہاں کا آداب دربار شاہی یہی ہو کہ ٹوپی اُتار ڈالتے ہیں جیسے تم لوگ جوتا اُتار ڈالتے ہو۔ اب تمھاری تشکیں ہو گئی کہ نہیں۔ اگر نہیں ہوئی تو میں ابھی ان لوگوں کو حکم دیے دیتا ہوں کہ جوتا اُتار کے حاضر ہوا کریں۔ لیکن تمکو بھی پگڑی اُتار کے حاضر دربار ہونا پڑے گا۔ کیوں ہو منظور؟

اسکے بعد پھر کبھی نواب نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کہی کیونکہ مسلمانوں میں پگڑی اُتارنا بڑی ذلت سمجھا جاتا ہو۔ اور ان لوگوں میں ایسے موقع پر جبکہ کسی فعل کے نکرنے کا

قصد کریں یا کسی کام کے کرنے پر دل سے آمادہ ہو جائیں یہ قسم کھائی جاتی ہے کہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہمارے باپ کی پگڑی اُتر جائے ۔

اس گفتگو نے ہملوگوں کو متحیر کر دیا۔ اور بادشاہ نے اپنے واقعہ نگار منشی کو حکم دیا کہ اس گفتگو کی یادداشت قلمبند کرو۔ کیونکہ اس قسم کی جو اہم باتیں دربار میں ہوتی تھیں اُن کو وقایع نگار لکھ لیتے تھے۔ تاکہ معلوم رہے کہ جس وقت بادشاہ اپنی قوت فیصلہ۔ اور عقل سے کام لیتے ہیں تو بیوقوف ثابت نہیں ہوتے البتہ جب وہ عالم سرخوشی میں ہوتے تو نشے کی ترنگ میں یا طبیعت کے بھولے پن سے طفلانہ افعال و حرکات بھی اُنسے صادر ہو جاتے تھے۔ چنانچہ شطرنج۔ انتا۔ ڈرافٹ وغیرہ کے کھیل انھیں حالتوں میں ہوتے تھے۔

میں نے بادشاہ کی تصویر مختلف پہلووں سے کھینچکے دکھا دی ہے اور ابھی صفحات آیندہ میں بہت کچھ اُنکی ہر ایک اچھی بُری حالت و فعل کو بیاں کرونگا۔

۳
باب سوم

شکاریوں کی جماعت

ایک مرتبہ کھانے پر کسی شخص نے شکار کا ذکر چھیڑ کر کہا کہ لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر ایک جھیل میں شکار خوب ہے۔ اُسوقت بادشاہ سلامت خوشی میں تھے۔ فرمانے لگے "ہاں ہاں۔ ہمنے بھی اُس جھیل کی کیفیت سُنی ہے۔ اچھا۔ چلو وہاں چل کے شکار کھیلیں۔ دیکھیں ہمارے جلسے میں شکاری کون کون ہے" اُسی وقت احکام جاری ہوگئے۔ اور یہ قرار پایا کہ ہم لوگ اُن عمارات میں جو جھیل کے کنارے واقع ہیں دوسرے روز مجتمع ہوں۔ یہ عمارت جسکا نام دلکشا تھا حدود شہر سے چند ہی میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ لہذا اس خیال سے کہ شام تک ہم لوگ شکار کھیل کے واپس آ ہی جائیں گے کسی نے شب باشی کا انتظام بھی نہیں کیا۔ جب وہاں پہونچے تو دیکھا کہ بادشاہ سلامت مع اپنے رفیق رفقا۔ اہالی موالی کے دلکشا میں تشریف فرما ہیں۔ ہملوگ سمجھتے تھے کہ پہونچتے ہی پہونچتے بادشاہ ہمکو جھیل پر چلنے کے واسطے طلب فرمائیں گے مگر کسی نے خبر بھی نہ لی۔ اسی انتظار میں کہ اب طلبی ہوئی اب طلبی ہوئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ اور دن ڈھلتے ڈھلتے تمام ہوگیا۔ اور ہملوگ انٹا کھیل کھیل کے وقت کاٹتے رہے۔ رات کے نو بجے معمولی کھانے کے وقت طلبی ہوئی۔ حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حسب معمول بادشاہ سلامت خاصہ نوش فرمانے پر طیار بیٹھے ہیں۔ کسی کو یہ عرض کرنے کی جرأت بھی نہ ہوئی کہ شکار کیوں ملتوی کیا گیا۔ اور خود بادشاہ نے بھی اسکا کچھ تذکرہ نہ فرمایا۔ معمولی کھانے پینے۔ دور شراب اور رقص و سرود میں رات بسر ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ آدھی رات گزر گئی۔ بادشاہ نشے میں چور اور ہملوگ اسکے منتظر تھے کہ اب کوئی دم میں لوگ انکو محلسرا میں واصل کیا چاہتے ہیں۔ کہ دفعتہً اُنھوں نے ایک بڑا قہقہہ مارا۔ چونکہ بظاہر کوئی سبب معلوم نہ ہوتا تھا اسوجہ سے ہم سب متحیر تھے کہ کیا بات ہے۔ ہمکو متوجہ پاکر بادشاہ نے فرمایا کہ "بھئی۔ یہ کوئی شرط وفاداری نہیں ہے کہ تملوگ ہمیں اکیلا چھوڑ کے یہاں سے چلدو۔ یہ بڑا واہیات مقام ہے۔" پھر خاصہ تراش اور ایک اور مصاحب سے مخاطب ہوکے فرمایا۔ "تم لوگ بیویاں رکھتے ہو۔ تم اپنے گھر جاکے رہو۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ آجکی شب میں تمکو تمھاری بیویوں کی ہم آغوشی سے محروم رکھوں۔ باقی اور سب لوگوں کو حاضر رہنا چاہیے۔

جب ہملوگ بادشاہ کی ہمراہی میں لکھنؤ سے کچھ بھی دور جایا کرتے تھے تو ہمارے ساتھ ہمیشہ ہمارے سفری پلنگ۔ نوکر چاکر۔ کپڑے لتے۔ نہانے منھ دھونے کا سامان ساتھ رہا کرتا تھا۔ کیونکہ روزانہ از سرتاپا صاف جوڑا بدلنا پڑتا تھا۔ اسوجہ سے کوئی شخص صرف ایک گٹھری لیکر سفر نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ بادشاہ سلامت کی یہی مرضی ہوتی تھی لہذا ہمکو اُسکی تعمیل کرنا پڑتی تھی۔

اس گفتگو کے بعد بادشاہ نے یہ بھی فرمایا کہ بس "اب کل شکار کھیلیں گے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ تو داخل محلسرا ہو گئے اور اُنکے جاتے ہی ہمارے دوست روہی دونوں جن کو اجازت مل چکی تھی) چلتے پھرتے نظر آئے۔ انھیں میں سے ایک صاحب چلتے چلاتے یہ وعدہ کر گئے کہ میں تمہارے مکان پر جاکر تمہاری پالکی بھیجدونگا کیونکہ سفر میں اکثر مرتبہ اسی پر رات بسر کرنے کا اتفاق ہوتا تھا اور تمہارے خدمتگار کو اور اُسکے ساتھ تمہارے کپڑے بھی صبح کیلئے بھجوا دونگا۔ بادشاہ سلامت جب قہقہہ مارتے ہوئے محلسرا کے اندر داخل ہوئے تو ہم لوگ بھی ہنسی میں اُنکا ساتھ دیتے رہے۔ کیونکہ بحیثیت مصاحب یہ ہم سب کا فرض منصبی تھا۔ محلسرا میں داخل ہوتے وقت پہلے تو ہم لوگوں سے ارشاد ہوا کہ آپکا جی چاہے تو ناچ گانا موقوف نہ کیجئے گا۔ پھر جب طوائفوں کے قریب کی جانب بادشاہ کا گزر ہوا تو اُنسے فرمایا کہ تم لوگ ناچے گائے جاؤ۔ اور صاحب لوگوں کو خوش کرتے رہو۔ وہ وقت بھی عجیب تھا۔ ہمارے مہرباں تو جا چکے۔ لق و دق کمرے میں جہاں ہر قسم کی قندیلیں۔ ہانڈیاں۔ دیوار گیریاں۔ جھاڑ۔ فانوس روشن تھے۔ قریب قریب ہو کا عالم تھا۔ بادشاہ گئے۔ اور اُنکے ساتھ اُنکی خواصیں پیش خدمتیں بھی داخل دفتر ہو گئیں۔ اب اتنے بڑے کمرے میں ہم نفسے چند تھے اور بیچاری شامت کی ماری ناچنے گانے والیاں۔ جی کیا خاک لگتا۔ آخر کار جب ہمنے دیکھا کہ اب بادشاہ ہماری آواز کی رسائی سے آگے پہونچ گئے ہیں تو ہمنے ان بیچاریوں کو رخصت کرادیا۔ چونکہ شراب سے چھکے ہوئے تھے خمار و خمیازہ کا عالم تھا۔ تھک بھی گئے تھے۔ لیٹنے پوٹنے کو بے اختیار جی چاہتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ ہمکو اسوقت کوئی ایسی سخت تکلیف تو تھی نہیں کیونکہ ہملوگ شاہی میز پر بیٹھے ہوئے تھے کہ جہاں ذرا سے اشارے میں رنگا رنگ فواکہ اعلےٰ اعلےٰ شرابیں موجود ہو سکتی تھیں لیکن پھر بھی یکایک سارے کمرے کی رونق کا اُٹھ جانا چہچہے قہقہے قلقل مینا اور صدائے طنبور و تار کے عوض سناٹا چھا جانا ہی کیا کم وحشت خیز تھا۔ اب ہملوگ بات کرتے تو آہستہ آہستہ۔ کیونکہ ہنسی مذاق کا کون موقع تھا۔ باقی مے نوشی۔ اُسکا یہ حال کہ ایک روز پیشتر جو کچھ تکلیف درد سر وغیرہ کی پہونچ چکی تھی وہ بھولی نہ تھی۔

بالآخر۔ ہملوگ میز پر سے اُٹھ کھڑے ہوے اور لگے کوٹھی کے گرد چکر کاٹنے۔ یہ کُل عمارت ہماری چہل قدمی کے واسطے وقف تھی۔ خوابگاہ شاہی البتہ مستثنےٰ تھی کیونکہ اُسکے سامنے ہندوستانی عورتیں سپاہیانہ وردی پہنے۔ کاندھوں پر بندوقیں رکھے آہستہ خرامی سے پہرہ دے رہی تھیں۔ اب سب طرف بالکل ہو کا عالم تھا۔ اور غضب کی خاموشی طاری تھی۔ ادھر اُدھر کچھ ہندوستانی خدمتگار اپنے چادروں میں لپٹے۔ گولا لاٹھی بنے۔ مست مالٹے پڑے تھے۔ اور ایسے بے خبر سو رہے تھے کہ شاید ہنگامۂ قیامت بھی اُنکے سروں پر برپا ہو جائے تو اُنکے کان پر جوں تک نہ رینگے۔

رات کے دو بجگئے اور اب تک ہمارے نوکروں کا کہیں پتہ نشان نہ تھا۔ مجبوراً ہم میں سے کسی نے کسی کوچ یا دنگل اور کسی نے آرام کرسی پر قبضہ کیا۔ اور اپنے جسموں کو مچھروں۔ پسوؤں پر وقف کرکے سونا شروع کیا۔ اُسوقت ایک بڑی موٹی شمع میز پر روشن تھی۔ ادھر اُدھر سے خرّاٹوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کھانے کے کمرے میں بعض فرّاش شمعیں گُل کر رہے تھے۔ اور باہر کچھ سنتری معمولی رفتار سے ٹہل رہے تھے۔ مجھے نیند آچلی تھی کہ اتنے میں میری پالکی دوسرے کمرے میں لاکر رکھی گئی۔ میرے ساتھیوں کے واسطے بھی یہی سامان ہوا۔ ہمارے خدمتگاروں نے ہماری آسایش کا انتظام مناسب کر دیا۔ اور ہم لوگ خواب خرگوش میں بادشاہ کے قہقہے اور اپنی تکلیفات کو بھول بسر گئے۔

دوسرا دن ہوا۔ اور وہ بھی پہلے دن کیطرح گزر گیا۔ ایک شخص نے آکے کہا کہ بادشاہ سلامت آپ لوگوں کو کئی بار یاد فرما چکے ہیں۔ اسکا منشا صرف اسیقدر تھا کہ ہملوگ یہاں سے جانے نہ پائیں۔ حسب معمول بارہ بجے خاصہ تراش بادشاہ کی اصلاح بنانیکو حاضر ہوا۔ ہملوگ اپنے حسب مرضی مشاغل سے جی بہلاتے رہے۔ کبھی منہ میں چُرٹ دبائے برآمدے میں ٹہلتے کبھی انٹا کھیل کے وقت کاٹتے کبھی ہندوستانی صنعت و حرفت کے اُن نمونوں کو دیکھتے جن سے کوٹھی کے بعض کمرے آراستہ تھے۔ یہ ظاہر تھا کہ بادشاہ کی مرضی یہی ہے کہ ہملوگ حاضر رہیں لیکن شکار کے بارے میں اُنھوں نے ایک حرف بھی ارشاد نہیں فرمایا۔ نہ اُس جھیل پر چلنے کی کچھ بھی تیاری معلوم ہوئی جہاں ہمکو یقین دلایا گیا تھا کہ ہزار در ہزار شکاری پرند موجود ہیں۔

معمولی طور پر رات کے کھانے سے فراغت ہوگئی۔ اور اُسکے بعد بادشاہ نے پھر یہی فرمایا کہ ایسے وحشت خیز مقام پر اُنکو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اور یہ کہ شکار پر کل چلیں گے۔ اُسی طرح پھر ہملوگوں نے پالکیوں میں بستر جمائے اور ہمارے چند خدمتگار صبح کیلیے کپڑے لینے چلے گئے۔ میں نے اس خیال

سے کہ کہیں بادشاہ سلامت اسی کوٹھی میں یا جھیل کے کنارے جو پڑاو ڈالا گیا ہے اسمیں چند روز قیام نہ کریں اپنے ملازم کو حکم دیدیا کہ جملہ سامان سفر۔ اوڑھنا بچھونا۔ کپڑوں کے صندوق وغیرہ لیتا آئے تاکہ عندالضرورت ہر شئے مہیا ملے۔ کسی چیز کی تکلیف نہو۔ ہندوستانی خدمتگاروں سے پوچھ گچھ کی تو ہم کو اسکی سن گن ملگئی کہ بالفعل بادشاہ اپنی ایک نئی حرم سے جو بہت ہی کمسن اور خوبصورت ہے اور جسے ہملوگوں نے دو ایک دن پیشتر دلکشا ہوس پہلے دیکھا تھا مصروف عیش ونشاط ہیں۔ یہ ایک نیا شگوفہ کھلا تھا جو بہت ہی جلد اُسی طرح کمھلا جانیوالا تھا جیسے چھوٹے بچے آج ایک کھلونے سے کھیلتے ہیں اور کل دوسرے سے جی بہلاتے ہیں۔

میں نے تو انھیں پیش بندیوں کے خیال سے ایک ہفتہ کے قیام کا سامان اور اپنی آسایش کا بندوبست پوری طرح کرلیا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتہ یہیں گزر گیا اور اُسکے بعد ہملوگ جھیل کیطرف روانہ ہوے۔ کیونکہ بادشاہ نے حکم لگادیا تھا کہ سب لوگ وہاں ایک ساتھ چلیں۔ جھیل کو اور اُسکے گرد جو سامان کیا تھا اُسکو دیکھکر ہملوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ جھیل کی اُسطرف یعنی جدہر سے ہم پہونچے تھے زمین بتدریج کم ہوتی چلی گئی تھی۔ اور ساحل کی طرف ڈھالو۔ اور اسی وجہ سے جب تک ہم کنارے کے ٹیکرے پر نہ پہنچے تھے چادر آب نظر نہ آئی۔

اب ہمارے سامنے جھیل لہریں لے رہی تھی۔ اور ڈوبتے ہوے آفتاب کی دھیمی دھیمی کرنیں پانی میں سُرخ سُرخ رنگ گھول رہی تھیں۔ یہ جھیل طولاً دو میل اور عرضاً ایک میل ہوگی۔ بجز اُس رُخ کے جدھر سے ہم پہونچے اور سب طرف گھنا گھنیرا جنگل تھا۔ جسکے درختوں کی شاخیں پانی پر سایہ فگن تھیں۔ جدھر جنگل نہ تھا اُدھر کگارا ذرا بلند تھا اور اُسپر سبزہ شاداب مرغزار دور تک نظر آتا تھا۔ اسی سبزہ زار میں بہت بڑے بڑے خیمے۔ راوٹیاں۔ چھولداریاں نصب تھیں۔ بیچوں بیچ میں بادشاہی خیمے تھے۔ جنکے گرد قنات کھنچی ہوئی تھی۔ خاص شاہی خیمہ زرتار بادلے کا تھا۔ جسمیں قرمزی رنگ کی دھاریاں عجب نمود کی تھیں اور اُسکے اردگرد۔ رنگارنگ جھنڈے پھریرے ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ قنات کی پشت پر شاہی محلات وبیگمات اُنکی پیش خدمتوں خواصوں۔ زنانہ پہرے والیوں۔ مہریوں۔ ڈومنیوں۔ وغیرہ کے خیمے ترتیب وار نصب تھے۔ چونکہ اس موقع پر صاحب رزیڈنٹ بھی آنیوالے تھے لہذا بادشاہ کے خیمے کے داہنی جانب ایک خوشنما خیمہ اُنکے واسطے بھی نصب کیا گیا تھا۔ اور دوسری جانب تھوڑے فاصلے سے ایک مربع خیمہ ہم یورپین ملازمان خانگی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ ان خیموں کے علاوہ۔ نواب۔ اُنکے صاحبزادے یعنی سپہ سالار۔ جنرل صاحب یعنی پولیس کے افسر اعلیٰ۔ اور دیگر اعلیٰ عہدہ داران کے بھی خیمہ جات تھے

اور انہیں سے بعض کے ہمراہ بہت کچھ حشم و خدم تھے اسی چھوٹے سے شہر میں ہاتھی۔ گھوڑے۔ اونٹ اور خچر بھی جابجا تھے۔ کہیں ہودے نظر آتے تھے۔ کہیں پالکیاں اور ہوادار۔ اور پھر انھیں کے ساتھ وہ طرح طرح کی بند سواریاں جنہیں شاہی مخدرات عالیہ سوار ہوا کرتی تھیں۔

بادشاہ کا یہ منشا تھا کہ یہ جاہ و حشم۔ خیمہ و خرگاہ۔ دیکھکے ہملوگ دنگ ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہملوگوں کے استعجاب سے بادشاہ کی باچھیں کھل گئیں۔ کیونکہ ہمارا یہ استعجاب ہرگز تصنع اور بناوٹ سے نہ تھا فی الحقیقت آرایش و زیبایش کے یہ ساز و سامان تو ہمنے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ ہم لوگوں میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ بادشاہ سلامت سے پوچھتا کہ درانحالیکہ یہ جھیل شہر سے اسقدر قریب تھی تو پھر اسدرجہ اہتمام کی کیا حاجت تھی۔ کیونکہ آسانی سے یہ ممکن تھا کہ صبح کو سویرے گھر سے چلتے۔ دن بھر شکار کھیلتے اور سر شام اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے اور مزے سے اپنے مکان پر کھاتے پیتے۔ پڑ رہتے۔ خیر۔ یہ ہملوگوں کا منصب بھی نہ تھا۔ ہملوگ جھیل کے گرد و پیش کے خوشنما سماں اور خیمہ گاہ کی عظم و شان۔ اور دیگر سامان پر اپنا تعجب ظاہر کرتے رہے۔ جس سے بادشاہ شاد ہوئے اور ہملوگ بجائے خود مطمئن۔ ہمکو معلوم ہوا کہ بادشاہ کے ساتھ شکار کھیلنا معمولی بات نہیں۔ یہ کچھ شے دیگر ہے۔ کیونکہ بادشاہ کی مرضی یہی ہے کہ خود بدولت ہی کل شکار کھیلیں اور کوئی انکا مزاحم و رقیب نہ ہو۔ چنانچہ کئی دن تک متواتر تنہا بادشاہ سلامت ہی شکار کھیلتے رہے۔ جھیل کے کنارے ایک پردہ تانا جاتا تھا۔ جسکا منشا یہ تھا کہ شکاری پرندوں کی نظر بادشاہ پر نہ پڑے۔ پھر کنارے دانہ وغیرہ ڈالکر پرندوں کو مجتمع کرتے تھے اور جب صدہا جمع ہو جاتے تو تمام لشکر میں سکوت ہو جاتا اور بادشاہ سلامت کو فوراً خبر کیجاتی کہ اب جانور کثرت سے سطح آب پر اکٹھا ہو گئے ہیں اسوقت بادشاہ آہستہ آہستہ پردے کے پاس آتے اور انکے پیچھے پیچھے ایک رفیق انکی ولایتی بندوق لیے آتا پردے میں ایک سوراخ پہلے سے کر رکھا جاتا تھا اور اس سے بندوق کی نال باہر جانوروں کی طرف نکال دیجاتی۔ اب اسوقت جانور تو غافل ہو کر مزے سے دانہ چگنے میں مصروف اور آپسمیں چونچوں پنجوں سے شوخیاں کرتے۔ اور اپنی بولی ٹھولی میں اپنے "بےغم" ہونے پر خوشی منا رہے ہیں اور انسے کوئی اتنی بات کہنے والا نہیں کہ سہ نزدیک شاخ گل کے بلبل سمجھ کے جانا پھندے لگا رہا ہے صیاد چھپکے چھپکے عین ایسے وقت میں یکایک ہوا میں "دن" کی آواز گونجتی اور نال سے دھواں نکلتا۔ یعنی بادشاہ سلامت اپنے ہی دست مبارک سے بندوق داغتے اور اپنے نزدیک بڑا کمال دکھاتے اور ان غریبوں پر بلاے بے درماں اور آفت ناگہانی کی طرح چھروں کی بوچھار پڑ جاتی۔ اگرچہ بادشاہ بڑے قادر انداز نہ تھے۔ اور اسی وجہ سے اکثر چھرے ٹھیک نشانے پر بھی نہ پڑتے بلکہ اوپر ہی اوپر ہوا میں اڑ جاتے لیکن تاہم

سے کہ کہیں بادشاہ سلامت اسی کوٹھی میں یا جھیل کے کنارے جو پڑاو ڈالا گیا ہے اسمیں چند روز قیام نہ کریں اپنے ملازم کو حکم دیدیا کہ جملہ سامان سفر۔ اوڑھنا بچھونا۔ کپڑوں کے صندوق وغیرہ وغیرہ لیتا آئے تاکہ عندالضرورت ہر شئے مہیا ملے۔ کسی چیز کی تکلیف نہو۔ ہندوستانی خدمتگاروں سے پوچھ گچھ کی تو ہم کو اسکی سُن گُن ملگئی کہ بالفعل بادشاہ اپنی ایک نئی حرم سے جو بہت ہی کمسن اور خوبصورت ہے اور جسے ہملوگوں نے دو ایک دن پیشتر دلکشا پہونچکے دیکھا تھا مصروف عیش ونشاط ہیں۔ یہ ایک نیا شگوفہ کھلا تھا جو بہت ہی جلد اُسی طرح کُھلا جاتیوالا تھا جیسے چھوٹے بچے آج ایک کھلونے سے کھیلتے ہیں اور کل دوسرے سے جی بہلاتے ہیں۔

میں نے تو انھیں پیش بندیوں کے خیال سے ایک ہفتہ کے قیام کا سامان اور اپنی آسایش کا بندوبست پوری طرح کر لیا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتہ یہیں گزر گیا اور اُسکے بعد ہملوگ جھیل کیطرف روانہ ہوے۔ کیونکہ بادشاہ نے حکم لگادیا تھا کہ سب لوگ وہاں ایک ساتھ چلیں۔ جھیل کو اور اُسکے گرد جو سامان کیا تھا اُسکو دیکھکر ہملوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ جھیل کی اُسطرف یعنی جدہر سے ہم پہونچے تھے زمین بتدریج کم ہوتی چلی گئی تھی۔ اور ساحل کی طرف ڈھالو۔ اور اسی وجہ سے جب تک ہم کنارے کے ٹیکرے پر نہیں چڑھے چادر آب نظر نہ آئی۔

اب ہمارے سامنے جھیل لہریں لے رہی تھی۔ اور ڈوبتے ہوے آفتاب کی دھیمی دھیمی کرنیں پانی میں سُرخ سُرخ رنگ گھول رہی تھیں۔ یہ جھیل طولاً دو میل اور عرضاً ایک میل ہوگی۔ بجز اُس رُخ کے جدھر سے ہم پہونچے اور سب طرف گھنا گھنیرا جنگل تھا۔ جسکے درختوں کی شاخیں پانی پر سایہ فگن تھیں۔ جدھر جنگل نہ تھا اُدھر کنارا ذرا بلند تھا اور اُسپر سبز و شاداب مرغزار دور تک نظر آتا تھا۔ اسی سبزہ زار میں بڑے بڑے خیمے۔ راوٹیاں۔ چھولداریاں نصب تھیں۔ بیچوں بیچ میں بادشاہی خیمے تھے۔ جنکے گرد قنات لگی ہوئی تھی۔ خاص شاہی خیمہ زرتار بادلے کا تھا۔ جسمیں قرمزی رنگ کی دھاریاں عجب نمود کی تھیں اور اُسکے اردگرد۔ رنگارنگ جھنڈے پھریرے ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ قنات کی پشت پر شاہی محلات و بیگمات اُنکی پیش خدمتوں خواصوں۔ زنانہ پہرے والیوں۔ مہریوں۔ ڈومنیوں۔ وغیرہ کے خیمے ترتیب وار نصب تھے۔ چونکہ اس موقع پر صاحب رزیڈنٹ بھی آنیوالے تھے لہذا بادشاہ کے خیمے کے داہنی جانب ایک خوشنما خیمہ اُنکے واسطے بھی نصب کیا گیا تھا۔ اور دوسری جانب تھوڑے فاصلے سے ایک مربع خیمہ ہم یورپین ملازمان خانگی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ ان خیموں کے علاوہ۔ نواب۔ اُنکے صاحبزادے یعنے سپہ سالار۔ جنرل صاحب یعنی پولیس کے افسر اعلی۔ اور دیگر اعلیٰ عہدہ داران کے بھی خیمہ جات تھے

اور انہیں سے بعض کے ہمراہ بہت کچھ حشم و خدم تھے اسی چھوٹے سے شہر میں ہاتھی۔ گھوڑے۔ اونٹ اور خچر بھی جابجا تھے۔ کہیں ہودے نظر آتے تھے۔ کہیں پالکیاں اور ہوادار۔ اور پھر انھیں کے ساتھ وہ طرح طرح کی بند سواریاں جنمیں شاہی مخدرات جابیہ سوار ہوا کرتی تھیں۔

بادشاہ کا یہ منشا تھا کہ یہ جاہ و حشم۔ خیمہ و خرگاہ۔ دیکھکے ہم لوگ دنگ ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہم لوگوں کے استعجاب سے بادشاہ کی باچھیں کھل گئیں۔ کیونکہ ہمارا یہ استعجاب ہرگز تصنع اور بناوٹ سے نہ تھا فی الحقیقت آرایش و زیبایش کے یہ ساز و سامان تو ہمنے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ ہم لوگوں میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ بادشاہ سلامت سے پوچھتا کہ درانحالیکہ یہ جھیل شہر سے اسقدر قریب تھی تو پھر اسقدر اہتمام کی کیا حاجت تھی۔ کیونکہ آسانی سے یہ ممکن تھا کہ صبح کو سویرے گھر سے چلتے۔ دن بھر شکار کھیلتے اور سر شام اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے اور مزے سے اپنے مکان پر کھاتے پیتے۔ پڑ رہتے۔ خیر۔ یہ ہم لوگوں کا منصب بھی نہ تھا۔ ہم لوگ جھیل کے گرد و پیش کے خوشنما سماں اور خیمہ گاہ کی عظم و شان۔ اور دیگر سامان پر اپنا تعجب ظاہر کرتے رہے۔ جس سے بادشاہ شاد ہوے اور ہم لوگ بجاے خود مطمئن۔ ہمکو معلوم ہوا کہ بادشاہ کے ساتھ شکار کھیلنا معمولی بات نہیں۔ یہ کچھ شے دیگر ہے۔ کیونکہ بادشاہ کی مرضی یہی ہو کہ خود بدولت ہی کل شکار کھیلیں اور کوئی اُنکا مزاحم و رقیب نہ ہو۔ چنانچہ کئی دن تک متواتر تنہا بادشاہ سلامت ہی شکار کھیلتے رہے۔ جھیل کے کنارے ایک پردہ تانا جاتا تھا۔ جسکا منشا یہ تھا کہ شکاری پرندوں کی نظر بادشاہ پر نہ پڑے۔ پھر کنارے دانہ وغیرہ ڈالکر پرندوں کو مجتمع کرتے تھے اور جب صدہا جمع ہو جاتے تو تمام لشکر میں سکوت ہو جاتا اور بادشاہ سلامت کو فوراً خبر کیجاتی کہ اب جانور کثرت سے سطح آب پر اکٹھا ہو گئے ہیں اسوقت بادشاہ آہستہ آہستہ پردے کے پاس آتے اور اُنکے پیچھے پیچھے ایک رفیق اُنکی ولایتی بندوق لیے آتا پردے میں ایک سوراخ پہلے سے کر رکھا جاتا تھا اور اُس سے بندوق کی نال باہر جانوروں کی طرف نکال دیجاتی۔ اب اسوقت جانور تو غافل ہو کر مزے سے دانہ چگنے میں مصروف اور آپس میں چونچوں پنجوں سے شوخیاں کرتے۔ اور اپنی بولی ٹھولی میں اپنے "چہ غم" ہونے پر خوشی منا رہے ہیں اور اُنسے کوئی اتنی بات کہنے والا نہیں کہ سہ نزدیک شاخ گل کے بلبل سمجھ کے جانا پھندے لگا رہا ہے صیاد چھپکے چھپکے عین ایسے وقت میں یکایک ہوا میں "دن" کی آواز گونجتی اور نال سے دھواں نکلتا۔ یعنی بادشاہ سلامت اپنے ہی دست مبارک سے بندوق داغتے اور اپنے نزدیک بڑا کمال دکھاتے اور ان غریبوں پر بلاے بے درماں اور آفت ناگہانی کی طرح چھروں کی بوچھار پڑ جاتی۔ اگرچہ بادشاہ بڑے قادر انداز نہ تھے۔ اور اسیوجہ سے اکثر چھرے ٹھیک نشانے پر بھی نہ پڑتے بلکہ اوپر ہی اوپر ہوا میں اُڑ جاتے لیکن با ایں ہمہ

اس فیر کے ہوتے ہی چڑیوں کا ٹیڑی دل غوغا کرکے اُڑتا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر ہوا میں بدحواسی کے ساتھ منڈلاتا اور آخرکار جھیل کے کنارے والے جنگل میں اُڑ جاتا۔ تب ملازمان شاہی پانی میں کود کود کے مردہ اور زخم خوردہ جانور نکال لاتے۔ اور جتنے دراصل بادشاہ کے دست مبارک سے فرق اقدس پر تصدق ہوئے تھے اُنسے دو چند جانور جہاں پناہ کے روبرو ڈھیر کردیے جاتے۔

ناظرین کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ دو چند جانور کہاں سے آجاتے تھے۔ بلکہ وہ یقین ہی نہ مانینگے مگر۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ اور یہی ہمیشہ یہاں ہوتا رہتا ہے بلکہ اگر بادشاہ کے نشانے سے ایک بھی زخمی نہ ہوتا تب بھی ایک تعداد کثیر زخم خوردہ جانوروں کی آجاتی۔ کیونکہ اسکا سامان تو پیشتر سے کرلیا جاتا تھا۔ بات یہ تھی کہ چونکہ ہر شخص کا مکنون خاطر یہی ہوتا تھا کہ جہاں پناہ کو راضی و خرسند کرے اسلیے وہ لوگ جو ٹخنوں ٹخنوں پانی میں ڈوبے کھڑے رہتے تھے پیشتر سے کچھ کچھ جانور اپنے پاس چھپائے رکھتے تھے۔ ادھر فیر ہوا۔ اور اُنھوں نے غوطہ لگایا۔ اب غوطہ لگانے میں اُنکو بخوبی موقع ملتا تھا کہ جانور جو اپنے پاس چھپے ہیں اُنکو بھی نکال لیں۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ اور جب وہ سر نکالتے تھے تو کچھ نہ کچھ جانور لیے ہی کے نکلتے تھے اور اُسوقت کسی کے منہ میں دانت نہ تھے جو یہ کہتا کہ یہ جانور بادشاہ کے نشانے کے مارے ہوئے نہیں ہیں اپنی جانب سے تو میں ناظرین کو یقین دلاتا ہوں کہ میں تو حشر تک اس بارے میں ایک حرف منہ سے نہ کہتا۔ آخر۔ مجھے جو ایک ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ وہ کس دن کے واسطے ملتا تھا۔ اسی واسطے کہ بادشاہ کو ناخوش نہ ہونے دوں۔

غرضکہ۔ اسی طرح تین چار دن متواتر یہ شکار ہوتا رہا۔ اور اسکے خاتمے ہی کے وقت صاحب رزیڈنٹ معہ ہمراہیان تشریف لائے۔ اُسوقت بادشاہ نے یہ ممانعت کا حکم منسوخ فرمادیا۔ تب ہمراہیان صاحب رزیڈنٹ اور ہملوگوں نے بھی شکار کھیلا۔ ہملوگون کے واسطے جھیل میں کشتیاں چھوڑی گئیں۔ اور جی کھولکے ہمنے شکار کھیلا۔ بعد اسکے سدھائے ہوئے شکاری بازوں سے شکار کھیلنے کی نوبت آئی۔ معمولی بازکے شکار سے جو بعد کو کھیلا گیا یہ شکار بالکل مختلف اور خارج از عقل و قیاس تھا۔ ان سکھائے۔ سدھائے ہوئے جانوروں سے ایسے ایسے کام لیے گئے تھے جو اُنکی سمجھ سے بہت بعید معلوم ہوتے تھے۔ ان بازوں کو شکار ایک خاص طور پر سکھایا گیا تھا۔ یعنی پہلے تو ہزارہا جانوروں کو دانہ وغیرہ ڈالکے لوگ جھیل کے کنارے پر مجتمع کرتے تھے۔ اُسوقت چار پانچ باز چھوڑے جاتے تھے۔ بندوقیں لیکر ہم میں سے کچھ لوگ تو جھیل پر آکے کھلے میدان میں کھڑے ہوجاتے تھے۔ اور کچھ لوگ کشتیوں پر بیٹھتے۔ کبھی مخفی گوشوں میں کشتیاں دوڑاتے۔ اسی اثنا میں ہزارہا جانور پانی سے اُڑ کر ہوا میں بلند ہوجاتا۔ اور باز تلے اوپر سے ان جانوروں کو گھیر گھار کرکے ایک مقام

پر قائم کر لیتے تھے۔ نہ اوپر ہوا میں بلند ہونے دیتے تھے نہ نیچے زمین پر اُترنے۔ اسی حالت میں بیچ ہوا میں ہزارہا جانورونکو ہملوگ اپنی بندوقون کا نشانہ بنا لیتے تھے۔

واقعی یہ ہے کہ سارا سامان عجیب دلچسپ ہوتا تھا۔ ذرا آنکھ بند کرکے تصور کرو کہ اوپر ہوا میں تو سدھائے ہوئے باز ایک چکر باندھے ہوئے ہیں۔ اُنکے نیچے سہمے اور وحشت کھائے ہوئے شکاری جانور ایک دائرے میں محصور ہیں کہ نہ اوپر جا سکتے ہیں نہ نیچے آسکتے۔ گھبرا گھبرا کے کبھی ادھر نکل جانے کا قصد کرتے ہیں کبھی اُدھر۔ اسی اثنا میں ایک دوسرے سے ٹکر بھی کھا جاتے ہیں۔ گتھ بھی جاتے ہیں۔ اور اسپر مستزاد یہ ہے کہ ایک جم غفیر شکاریوں کا۔ جنمیں سے بعض تو جھیل کے کنارے بندوقیں چھپائے کھڑے ہیں اور بعض کشتیوں میں دوڑ لگا رہے ہیں۔

ہمارے اس پڑاؤ میں چار طرف عجیب چہل پہل اور زندہ دلی نظر آتی تھی اور نت نیا سامان دلچسپی پیش نظر رہتا تھا۔ لیکن بادشاہ سلامت کی شگفتہ مزاجی کی وہ کیفیت برقرار نہیں رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ قادر انداز شکاری تو تھے نہیں۔ لہذا۔ اُنکو پورا لطف بھی نہ آتا تھا۔ بلکہ برخلاف اسکے یہ امر بالطبع اُنھیں ناگوار ہوتا تھا۔ کیونکہ درحقیقت یہ بات تھی کہ بحیثیت ایک شکاری کے اُنکی نشانہ بازی کے چنداں وقعت لوگوں کی نگاہوں میں نہ تھی۔

ہم ملازمان خانگی جنکو مسلسل اُنکی حضوری میں حاضر رہنا پڑتا تھا۔ اُنکے تکدر طبع سے سخت پریشان ہوجاتے تھے۔ غرضکہ بادشاہ کی یہ کیفیت دیکھکر سب نے اُنکو ترغیب دی کہ آگے چلکر بڑے شکار میں جی بہلائیں۔

ایسی صورت میں مجھے اس خوشنما جھیل اور اُسکے گرد کے عمدہ لشکر سے جدائی بہت شاق تھی۔ کیونکہ اس مصفا جھیل میں (جسکے کنارے پر گھنے گھنے خوشنما درخت اپنی جھکی ہوئی شاخوں کے عکس سے صفحۂ آب پر عجیب و غریب نقش جمائے ہوئے تھے) کشتیون کا کھینا اور اُنپر سے کبھی تو کنارون پہ کے عظیم الشان لشکر اُسکے مویشیوں اور لشکریوں اور اِردگرد دل بادل خیمون کا نظارہ کرنا اور کبھی اس تمام سامان کا آنکھوں سے اوجھل ہوجانا عجب لطف دیتا تھا پھر کشتی میں بیٹھے ہی بیٹھے کبھی دفعتاً کسی سارس کا پانی میں بیخبر نظر آنا اور کشتی دیکھکر اُسکا بھڑکنا۔ اور اُڑنے پر پر تولنا اور اُسی حالت میں کسی چیرہ دست شکاری کے ہاتھ سے اُسکا نشانہ ہوکر عالم تحیر میں بیجان یا نیمجان ہوکر پانی میں ڈوبکی کھا جانا اور اُسکے پرون کے اُڑنے اور بندوق کے دغنے سے چھوٹے چھوٹے جانورون کے غول کے غول کا غوغا کرکے ہوا میں بلند ہونا۔ اور کبھی اس حالت مین کسی بڑے سے جانور کا (جو مچھلی کے شکار میں مصروف تھا) خود نشانۂ اجل ہوجانا۔ اور کبھی اسی منظر

مین غروب آفتاب کے وقت جو سماں نظر آتا تھا۔ اُس سے زیادہ حسین کیفیت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا یعنے صاف و شفاف چادر آب پر سُرخ سُرخ شفق کا پرتو فگن ہونا اور ڈوبتے ہوے آفتاب کی کرنوںکا گھنے گنجان جنگل کے سر سبز پتّوں پر سُنہری افشاں چھڑکنا۔ اور عین اسی جُھٹ پُٹے کے عالم میں جھیل کے کنارے اور پڑاؤ کے قریب بعض خدا پرست مسلمانوں کا نماز مغرب میں رکوع و سجود۔ قیام و قعود میں مصروف ہونا اور اُنکی ہر حرکت کا پانی میں عکس دکھائی دینا۔ اور ان نمازیوں کے اوپر سُرخی شفق سے نئی بہار نظر آنا۔ کیونکہ انمیں سے بعض تو شاہی بادی گارڈ کی زرق برق وردی۔ اور باآب و تاب اسلحہ سے مزین اور مسلح ہوتے تھے۔ اور بعض اُنسے زیادہ سادے سپاہیانہ ملبوس اور بعض اہل حرفہ معمولی پہناوا پہنے ہوتے تھے۔ اور جب اُنپر شفق کا عکس پڑتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ سب دریاے احمر میں غوطہ مار کے نکلے چلے آتے ہیں۔ اُسوقت جھیل کے کنارے چڑیوں کی چہکار۔ بندروں کی قلقاریاں موقع موقع سے بہت ہی خوشگوار معلوم ہوتی تھیں۔ ہاتھیوں کا کنارے پر خاموش کھڑا رہنا۔ اونٹوں کا کبھی گردن ہلانا کبھی خوشنمائی سے جُگالی کرنا۔ گھوڑوں کا اپنے تھانوں پر دانا کھانا اور ہنہنانا۔ اور چھوٹی چھوٹی چڑیوں یا حشرات الارض کا اپنی آواز سے آسمان سر پر اُٹھا لینا بھی خالی از لطف نہ تھا۔ انھیں حشرات الارض کی چیخم دھاڑ پر یہ کہنا پڑتا ہو کہ "یہی حالت انسانی زندگی کی بھی ہو۔ کائیں کائیں مچانیوالے آدمی دنیا میں کچھ زیادہ فائدہ رسان نہیں ہیں۔ عام طور سے تو جو لوگ زیادہ شور و غوغا مچاتے ہیں وہ کام کی باتیں کم کرتے ہیں"

بادشاہ کو اندرونی حصۂ ملک کا دورہ کرکے شکار کھیلنے پر آمادہ کرنا کوئی دشوار امر نہ تھا۔ کیونکہ صاحب ریزیڈنٹ کے آنے سے پہلے خود اُنکو اپنے پرندوں کے شکار میں ایسا لطف ملا تھا کہ خود اُنھیں نے آگے بڑھکے زیادہ خوفناک جانوروں کے شکار کھیلنے کی جانب اپنی رغبت ظاہر فرمائی تھی۔ اُسوقت ترنگ میں تھے۔ ذکر چھڑا تو بول اُٹھے کہ ہم لکھنؤ جانے سے پیشتر سوَر (بنڈیلے) اور شیر کا شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حسب الحکم جھیل کے کنارے سے خیام شاہی اُکھاڑے گئے اور شمال کیجانب کوچ کا حکم بول دیا گیا۔ کیونکہ اسی جانب بنڈیلے اور شیر وغیرہ کا شکار بکثرت تھا۔ بلحاظ اُس کر و فر اور بھیڑ بھڑکے جو بادشاہ کی ہمراہی میں تھے یہ تو بآسانی سمجھ میں آسکتا ہو کہ قطع منازل بعجلت ممکن نہ تھا۔

سامان شکار میں پالو پارہ سنگھے بھی تھے کہ جو شکار کو چھاپ بیٹھتے تھے۔ باز بھی تھے کیونکہ ابھی باز کے ذریعے سے شکار کھیلنا پھر بھی منظور تھا۔ اور چیتے بھی تھے جو خاصکر ہرن کے شکار کے واسطے تیار کیے گئے تھے یہ سب کٹہروں میں بند گاڑیوں میں لدے چلے جاتے تھے اور انھیں کے ہمراہ اُنکے محافظ بھی تھے شاہی

حرم سرا بھی زمرۂ مسافراں میں تھی۔ جنمیں خاص بیگمات شاہی۔ اور بہت سی نظر کردگان شاہی۔ رنڈیاں ڈومنیاں۔ خواصیں۔ پیش خدمتیں۔ اور پہرہ دارنیاں۔ یہ سب بند سواریوں میں سوار ایک فوج کی فوج تھیں۔ باڈی گارڈ کا رسالہ بھی مغرق نیلگوں وردی سے سجا ہوا ساتھ تھا۔ ہاتھی بھی تھے جنمیں سے بعض خیمے وغیرہ سامان باربرداری لیجاتے تھے۔ اونٹ اور سانڈنیاں بھی تھیں جنمیں سے بعض تو ہرکاروں کی سواری میں تھیں اور بعض باربرداری میں۔ گھوڑے بھی ریل پیل تھے۔ اور ان سب میں ہمارے جلوس کو اضافہ کرنا چاہیے جسمیں ہاتھی گھوڑے اور پالکیاں تھیں۔ اور اب خیال کرنا چاہیے کہ اتنے بڑے لاؤ لشکر کا سفر کرنا کچھ بھی آسان نہ تھا۔ جو کسی طرح یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ صرف سادے طور سے شکار کھیلنے جا رہے ہیں بلکہ یہی خیال ہوتا تھا کہ کوئی ہندوستانی راجہ قہار فوج لیکر کسی ملک پر چڑھائی کرنے چلا ہے اور شاہانہ فوج و سامان سے چلا ہے۔

ہم لوگوں کی رستے میں اس لشکر کا جہاں گزر ہو جاتا تھا بیچارے دہاتیوں پر عذاب نازل ہو جاتا تھا اور وہ از حد پریشان و سراسیمہ نظر آتے تھے۔ کیونکہ اس سے پیشتر کبھی بادشاہ یا اُسکے لشکر کا گزر اس مُلک میں ہوا ہی نہ تھا۔ اور ایک مشرقی بادشاہ کے لشکر کا دورہ غریب رعایا کے حق میں نمونۂ قہر آلہی ہوتا ہے کیونکہ لشکریان شاہی یہ سمجھتے ہیں کہ ہمکو سب طرح کی زیادتی معاف ہے اور رعایا پر دست درازی کرنیکا ایک گونہ استحقاق ہمکو ہے۔ چنانچہ لشکریوں کے ہاتھوں بہت کچھ ظلم زیادتی اور جبر و تعدی غریب رعایا پر ہوتی تھی۔ علاوہ بریں راستے میں اگر کسی قسم کی سختی پیش آتی یا کوئی دشوار گزار راہ صاف کرنا یا جہاں سڑک نہ تھی وہاں سڑک بنانا منظور ہوتا تو بیچارے دیہات کے باشندے زن و مرد۔ بچے بوڑھے۔ سب بیگار میں پکڑ آتے۔ اور جب تک نواب چاہتے ان غریبوں سے مفت کام لیتے۔ بلکہ اگر کام میں ذرا بھی سُستی یا ڈھیل ہوتی اور نواب کی مرضی کے موافق عجلت نہ ہو سکتی تو اُجرت کے عوض مار دھاڑ۔ گالی گلوچ نصیب ہوتا۔ انگلستان کے باشندے غالباً خیال کریں گے کہ یہ ناممکن بات ہے۔ مگر ہندوستان میں جن لوگوں کو دیسی ریاستوں کا کچھ بھی تجربہ ہے تصدیق کرینگے کہ اس معاملے میں میری تحریر لفظاً بلفظ صحیح ہے۔

غرضکہ اس لشکر کا ورود ایک دوسری جھیل کے کنارے جو اُس پہلی جھیل قریب لکھنؤ سے ۴۵ میل کے فاصلے پر تھی ہوا۔ یہ جھیل پہلی جھیل سے طول میں دوچند تھی لیکن صحرائیت میں بدرجہا زائد۔ جوں جوں ہم شمال کیجانب بڑھتے جاتے تھے۔ ہمکو کوہ ہمالیہ کا برفیلا سلسلہ صاف نظر آتا تھا۔ اور اراضی مزروعہ کے درمیان درمیان کوہستانی زمین اور گھنے جنگلوں کے ٹکڑے برابر ملتے تھے۔ کئی میل تک یک لخت سڑک کا کہیں پتہ نہ تھا۔ باستثناء اُس کچے راستے کے جو بعجلت نواب کے حکم سے درست کر لیا گیا تھا۔ اور یہ راستہ سرسبز دھانوں کے کھیتوں۔ گنجان جنگلوں اور بیش بہا مزروعہ اراضی کے درمیان ہو کر نکالا گیا تھا جسکے نکالنے

میں بادشاہ اور اُنکی جمعیت کے آرام وآسایش کا خیال مقدم تھا اور غریب رعایا کی بربادی وتباہی کا خیال مؤخر۔

برطبق انتظام سابق۔ لشکر کا پڑاؤ جھیل سے کچھ فاصلے پر ڈالا گیا - چونکہ صاحب رزیڈنٹ اسمرتبہ ہمارے ساتھ نہ تھے اسوجہ سے صرف اُنکے خیموں کی کمی تھی۔ حسب دستور سابق بادشاہ سلامت بہ نفس نفیس شکار پر مصروف ہوے مگر چونکہ اس جھیل کے کنارے دلدل بہت تھی لہذا اُنکو اسدفعہ کا ایسا لطف حاصل نہ تھا اس جھیل کے نواح میں بگلے اور مرغابیوں کی کثرت تھی لہذا باز کے شکار کی نوبت بھی آئی جسکے شکار میں ہم لوگوں نے کئی روز متواتر لطف اُٹھایا۔ سوا بادشاہ سلامت کے ہم میں سے کسی نے اس طریق سے شکار کو نہ دیکھا تھا۔ جوں ہی باز کو چھوڑتے وہ تیر سا پہلے ہوا پر جاتا۔ پھر شکار کو دیکھکے پہلے آہستہ آہستہ اُسکے گرد گھومتا پھر دفعتاً تیزی کے ساتھ پرند پر حملہ کرتا اور فوراً اُس سے اوپر اُڑکر سب طرف سے بھاگنے کی راہ روک کر اسکا منتظر رہتا کہ اُسکو کسی ڈھب سے اوپر سے دبوچ لے۔ بالآخر بجلی کی طرح ایکدفعہ زمین کا رُخ کرکے چلتا۔ اور قضائے مبرم کیطرح جانور کو اپنے پنجوں میں پکڑکے چونچ اور پنجے سے جلد جلد بالکل گھائل کر ڈالتا۔ اور اسی حالت سے پنجوں میں دبائے ہوے گنڈہ قاتل ومقتول زمین پر آگرتے - یہ سب تماشہ واقعی قابل دید تھا اور ایک مرتبہ دیکھکے عمر بھر انسان بھول نہیں سکتا۔ جسوقت ہم لوگ دیکھتے تھے کہ اب باز نے شکار کو دبوچ لیا ہے ہم لوگ فوراً اُسکے تعاقب میں گھوڑے دوڑاتے کہ دیکھیں کس مقام پر شکار لیئے گرتا ہے۔ اس تماشے کے دیکھنے کو بڑے بڑے مسن لوگ انتہائے شوق میں بے سروپا بلا لحاظ اپنی قوت اور راستے کی ابتری خرابی کے دوڑتے تھے - تماشے کے اشتیاق میں وہ اسطرح بے تحاشہ بھاگتے تھے جیسے پیچھے سے کوئی غنیم آرہا ہے۔ ہر شخص کی یہی فکر ہوتی تھی کہ میں سب سے پہلے باز کے معہ شکار گرنے کا تماشہ دیکھوں۔ بازدار بڑی ہوشیاری سے جان جاتے تھے کہ اس جنگ میں باز کے کہاں کہاں زخم لگے ہیں - اور یہ بڑا دلچسپ مضمون ہوتا تھا کہ باز بلا لحاظ اپنی چوٹ یا زخموں کی تکلیف کے کمال اشتیاق سے منتظر رہتا تھا کہ شکار میں جسقدر حصہ اُسکا ہے وہ اُسے فوراً ملجائے۔

چونکہ بادشاہ شہسوار بہت اچھے تھے اسوجہ سے اس شکار کے تعاقب میں اُنھیں خاص حظ حاصل ہوتا تھا۔ معمولاً بادشاہ کے بڑے خیمے میں روزانہ بعد شکار ہم لوگ کھانا کھاتے - کھانے پر ہر قسم کا سامان جو لکھنؤ میں ہوتا تھا بدستور مہیا رہتا - صرف شراب کے اعتدال سے نہ پینے کی بندش لگی تھی - اور کھانے میں بھی مزا ملتا تھا۔ طرح طرح کے الوان نعمت - بڑے بڑے شمعدان - بیش بہا ظروف چینی و نقرئی - شاہی خواصیں اور پیشخدمتیں - مور کے پنکھوں سے مصروف مگس رانی - ارباب نشاط سرگرم رقص وسرود - یہ سب

جنگل کو منگل بنائے ہوتا تھا اور ہرگز قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہم لوگ ایسے کسی مقام پر ہیں جو لکھنؤ سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے اور جسکے ارد گرد بالکل جنگل ہی جنگل ہے۔

چونکہ اس جنگل میں بندیلے سور اور شیر نہ تھے اسلیے ہمکو ان موذی جانوروں کے شکار کی چاٹ میں آگے شمالی حصہ ملک میں جانا پڑا۔ اس جنگل میں ہرن البتہ بہت تھے۔ لہذا یہ تجویز کیا گیا کہ ہم لوگ تین طریقوں سے شکار کھیلیں۔ یعنی اول سدھائے ہوے بارہ سنگھوں کے ذریعے سے۔ دوم چیتوں کے ذریعے سے سوم خود گھوڑے پر سوار یا پیدل ہو کے۔ اور یہی تجویز ہفتہ آیندہ کے شکار کے لیے طے ہو گئی۔ کیونکہ اب بادشاہ سلامت چڑیوں کو بندوق سے مارنے یا باز کے ذریعے سے شکار کرنے سے اکتا گئے تھے۔

اودھ میں جسطرح پالو بارہ سنگھے شکار پر لگائے جاتے ہیں اسکا ذکر تو عمر بھر میں نے کبھی سنا بھی نہیں اور اسیوجہ سے میں اس شکار کی کیفیت زیادہ تفصیل سے لکھونگا۔ باز اور طیور کا شکار تو ساری دنیا میں ہوتا ہے اور قریب قریب اسی طرح ہوتا ہے۔ لیکن پالو بارہ سنگھے ہم لوگوں کے واسطے بالکل نئے انوکھے تھے۔ اس شکار کی غرض سے جب ہم لوگ اس جھیل کے نواح میں چلے جہاں ہمارا پڑاو تھا تو ایک کھلے میدان میں اُتر پڑے جسکے برابر ہی ایک جنگل تھا۔ یہاں ہم بآسانی اپنے مقصد کو پہونچ سکتے تھے۔ کیونکہ اس جنگل میں مُلک اودھ کے چھوٹی قسم کے جانور بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہر طرح کے بے ضرر اور بے خطر شکار اور انجملہ ہرن بھی بکثرت تھے۔ بڑے بڑے کالے۔ آدھ سو دو ہنکوے اس جنگل میں اس غرض سے بھیجے گئے تھے کہ وہ ہرنوں کے غول جنگلی سربراہی نر ہرن کرتے ہوں بغیر شور و غل مچائے اور انکو منتشر و خوف زدہ کرنے کے اُس رُخ پر جو کھلے میدان کیجانب تھا ہنکا لائیں۔ یہاں یہ غول کے غول اپنے بیجا قومی اور جنگجو عاشقین یعنے نر ہرنوں کے زیر پناہ جمع تھے۔ لشکر شاہی میں جو نر بارہ سنگھے سکھلائے سدھائے موجود تھے۔ وہ چھوڑ دیے گئے اور اپنے چھوڑے جانے کے مقصد سے بخوبی آگاہ ہونیکے سبب وہ جنگل میں کنارے کنارے سبک خرامی سے جانے لگے۔ ہرنوں کے گلے کے نگہبانوں (یعنے نر ہرنوں) کی نگاہ جو نہیں ان پر پڑی اور انمیں سے جو زیادہ دلیر تھے اُنھوں نے سبقت کی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سبقت از راہ اخلاق و تواضع تھی یا اپنی چراگاہ میں اپنے حریفوں کو دیکھکر مقابلے کا خیال جوش زن ہوا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد فریقین میں گتھم گتھا ہو گئی اور بڑی بے جگری سے جنگل کے ہرن اور کٹہروں میں تعلیم پائے ہوے بارہ سنگھے فریق بکلہ۔ شاخ بہ شاخ۔ دست بدست ہو کر زور لگانے لگے۔ بارہ سنگھے (جنکا ہر فرد اپنے حریف ہرن کی بہ نسبت بھاری تھا) بڑی شہ زوری کے ساتھ مقابل ہو گیا اور اپنے حریف کے بے تکان ٹکروں سے [illegible] بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس وقت ہم لوگ کھلے میدان کیطرف گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑائی کی سیر دیکھنے کو آگے

ہوے۔ ہمکو دیکھتے ہی اور جتنے ہرن تھے سب رفو چکر ہوگئے۔ فقط لڑنے والے برابر میدان میں اڑے رہے۔

اسی اثنا میں ایک گروہ دیسی شکاریوں کا (جو اسی مقصد کیواسطے بھیجے گئے تھے) آہستہ آہستہ ہرنوں کے قریب پہونچگیا۔ اور اُنکے اور جنگل کے درمیان حائل ہوگیا۔ اُنکے اس منشا کا ہمکو اُسوقت کچھ علم نہ تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر ہوتا تو ہم اُنکی مداخلت کو ہرگز روا نہ رکھتے۔ بالآخر ان لوگوں نے سامنے کی طرف سے جنگلی نر ہرنوں کی راہ روک لی اور وہ ابھی تک بے خبر مصروف جنگ تھے۔ اب وہ لوگ چھپے سے چپکے چپکے اُنکے قریب پہونچے اور اپنے بڑے بڑے چاقوؤں سے اُنکے بدنوں کو گھائل کرنے لگے جسکی وجہ سے یہ غریب و لاچار جانور تھرتھرانے اور بہت ہی بیکسی کے ساتھ زمین پر لڑکھڑانے لگے اور پالو بارہ سنگھوں نے پیچھے سے دھکا پیل کرکے اُنکو چاروں شانے چت زمین پر گرا دیا۔ یہ حالت دیکھکر ان غریب بے زبانونپر ہملوگوں کو ترس آیا۔ کیونکہ ایک مرتبہ زمین پر گر کے وہ پھر اُٹھنے کے قابل ہی نہ رہتے تھے۔ جب یہ جانور گر چکے تو بارہ سنگھے واپس بلائے گئے۔ وہ تو اپنا کام کر چکے تھے محافظوں کی آواز اور اشارے پر کتوں کی طرح سر جھکائے چلے آئے۔ اور کسی نے بھی اپنے شکار کی طرف رُخ نہ کیا۔ اُنمیں سے بعض کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُنکے سینونپر کاری زخم لگے ہیں اور جو فتح اُنکو حاصل ہوئی ہی وہ آسانی سے ہلکے داموں نہیں حاصل ہوئی ہی۔

گھوڑونپر سوار ہو کر ہمنے دیکھا کہ یہ فتحمند بارہ سنگھے نشۂ فتحمندی میں مخمور اینڈتے بڑھتے اور بڑی تمکنت کے ساتھ اپنے سینگوں کو بل دیتے۔ زمین پر کبھی کبھی سبزے پر منہ مارتے بہت ہی خوشی کے ساتھ آگے چلے جاتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی انمیں لڑنے کا بہت کچھ دم دعوے باقی ہی۔ بلکہ ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کہیں اس جوش میں باہم خود ہی گتھ نہ جائیں۔ اسکے ساتھ ہی اُن غریب جانوروں کی حالت البتہ لائق رحم تھی جو زمین پر بے دست و پا پڑے ہوے تھے۔ اُنکو نہ اب طرارے یاد رہے تھے نہ زقندیں۔ نہ اُنمیں یہ سکت تھی کہ اپنے سینگوں کو بل دیں اور تمکنت کی شانیں اپنی اکڑوں سے ظاہر کریں۔ اُنکی مایوسی و حرماں نصیبی کی تصویر اُنکی حسرت آمیز نگاہوں سے معلوم ہوتی تھی۔ اور جنگ سے معذوری نیمجانی یا جانکنی اُنکی پتھرائی آنکھوں کے ڈھیلوں سے ہویدا تھی۔ اُنکی صورتیں کہے دیتی تھیں کہ وہ ہماری اس ناجائز فتح اور بزدلانہ کارروائی پر نفرین کرتے تھے کیونکہ ہمارے حرکات سراسر مظالم پر مبنی تھے۔

انگلستان میں مجھے کبھی خرگوش کے شکار میں (جہاں ہزارہا انسان اور خونخوار کتوں کا لشکر جمع ہوکے اُسکے پیچھے دوڑتا ہی۔ اور خونخوار کتّے کمال بیرحمی سے اُس غریب جانور کو پرخچے پرخچے کر ڈالتے ہیں

کبھی اتنا قلق نہیں معلوم ہوا جیسا کہ اس شکار کے موقع پر بیخطا بے قصور ان بڑی بڑی آنکھوں والے بیزبان جانورونکی زار حالت پر اور اُنکی بیکسی کی نگاہوں پر۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ اودھ مین جس قسم کا شکار ہوتا ہو اُسکی سختی کا مین متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور بے اختیار میرا دل دُکھتا تھا۔ بادشاہ سلامت کے اشارہ فرماتے ہی ان غریب جانوروں کے سر تن سے جُدا کر دیے گئے کیونکہ ایسے زخمون سے چور ہونیکی حالت مین اُنکو کشاں کشاں لیجانا بڑی ہی بیرحمی تھی۔ اُنکے حق میں سلوک یہی تھا کہ ایکبار مین زندگی کی کلفتون سے آزاد کر دیے جائین۔

ان پالو بارہ سنگھوں کے سکھانے کا صرف یہی منشاء نہ تھا بلکہ مجھے معلوم ہوا کہ اگر حکم دیا جاتا تو یہ اپنے مخالفوں کو بلا ضرر زندہ گرفتار کرا سکتے تھے۔ اسطور پر کہ عین حالت معروفی جنگ مین دو آدمی مضبوط رسیوں کے پھندے بنا کر راہ میں ڈالدیتے اور پالو بارہ سنگھے پیچھے سے جنگلی ہرنون کو ڈھکیلتے اور شکاری لوگ چالاکی سے اُنکو گرفتار دام کر لیتے۔ اُنکی گردنوں میں بھی پھندے پڑ جاتے۔ وہ جھجک جاتے اور پھر ذرا سے اشارے میں پھندے گلو میں پھنس جاتے۔ بیشک اسمین یہ احتمال ضرور تھا کہ اگر وہ ایسی حالت مین گھوم کر اور ذرا سیدھے ہو کے حملہ کرتے تو قریب کے ایک آدھ آدمی کی جان بھی جاتی۔ علاوہ اسکے اس طریق شکار میں یہ بھی دقت آ پڑتی ہو کہ کہین ایسا نہو پالو بارہ سنگھے کے سینگ میں پھندا پھنس جائے اور چاہ کندہ را چاہ درپیش کا مضمون ہو جائے۔ اسلیے یہ کرتے ہیں کہ جب تک دونوں کلہ بکلہ۔ شاخ بشاخ لڑتے ہین اُسوقت تک پھندے نہیں ڈالتے۔ بلکہ ایسے موقع پر کہ جب دونوں جانور دم لینے کیواسطے ایکدوسرے سے تھوڑے عرصہ کیلیے علحدہ ہو جاتے ہیں اُسوقت پھندے ڈالے جاتے ہیں۔

ایک روز ہرن کے شکار کے واسطے پالو چیتے چھوڑے گئے۔ چونکہ اب یورپ کے اکثر ملکون کے زندہ جانوروں کے عجائب خانوں میں چیتے اکثر دکھلائی دیتے ہیں لہذا اُنکی صورت اور حلیہ کے تفصیل بیان کرنیکی چنداں ضرورت نہیں ہو۔ چیتے اور معمولی تیندوے کی شکل میں یہ فرق ہو کہ چیتے کے سر کی ساخت مختلف ہو یعنی اسکا سر پہ نما اور چھوٹا ہوتا ہو اور اُسکی کھال پر ہلکے سیاہ رنگ کی دھاریان دور دور ہوتی ہیں۔ اور قد میں اور نیز قوت میں معمولی تیندوے سے چیتا زیادہ ہوتا ہو۔ میں نے ملک سیلون میں سنا ہو کہ بھوک کے تاؤ میں شکار کی تلاش میں وہ جنگلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔ اور بوڑھے مردوں۔ عورتوں یا بچوں کو اُٹھا لیجاتے ہیں۔ سیلون کے لوگوں کی زبانی یورپ کے سیاحوں اور مورخوں نے جو حیرت انگیز قصص و روایات تحریر کیے ہین اُنمین بلحاظ چیتون کی قوت اور قد و قامت کے شک نہیں کیا جا سکتا اگرچہ شمالی ہندوستان مین ایسے واقعات گوش گزار نہیں ہوے کیونکہ یہان مردم خواری اکثر شیرونکے حصے مین

ہوتی ہے۔

کہنے سے شکار کے پاس چیتے کا لیجانا کوئی آسان بات نہیں ہے چیتے کے پالنے والے اُسکے گلا میں کتوں کی طرح زنجیریں ڈالکے پیچھے ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ خوشی خوشی چلا جاتا ہے۔ لیکن جہاں کسی چیز پر اُس کی نظر پڑی یا جنگل کی طرف سے کوئی آواز اُسکے کان میں آئی یا زمین میں سے کسی قسم کی بو دماغ میں پہونچی بس وہ ٹھٹک ٹھٹک کر چلنے اور سر اُٹھا اُٹھا کر بھونچکے پن سے ادھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے۔ پھر چند ہی منٹ بعد وہ بالکل بیقابو ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر اُسکو رام کرنے کیلیے اُسکا محافظ اپنے بائیں ہاتھ میں ایک ناریل یا نارنگ لیے رہتا ہے۔ جسمیں لکڑی کا دستہ لگا ہوتا ہے۔ فوراً وہ ناریل کو چیتے کی ناک کے قریب لیجا کر اُسکو چٹاتا ہے اور نمک کے اثر سے وہ بو جو اُسکے دماغ میں سرایت کیے ہوتی ہے دفع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ سیدھی چال آگے بڑھتا ہے۔ اس اثنا میں جتنی مرتبہ علامات وحشت نظر آتے ہیں اُتنی بار یہی تدبیر کیجاتی ہے۔ اور ہر مرتبہ چیتا دھیما ہو کر قابو میں آجاتا ہے۔ جب چیتا اور اُسکا محافظ نظر بچا کے شکار سے بہت ہی تھوڑے فاصلے پر پہونچ جاتے ہیں اُسوقت چیتے کی اُچھل پھاند اور بیتابی لائق دید ہوتی ہے۔ اُدھر چیتے کو دیکھکر ہرن اپنی جان بچانیکے واسطے بے تحاشہ چوکڑی بھرنے لگتا ہے۔ اُسوقت اونچ نیچ۔ کھائی۔ خندق وہ کچھ نہیں دیکھتا۔ اور بڑے زور کے ساتھ فراٹے بھرتا۔ لانگتا پھاندتا دوڑتا ہے۔ یہ دیکھکے چیتے کا خون بھی کھولنے لگتا ہے کیونکہ ہرن اُسکا قدرتی شکار ہے۔ اور اب وہ بے اختیار ہو کر زقندیں بھرتا اور اُچکتا ہوا دوڑتا ہے۔ اور بلا خیال کسی روک ٹوک کے بلی کیطرح کبھی درختوں کی ڈالیوں پر چڑھکے پھاندتا ہے۔ کبھی پانی میں جا پڑتا ہے۔ غرضکہ کسی صورت سے اپنے شکار کو بھاگ بچنے کا موقع نہیں دیتا۔ یہ ساری کیفیت بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جسے انسان ایکدفعہ دیکھکے کبھی اپنے صفحۂ دل سے مٹا نہیں سکتا۔ ایسے موقع پر جو سوار لوگ اُسکے پیچھے دوڑتے ہیں اُنکی کارگزاری بھی کوئی آسان امر نہیں۔ باوجودیکہ ہزارہا کوششیں کیگئیں کہ بادشاہ بآسانی اس شکار کا تماشہ ملاحظہ فرمائیں اور باوجودیکہ راستے ہر طرح صاف کر دیے گئے تھے اور شکار کی سیر دیکھنے کیواسطے معقول موقع بھی تلاش کر لیا گیا تھا پھر بھی نظر جمائے رہنا آسان نہ تھا۔ ہم لوگوں کی سواری میں نہایت تیز اور چھلاندار گھوڑے دیے گئے تھے کہ جو نہایت ہوشیاری اور تیزروی کے ساتھ شکار کا تعاقب کر سکتے اور کبھی ہرن کی چوکڑی پر کبھی چیتے کی زقند پر نگاہ رکھتے تھے۔ اسپر بھی اُنکا رتیلی زمین دلدل اور جھاڑیوں میں آسانی سے گزرنا ممکن نہ تھا۔ چونکہ کوئی شاہی سڑک شکار کا تماشہ دیکھنے کیواسطے پہلے سے بنائی نہیں گئی تھی اسوجہ سے بادشاہ اور اُنکے ہمراہی اس راستے سے خوش نہ تھے۔ بجز ان ہمراہی افسران وغیرہ ہم لوگ حتی المقدور ایک ساتھ گھوڑے دوڑائے چلے جاتے تھے۔ کیونکہ یہ کسی کی تاب و طاقت نہ تھی کہ بادشاہ کے آگے گھوڑا نکال لیجاسکے

راہ میں کبھی تو ایک بے ہنگم بدقوارہ سوکھا نالہ پھاندنا۔ کبھی وہ بھی لانبی گھانس میں اُلجھنا پڑتا تھا۔ جسپر بدشواری گھوڑوں کے قدم جم سکتے تھے۔ لیکن تاہم ہم لوگ بدحواس اور پریشان خاک پھانکتے آگے بڑھے چلے جاتے تھے۔ باوجود ان تمام دشواریوں کے معلوم ہوتا تھا کہ چیتا گویا ہوا میں اُڑا چلا جاتا ہے اور زمین پر قدم تک نہیں جماتا۔ چلتے چلتے ایک موقع پر کھلے میدان میں ایک ایسی جگہ پر گز بھر اونچا چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا جنگل چلا گیا تھا۔ اسپر سے گھوڑے بلاخوف و خطر داہنی بائیں موقع موقع سے فراٹے بھرتے چلے جاتے تھے کہ جنگل بپاؤں رسید۔ اب بیچارہ ہرن اپنی چوکڑی بھول چکا تھا اور جنگل سامنے نظر آ رہا تھا۔ اگر اسمیں اتنا بھی دم باقی ہوتا کہ وہ جنگل تک پہونچ سکے۔ تو اس گنجان جنگل میں کسی طرح ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکتا تھا اور شکار کا خاتمہ ہی ہو جاتا۔ مگر وہ بیچارہ اتنی دوڑ دھوپ سے اتنا خستہ و مضمحل اور اپنے خونخوار دشمن کے سخت تعاقب سے خوف زدہ ہوکر اسقدر حواس باختہ تھا کہ وہ سیدھا ایک جھاڑی میں یہ سمجھکے کہ جنگل یہیں سے شروع ہو قلانچ مار کے ہو رہا۔ لیکن پہونچتے ہی پہونچتے اُسکے سینگ دفعتاً جھاڑی کی بیل میں اُلجھ گئے۔ اور جیسے ہی اُسنے گردن پھیر کے اپنی غلطی پائی چیتے نے اُسے دبوچ لیا اور جھاپ بیٹھا۔

اسپر بادشاہ سلامت بہت ہی محظوظ ہوے۔ کیونکہ حضرت سلامت عین اُسکے دم مرگ پہونچ چکے تھے۔ چونکہ وہ ہم لوگوں سے لومڑی کی پونچھ کی کیفیت اور اُس اشتیاق کا حال سُن چکے تھے جو شکاریوں کو اُسکے حاصل کرنے کی بابت ہوتی ہے لہذا اُنھوں نے فوراً ہی بڑھکے ہرن کی دُم کاٹ کر اپنی شکاری ٹوپی میں لگائی۔

* * *

باب چہارم

جواب ترکی بہ ترکی

اس شکار کے وقت ہملوگ موضع مصرکھ کے شمال جانب چند میل کے فاصلے سے دریاے گومتی اور اُسکی شاخ کٹھنی ندی کے درمیان خیمہ زن ہوے تھے ۔

ایک بار کسی خاص ضرورت سے ۔ خوب یاد نہیں ۔ ہرن کی تلاش میں یا چیتے کے تعاقب میں ۔ نہیں معلوم کس وجہسے ہملوگ کیمپ سے بہت دور پہونچگئے ۔ اور چلتے چلتے ہمارا گزر ایک چھوٹے سے مجراے آب پر ہوا جسکے کناروں پر سفید سفید چمکدار بالو بکثرت تھی ۔ مزے میں بیحد شور اور ظاہر صورت میں باریک پسے ہوے شورے یا نوسادر کی ایسی ۔

ہندوستان کے ماہران حقائق ارضی اور محققان طبقات الارض اس ذخیرۂ ریگ کے عجیب وغریب حالات اور فوائد بیان کرتے ہیں ۔ اور اُنمیں باخود بہت کچھ اختلاف آرا اور قیل وقال ہو چکی ہے ۔ چونکہ مجھے علم طبعیات میں دخل نہیں ہے لہذا میں صرف اپنے مشاہدے کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں اور جو کچھ میں نے اپنے حواسوں سے محسوس کیا ہے اُسی کو تسلیم کر کے قلمبند کرتا ہوں ۔ اسی بنا پر وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ یہ صرف معمولی صاف ریگ ہے اور اسیطرح کی ہے جیسے ساحل سمندر پر کبھی کبھی پائی جاتی ہے ۔ البتہ رنگت مین ذرا زیادہ سفید ہے ۔ میرے نزدیک وہ لوگ مجھے ایسی بات باور کرانا چاہتے ہین کہ جسکو مجھے خوب یاد ہے کہ میری عقل نے اُسوقت تسلیم نہین کیا تھا جب مین نے اپنی آنکھ سے اُسے دیکھا تھا ۔

اس جھیل یا مجراے آب کا پانی مزے مین بہت کھاری تھا ۔ اور جسوقت ہملوگ اس شان سے ادھر آئے کہ پہلے ذرا تیزی کے ساتھ اور پھر آہستہ آہستہ اُسیوقت لکہ ہاے خاک ہوا پر بلند ہوے اور سب طرف چھا گئے ۔ یہ معلوم ہوا کہ جیسے یہ ریگ ہوا سے بھی ثقل مین زیادہ نہین ۔

خوش قسمتی سے اُسوقت ہوا تیز و تند نہ تھی ۔ ورنہ ہملوگ بالکل آنکھوں سے معذور ہی ہو جاتے باایں ہمہ جسقدر گرد اڑی تھی اُسکا اتنا اثر ہوا کہ آنکھ ۔ کان اور ناک میں بہت کچھ سما گئی ۔ اور اگرچہ دیکھنے مین یہ ذرے بہت ہی چھوٹے چھوٹے باریک تھے ۔ تاہم ہر ذرہ آنکھ ۔ کان میں گھسکر ایسا چبھتا تھا جیسے تمام جسم میں چونٹیاں لگ گئیں ۔ ہمارے گھوڑوں پر بھی یہی اثر ہوا تھا ۔ وہ بار بار زور زور سے کھانستے کھنکھارتے تھے کہ شورے کے اثر سے نجات پائین ۔ اور بار بار پانی کی طرف پلٹنا چاہتے تھے حالانکہ وہ نہایت شور اور بدمزہ تھا ۔

اس واقعے سے گویا ہمارے شکار کے خاتمے کی بنیاد پڑ گئی۔ کیونکہ اسکا اثر بادشاہ سلامت کی آنکھ ناک پر بھی ویسا ہی پڑا تھا۔ جیسا ہملوگوں پر۔ اور اس موقع پر نہایت غم و غصہ کیحالت میں اُنکی زبان سے کلمات نا ملائم اُردو اور انگریزی دونوں زبانونمیں نکل رہے تھے۔ ہماری جماعت کے ایک صاحب جو ماہر حقائق ارضی تھے کہنے لگے کہ پردۂ دنیا پر ایسے عجائبات کم نظر آتے ہیں اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ ایسے موقع پر ہمارا گزر ہو گیا جسکے معائنے و مشاہدے کیواسطے دانایان یورپ بہت کچھ لہو پانی ایک کرتے اور ہزاروں منزلوں کا سفر اختیار کرتے ہیں:۔ بیشک اُنکی اس بات نے اُسوقت ہملوگوں کو تھوڑا بہت مزا ضرور دیا۔ مگر اسوقت تو سب کا حال یہ تھا کہ کھانستے۔ کھنکھارتے۔ چھینکیں لیتے اور آنکھیں ملتے چلے جا رہے تھے۔ باوجودیکہ ہم میں سے اکثروں نے جیسے ہی اس خاک کا اثر محسوس کیا فوراً اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مگر پھر بھی یہ ریزے بند پلکوں کے اندر بھی اپنی رسائی پیدا کرتے۔ آنکھوں میں سمائے جاتے تھے اور ہملوگوں کو بڑا اندیشہ اسبات کا تھا کہ کہیں ہمارے گھوڑے اندھے نہو جائیں۔

بعض دانشمند لوگ بلا تامل یہ پوچھ بیٹھیں گے کہ "کیوں حضرت۔ اس بالو کی دلدل میں پھنستے ہی آپ لوگوں نے پیچھے پلٹ جانیکا ارادہ کیوں نہ کیا۔ اور آخر۔ آگے کیوں بڑھتے چلے گئے"؟ لیکن مندرجۂ بالا بیان پر غور کرنے سے اُنکو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت ہملوگونکو نہ تو اس سرزمین سے کوئی اُنس یا لگاؤ تھا۔ نہ حقائق ارضی کے تجسس کا ایسا ذوق کہ ہونگا کے شہیدونمیں داخل ہونیکے واسطے ہملوگ اپنے ہاتھوں آفت میں مبتلا ہوتے بلکہ برخلاف اسکے ہملوگوں کی ہر لحظہ یہ تمنا تھی کہ کسی طرح جلد اس بلا سے نجات پائیں لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ کیونکہ اس ریگستان میں ہملوگ دفعتہً نہیں پہونچے تھے۔ بلکہ پہلے تو کسیکو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں سے ریگستان شروع ہوا اور کہاں جا کے ختم ہوگا۔ رفتہ رفتہ کر کے ہملوگ اس بلا میں یوں گھر گئے تھے کہ پہلے تو جا بجا کچھ ٹیکریاں ریت کی ملیں۔ اور کسی مقام پر تو اُنمیں کچھ مٹی بھی ملی ہوئی تھی اور کسی جگہ یہ حالت نظر آتی تھی جیسے کہگِل کیا ہو کہ اُسکی روک سے ریگ دبی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے تھوڑی دور آگے بڑھکے دفعتہً اس ریگستانمیں پہونچے کہ جہاں ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں سے اُڑ اُڑ کے یہ ریت ہوا میں بلند ہوئی اور اُسکے غبار سے ہم از سرتا پا آلودہ ہو گئے۔ اُسوقت جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ پیچھے پھر کے لوٹ جانے سے آگے بڑھنے میں مسافت کم طے کرنا ہوگی۔

اُس روز شام کو جب ہملوگ اپنے اپنے خیمونمیں پہونچ گئے تو حسب معمول خاصے کیوقت شاہی میز پر حاضر ہوے۔ اُسوقت تک بادشاہ سلامت پر اس تکلیف و زحمت کا اثر باقی تھا۔ اور آنکھ ناک میں یہ ریزہ ہاے خاک کھٹک رہے تھے۔ طبع عالی مکدر تھی۔ اور بات چیت بھی بہت اُکھڑی اُکھڑی تھی

اُس شب کو اعلیحضرت ہم لوگوں سے زیادہ مخاطب نہیں ہوئے - خاص تر اشش کا تمسخر - مصاحبین کے کے لطائف وظرائف - ناچ گانے کسی چیز سے غنچۂ خاطر شگفتہ نہ ہوا - اُنکو زیادہ تو غصہ اس بات پر تھا کہ اُنکو پہلے سے اس مصیبت کی خبر کیوں نہ کر دی گئی - ہمارے مہربان ماہر حقائق ارضی نے جسوقت یہ رائے ظاہر کی کہ اس مقام پر ایک بیش بہا کان نکل سکتی ہے تو بادشاہ سلامت نے اسے کسیقدر توجہ کے ساتھ سُن تو لیا مگر اُسپر کچھ التفات نہ فرمایا نہ کوئی حکم دیا - بلکہ وہ اُسیطرح بدمزہ اور بے کیف رہے - اور خلاف معمول ذرا سویرے ہی سے داخل محلسرا ہو گئے اور ہم لوگوں نے بھی جلسہ برخاست کر کے اپنے اپنے خیموں کی راہ لی -

خدا ہی اُس بیچاری نگبخت (عورت) پر رحم کرے جسکی قسمت میں یہ لکھا ہو کہ ایسے وقت میں آ بر افروختہ اور پُر غضب خود مختار بادشاہ کے بد دل یا ناراض کرنیکا سبب ہو - اتفاقاً چھینک دینا - معمول سی ذرا زیادہ آواز سے کھانسنا - کھنکھارنا - بلکہ ذرا سی ہرنا یا بے تکی جنبش عضووں کی بعض اوقات ایسی سنگین سزا دلاتی ہے کہ جسکے خیال سے روح کو وحشت ہوتی ہے اور اگر انگریزی مائیں - بیویاں - بیٹیاں اُسکا حال ہی سُنیں تو کانپ اُٹھیں - لیکن ہندوستان میں ہندوؤں کے زنانخانوں میں ایسے ایسے امور اکثر وقوع ہوتے رہتے ہیں - انگریزی مجسٹریٹ جانتے ہیں کہ اکثر ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں - لیکن وہ تعارض کرنیسے معذور ہیں - زنانخانہ یا حرم کے ساتھ تقدس کا خیال دائر سائر ہے اور اگر وہاں کے مخفی حالات کوئی نا اہل یا لونڈی باندی باہر ظاہر کر دے تو اُسکی سزا نہایت دردناک موت دیجاتی ہے - اور یہ تکلیف و ایذا انہیں عورتوں کے ہاتھوں سے اُسکو پہنچتی ہے جنکے تحفظ یا منفعت کے خیال سے مخفی حالات کا انکشاف کیا گیا تھا - معہ اسی وجہ سے ان مقامات کے حالات بھی پردۂ خفا میں رہتے ہیں - امرا اور دولتمند لوگ تو ایسے موقع پر صرف بے رحمی سے سزائے تعذیری ہی دیدیتے ہیں - البتہ اگر ایسی کسی بات سے بادشاہ کا شعلۂ غیظ و غضب بھڑک اُٹھتا ہے تو اُسکے غیر محدود اور شاہی اختیارات صرف کیے جاتے ہیں - یعنی بلا تامل اور بغیر تحقیق مزید فوراً گردن مارنے کا حکم صادر ہو جاتا ہے - ایک مرتبہ ایک بے تمیز وحشی ہندو راجہ نے اپنے ایک دوست یورپین سالسٹر سے کہا کہ "میری بیوی حاملہ ہے - اگر ابکی بار اُسنے لڑکا نہ پیدا کیا تو بیشک کوڑے مارتے مارتے اُسکی جان ہی لونگا" چندروز بعد اُس رانی کے لڑکی پیدا ہوئی اور سنا گیا کہ دو روز بعد وضع حمل کے اُس کمبخت رانی کی لاش جلا دیگئی - اور زنانخانہ کی چاردیواری سے باہر کسیکو معلوم بھی نہو سکا کہ وہ کیونکر مری - راجہ کی اس دھمکی کا حال کھلا بھی تو بہت دنوں کے بعد - اور وہ بھی اسطرح

---

[1] دربار اودھ میں اگر کوئی ہندوستانی حضوری شاہ میں چھینکنے کے جرم کا مرتکب ہوتا تو اُسکی سزا یہی تھی کہ اُس کی ناک اُڑا دیجائے - یہ وحشیانہ سزا مشرقی دربار میں کچھ نئی نرالی نہیں ہے - مصنف

کہ ایک وصیت نامے کے کالعدم کرینگے واسطے انھیں سالسٹر صاحب کو اسکی ضرورت پڑی کہ راجہ کو بحالت کبرسنی دیوانہ و فاترالعقل ثابت کریں۔ تب یہ راز بھی طشت ازبام ہوا۔

اب تک ہمارے شکار کیواسطے موسمی حالت بہت اچھی تھی۔ لیکن اسی شب کو (یعنے جسروز بہت سی خاک پھانکی تھی) یہ واقعہ ہوا کہ ہملوگ جیسے ہی پلنگ پر اطمینان خاطر کے ساتھ لیٹ کے نیند بلانے لگے دفعۃً بڑی گرج دھمک کے ساتھ موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ اور ہملوگ گھبڑا کے اُٹھ بیٹھے۔ معلوم ہوا کہ موسم برشگال کا پیش خیمہ آگیا۔ بجلی اس تیزی اور تابش سے چمکتی تھی کہ جیسے منطقہ حارہ کے سوا کہیں نہیں نظر آتی۔ ہم پانچوں آدمی اُس بڑے بھاری مربع خیمے میں لیٹے ہوے یہ کیفیت دیکھ رہے تھے کہ کبھی تو بادل کی گرج اس زور سے کانوں میں آتی تھی جیسے ہمارے سروں پر ہے اور شامیانے کی چوبوں کے سرے ہی پر گرج ہو رہی تھی۔ کبھی بجلی کی چمک دمک سے سارا خیمہ منور ہو جاتا تھا۔ اور آسمان پر اُسکا کوڑے کی طرح رہ رہ کے چمک اُٹھنا ہمکو خیمے کے اندر سے نظر آتا تھا۔ حالانکہ ہمارا خیمہ دوپٹا تھا۔ پھر بھی یہ حال تھا کہ گھڑی گھڑی کے بعد ایسی روشنی ہو جاتی تھی کہ خیمے کے اندر کی ایک ایک چیز صاف معلوم ہوتی تھی بلکہ وہ کالے کالے بادل بھی جو آسمان پر چھاے ہوے تھے۔ اور پھر وہی اندھیرا۔ وہی تاریکی۔ وہی ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھنا۔

آدھی رات آگئی۔ جب ذرا بادلونکی گرج کم ہوتی تو ہوا کی سنسناہٹ دیوغرّاں کی طرح سنائی دیتی تھی۔ اور اُسکے زور شور کے تھپیڑونکے سبب ہمارا خیمہ بار بار سربسجود ہوتا۔ چوبیں کبھی ایک طرف جھکتیں تو زمین سے لگ جاتیں کبھی دوسری طرف اُٹھتیں تو اوپر تن جاتیں۔ چوبوں کے ساتھ ہی خیمے کے کپڑے میں بھی ہوا بھر جاتی تھی۔ ہمکو تو یقین ہو گیا تھا کہ دو گھڑی میں خیمہ ضرور گر جائیگا۔ اور چونکہ اب سب لوگ ہوشیار و خبردار ہو چکے تھے۔ اسوجہ سے آپس میں اسی خطرے اندیشے پر گفتگو کر رہے تھے۔ لیکن یہ ہملوگوں کی غلطی تھی۔ ہمارے خدمتگاروں نے پہلے ہی سے یہ بند و بست شروع کر دیا تھا کہ کہیں تو ایک میخ ٹھونکدی۔ کہیں ایک رسّی باندھ دی اور گھیر گھار کے سب طرف سے جکڑبندی کر دی۔ ظاہر ہی کہ ایسے طوفان ابر و باد سے سارے لشکر میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ جب ذرا گرج۔ کڑک کے شور سے فرصت ملتی تھی تو اس وقفہ میں ہمکو گھوڑونکی ہنہناہٹ اونٹوں کا بلبلانا۔ اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔ اور آدمیوں کے شور و غوغا کی آوازیں برابر سنائی دیتی تھیں۔ جب ذرا طوفان کی زورآوریاں کم ہوتیں تو ہملوگ آپس میں کہتے کہ “معلوم ہوتا ہی کہ کچھ جانور چھوٹ گئے ہیں”

خدا خدا کرکے طوفان گھٹا۔ اور شور کم ہو چلا۔ لیکن لشکر میں شور و ہنگامہ بجاے کم ہونیکے اور زیادہ

بلند ہو۔ اور ہملوگوں نے آپس میں یہ کہنا شروع کیا کہ "قرینہ یہی کہتا ہی کہ بہت سے جانور چھوٹ گئے ہیں خدا کرے ایسا نہو کہ ہاتھی خیمے کے قریب آکر رسیوں میں اُلجھ جائیں ایسا ہوا تو خیموں کی خیر نہ ہوگی"

اسی مضمون کی دعا مانگ کے اور اپنے خدمتگاروں کو یہ حکم دیکے کہ ذرا دیکھتے بھالتے رہیں کوئی جانور آکے ہمکو نہ ستائے ہملوگوں نے پھر تہیہ کیا کہ ذرا آرام کرلیں۔

اسوقت آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اور چونکہ ہمارا خیمہ بہت نفیس بنا تھا۔ حتیٰ کہ اُسمیں پانی بہت ہی کم ٹپکا تھا۔ اسلیے ہملوگ مزیسے پاؤں پھیلا کے لیٹے تو نیند کے میٹھے میٹھے جھونکے آنے لگے میں ہنوز نیم خواب تھا۔ یعنے کچھ خفتہ کچھ بیدار۔ اور اس خیال میں مگن تھا کہ ایسے وقت میں جبکہ باہر والے خدا جانے کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ میں اس نرم اور گرم کوچ پر دراز ہوں۔ باانیہمہ جانوروں کی چیخ دھاڑ اور آدمیوں کا غل غپاڑا اور بھی زیادہ ہو رہا تھا۔ اور اسکی وجہ سے سونا مشکل تھا۔ لہذا۔ میں نے اپنے خدمتگار مسمی بخشو سے کہا کہ "بخشو! ذرا باہر جاکے دیکھ تو یہ غل کیسا ہو رہا ہی" بخشو گیا۔ وہ ابھی واپس بھی نہ آیا تھا کہ کسینے دروازے پر سے ایک اور آدمی کو پکارا۔ اور ہمنے یہ سُنا کہ کوئی کہ رہا ہی کہ "جہاں پناہ کا چوبدار کچھ پیام لے کر آیا ہی"

وہ پیام یہ تھا کہ ہم پانچوں آدمیوں میں سے ایک صاحب جو شاہی باڈی گارڈ کے رسالے کے کپتان تھے اُنکی نسبت جہانپناہ کا حکم ہی کہ "فوراً حاضر ہوں" یہ حکم سُنتے ہی ہم سب اُٹھ بیٹھے اور لگے خیال کرنے کہ کوئی ایسا ہی غیر معمولی اور اہم امر پیش آگیا ہی۔ جسکی وجہ سے ایسے طوفان کی حالت میں اور ناوقت کپتان کی طلبی ہوئی ہی۔ چوبدار سے پوچھا تو اُسنے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ کونسی ضرورت درپیش ہی اتنا جانتا ہوں کہ خیام شاہی میں بڑی گڑبڑ مچی ہوئی ہی۔ اور ایک خیمہ ہوا سے گر گیا ہی" ابتو عقل آرائیاں ہونے لگیں "کہیں ایسا تو نہیں ہی کہ نواب وزیر سے جنکے سپرد خیام شاہی کا انتظام تھا۔ بادشاہ سلامت خفا ہوگئے ہوں اور اسکی پاداش میں اُنکی گرفتاری اور "ابھی اسی جگہ قتل" کا حکم دیدیا گیا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہی کہ حرم شاہی میں کوئی خطرناک واردات پیش آگئی ہو۔ اور "کہیں ایسا تو نہیں ہی کہ" لیکن زیادہ عقل آرائی کی کچھ ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہوگا دو گھڑی میں معلوم ہو جائیگا۔

کپتان صاحب کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد میرا خانساماں واپس آیا اور یہ خبر لایا کہ بادشاہ کے ہمراہیوں میں چل کوچ کی تیاریاں سرگرمی سے ہو رہی ہیں۔ مگر یہ تحقیق نہ ہوا کہ کس وجہ سے۔ بلکہ جب اُسنے ایک جمعدار سے وجہ پوچھی تو اُسکے جواب میں اُسنے ایک گُدّا رسید کیا۔

اتنی بات سُننے سے ہملوگوں کا خاک بھی اطمینان نہوا۔ چونکہ پانی ابھی جھاجھم برس رہا تھا اسلیے

ہم میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ خود باہر نکلے اور کچھ تفتیش کرے۔ آخر کار کپتان صاحب واپس آئے۔ اور کہنے لگے۔

”یارو! ہم تو جاتے ہیں۔ تملوگ اپنی جان و مال کی حفاظت کرو۔“

ہم سب لوگ ہمزبان ہو کے بول اُٹھے ”ارے بھئی۔ کہاں؟ کون کون؟“

اُنھوں نے جواب دیا ”جہاں پناہ نے فوراً آدھ گھنٹے میں لکھنؤ کا کوچ بولدیا ہے۔ ہملوگ اور اُنکی کُل فوج معہ محلات شاہی ہمراہ رکاب ہونگے۔ بادشاہ بہت ہی برہم ہیں اور فوراً لکھنؤ جانا مناسب جانتے ہیں دیکھو۔ میں پھر تمسے کہتا ہوں کہ اپنے اسباب کی بخوبی حفاظت کرنا۔ نہیں۔ گنوار لوگ کملی کٹھری کر ڈالینگے۔“ یہ کہکے کپتان صاحب نے جلد جلد اپنا بوریا بدھنا یوں بعجلت سمیٹنا شروع کیا۔ کہ کبھی تو خدمتگار کو حکم دیا کبھی کچھ اسباب اردلی کے سپرد کیا۔ اور لیس ہوگئے۔ اب میں نے اُنسے پوچھا کہ ”کیا واقعی۔ تمکو یہ اندیشہ ہے کہ گانوں والے کچھ دست درازی کریں گے اور ستائیں گے؟“ اسپر اُنھوں نے کہا ”بیشک! اگر جلد تر تم مستعدی کے ساتھ اپنی حفاظت نکروگے۔ ایسا تو اکثر اتفاق ہوا ہے کہ جہاں گنوار دیہاتیوں کو سن گن ملگئی کہ بادشاہ سلامت معہ لاؤ لشکر کوچ کر گئے ہیں اور خالی کچھ ہمراہی اور بھیڑ کے لوگ رہگئے ہیں بس وہ ٹوٹ پڑے۔ اور جو جو سختیاں اور مصیبتیں ملازمان شاہی کے ہاتھوں خود اُٹھا چکے ہیں۔ اُسکی تلافی کرنے لگے۔“

بادشاہ کے ہمراہ ہملوگ جا ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ اول تو ہمارے پاس ملازمان کافی تعداد میں نہ تھے۔ علاوہ اسکے ہماری نسبت بادشاہ سلامت نے یہ حکم دیدیا تھا کہ نواب یعنی وزیر کے ساتھ آئیں اودھ میں پچاس میل کا سفر کرنا ایسا آسان نہیں ہے جیسے یورپ میں عمدہ عمدہ سڑکوں پر سفر کرنا۔ یہ شئے دیگر ہے ہم میں سے ہر ایک کے ہمراہ ایک ہاتھی۔ کسی کے پاس ایک گھوڑا تھا اور کسی کے پاس ایک سے زائد۔ لیکن ہمکو سفر کرنیکے واسطے بند گاڑیاں یا پالکیاں درکار تھیں۔ اور پالکیوں کیواسطے سڑک پر سلسلہ کے ساتھ کہاروں کی ڈاک بٹھانا بھی ضروری تھا۔ پھر یہ لازمی تھا کہ آدمیونکی وجہ سے ہمکو بہت کچھ اسباب پیچھے چھوڑ دینا پڑتا اور جو اسباب ہم یہاں چھوڑ جاتے وہ یقیناً ضائع ہوتا اور ہمارے ہاتھ نہ لگتا۔ کیونکہ اگر دیہاتی لوگوں سے بچ بھی جاتا تو نواب کے ملازمین کے ہاتھوں سے ہرگز نہ بچتا۔ اُنچہ از دزد باقی بود در مال برد۔ کا معاملہ ہوجاتا

ایسی صورت میں بجز اسکے چارۂ کار کیا تھا کہ صبح کے انتظار میں رات کاٹیں۔ اور صبح ہو تو دیکھیں کہ نواب ہمارے لیے کیا بندوبست کرتے ہیں۔ اور کتنے آدمی ہمکو دیتے ہیں۔

بادشاہ سلامت سوار ہوئے۔ سواری بڑھی۔ ہمنے بھی خیمے میں بیٹھے بیٹھے گھوڑوں کی ہنہناہٹ پالکی کے کہاروں کی ”ہو ہنا بابا یاں“ کی آواز۔ ہاتھیوں کی بھاری بھاری پاؤں کی چاپ سن لی۔ رفتہ رفتہ

جسقدر یہ سواری دور ہوتی گئی آوازیں بھی مدھم پڑتی گئیں۔ اور آخرکار سناٹا ہوگیا۔ بادشاہ سلامت کا حکم بھی نادری حکم ہوتا تھا ادھر منہ سے بات نکلی۔ اُدھر فوراً تعمیل ہو۔ اسی وجہ سے سواری چلی تو بس چلی کہیں رکنے تھمنے کا کیا مذکور۔

اب بھی خیمے کے باہر کچھ بوندا باندی ہورہی تھی۔ رات نہایت تیرہ و تار ڈراؤنی اور سنسان تھی۔ خیمے کے اندر ایک چھوٹی سی میز پر بیچ میں لمپ روشن تھا۔ لیکن سرد ہوا کے داب کیوجہ سے ادھر اُدھر کی چیزیں ذرا دھندلی دھندلی نظر آرہی تھیں۔ ہم چاروں آدمی اپنی اپنی چارپائیوں پر اس ترکیب سے لیٹے تھے کہ دو خیمے کے اسطرف اور دو اُسطرف۔ ہماری پالکیاں بھی خیمے کے دروازوں پر لگی ہوئی تھیں۔ البتہ میری پالکی ایک دروازے کے اندر رکھی تھی۔ کپتانصاحب کی بات ہمارے کانون میں پڑی ہوئی تھی۔ اور اُسکی وجہ سے ہلوگوں نے یہ قرارداد کر رکھی تھی کہ ایک ایک گھنٹہ باری باری صبح تک ہم میں سے ایک شخص برابر جاگے۔ اور اپنے سامنے میز پر ایک جوڑی پستول اور ایک تلوار رکھے رہے۔ چنانچہ اس صورت سے ایک صاحب نے (جو آسٹریا کی فوج میں افسر ڈرگیون رہ چکے تھے اُنکی وضع قطع سپاہیانہ تھی اور بڑی بڑی مونچھیں رکھائے تھے) پہلے نوکری دی۔ اور اپنے منہ میں چرٹ دبا کر کرسی پر پہرہ دینے کو جا ڈٹے۔ خیمے کے اندر فرش پر ادھر اُدھر بہت سے ہندوستانی خدمتگار پڑے ہوئے لیکن اُنپر کامل بھروسہ نہیں ہوسکتا تھا۔ علاوہ اسکے ہلوگونکے دل میں اُن دہاتی گنواروں کا بڑا ڈر سمایا ہوا تھا جن غریبوں کو ایک روز قبل یہ لوگ سخت گالیاں دے سکتے بلکہ زدوکوب بھی کرسکتے تھے

ہمارے فوجی محافظ صاحب اس شان سے کرسی پر جلوہ فرما تھے کہ وہ بآسانی دونوں دروازوں کی نگہبانی کرسکتے تھے۔ جب مجھے نیند آرہی تھی تب ہی میں نے اُنکو اس وضع سے دیکھا کہ میز کے نیچے پاؤں پھیلائے۔ آرام کرسی کا تکیہ لگائے۔ اپنے پاجامے کے کمربند میں دونوں ہاتھ ڈالے اور منیلا چرٹ (یہ چرٹ یقیناً بادشاہی ہونگے) مُنہ میں دبائے۔ بڑے بڑے بُقّے دُھویں کے اُڑاتے تنے بیٹھے ہیں یہی دیکھتے دیکھتے میں تو بیخبر سوگیا۔ میری چارپائی بائیں جانب والے دروازے کے قریب بچھی تھی۔ اور ہمارے محافظ صاحب کی پشت اُسی طرف تھی۔ میری چارپائی کے برابر ہی میرا ہندوستانی خدمتگار اپنی چادر میں لپٹا۔ میلے کپڑوں کی گٹھری بنا ہوا پڑا تھا اور مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔ میں سو تو گیا ہی تھا مگر ابھی ذرا ہوشیار تھا کہ میں نے اپنے برابر ہی کسی کے آہستہ رینگنے یا کھسکنے کی آواز سُنی۔ میں نے آنکھیں تو کھولدیں مگر مطلق جنبش نہ کی۔ چُپ چاپ پڑا رہا۔ اور بجائے خود بہت ہوشیار و خبردار ہوگیا اسی حالت میں میں نے دیکھا کہ ایک کالا کالا ہاتھ جیسے زمین سے نمودار ہوا۔ اور میرے قریب ہی

کے گوشے میں ٹین کے صندوق پر جو گٹھری رکھی ہے وہ اُسنے اُٹھالی ہی۔ مجکو پورے طور سے یہ یقین تھا کہ میرے سارے سفید کپڑے جو دُھلے دُھلائے میں لکھنؤ سے لایا تھا وہ اسی گٹھری میں بندھے تھے لہذا مجھے اسمیں کیا تامل ہو سکتا تھا کہ فوراً ایک جست میں اسی ہاتھ کو پا جاؤں اور پکڑ لوں لیکن جب تک میرا ہاتھ پڑے پڑے ایک شخص اُچک کے بھاگا۔ اور ہاتھ میں گٹھری لیکے بھاگا۔ ہمارے فوجی محافظ صاحب نے میری آواز سُنتے ہی فوراً اپنے پستول پر ہاتھ ڈالا۔ اور میری ہی طرف پورا نشانہ تاکا۔ کیونکہ میں ذرا دیر کیواسطے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اپنی کوچ اور دروازے کے درمیانی فصل کو دیکھ رہا تھا۔ اس خیال سے کہ چور ابھی دروازے سے باہر نہ نکلا ہوگا۔ یہ سب ایک گھڑی بھر کا کام تھا۔ اب ہمارے محافظ صاحب پستول ہاتھ میں لیکے آگے بڑھے۔ اسی مابین میں چور چُھپکے چُھپکے سانپ کیطرح رینگتا ہوا میری کوچ کے نیچے آیا۔ اور جو دروازہ قریب تر تھا اُسی طرف زقند بھر کے چلا۔ غالباً اسی دروازے سے وہ آیا بھی تھا۔

اسی عرصے میں سب لوگ جاگ پڑے۔ پوچھ کچھ ہونے لگی۔ غل مچا۔ چور کی ڈھنڈھیا شروع ہوئی۔ میری پالکی جو دروازے کے اندر رکھی ہوئی تھی اُسکے پٹ کُھلے تھے۔ چور نے یہ خیال کرکے کہ اسکے اندر ہوکے دروازے سے باہر نکلنا چاہیے اُدھر زقند بھری۔ فوراً ہی ہمارے محافظ صاحب نے اُسپر پستول کا فیر کیا۔ میں نے بھی تلوار لیکے جب پلٹا ہوں تو چور کی پالکی میں جاتے وقت جھلکی دیکھی۔ پالکی کے اندر میرا ایک نوکر پڑا سو رہا تھا۔ جیسے ہی چور اُسکے اوپر گرا وہ اُچھلکر چور کے ساتھ ہی پالکی سے باہر آیا اور خیمے کے دروازے کے سامنے کیچڑ پانی میں لوٹ لگانے لگا۔ وہ یہی سمجھا کہ بندوق مجھی پر دغی ہی۔ اُسکے ساتھ ہی چور بھی کیچڑ پانی میں گڈ مڈ ہو گیا۔ دونوں یہی سمجھتے رہے کہ نشانہ ہم ہی ہیں۔ بہر حال چور نے تو جیسے بنا اپنا پیچھا چھڑایا۔ اور اپنی جان بچا کے بھاگا۔ اور میرے خدمتگار کو کیچڑ میں لت پت چھوڑ گیا۔ اُسی کے ساتھ میرے دُھلے دُھلائے سفید کپڑوں کو (کہ جو اَب ذرا سفید نہ رہے تھے) ایک گڈھے میں ڈبویا چھوڑ گیا۔

جن لوگوں نے کبھی منطقہ حارہ کے کسی ملک میں سفر نہیں کیا ہی۔ اُنھیں کیا قدر اور وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بھی کوئی مصیبت تھی جو مجھپر پڑی تھی۔ اگر اُنکو ذرا بھی اُس راحت کا اندازہ ہوتا جو سفید کپڑوں کی تبدیلی سے ہوتی ہی۔ یا اُس تکلیف کو کبھی جھیلا ہوتا جو سفید کپڑوں کے نہ ہونیکے پہونچتی ہی۔ خصوص ایسے ملک میں جہاں آلۂ مقیاس الحرارت میں پارہ ۸۵۔ اور ۹۰ درجوں پر چڑھا ہوتا ہی گھنے گنجان جنگل میں سب طرف سے ہوا رُکی ہوتی ہی۔ تن بدن سے دھواں نکلتا ہی۔ زمین تپتی ہی۔ درختوں سے آگ نکلتی ہی تھی۔ گھوڑے اور باربرداری کے جانور سب پسینے پسینے رہتے ہیں تو یقیناً وہ مجھسے ہمدردی کرتے۔

پہلے پہل یہ گٹھری میرے خانساماں نے پائی۔ اُسنے میرے سامنے پیش کی۔ میں نے اُسکا شکریہ ادا کیا مگر کپڑوں کی حالت دیکھکر شکریہ کے عوض مجھے غصہ چڑھ آیا جتنے کپڑے تھے سب میں زردی مائل بھورے رنگ کی کیچڑ کے (جو نہایت ہی چکنی اور نرم اور لسدار تھی) دھبے پڑے ہوے تھے۔ ایک بھی بے داغ نہ تھا۔ ابتو میں نے ایک ایک کپڑا اپنے فوجی محافظ صاحب کے سامنے پھینکنا اور غصّے میں انکو سخت سُست کہنا شروع کردیا۔ میں نے سارا الزام اُنھیں کے سر تھوپا کہ حضرت آپ ہی کی بدولت یہ مصیبت مجھپر پڑی ہے۔ وہ ہنسے اور مجھے یقین دلانے لگے کہ "چور بھی یہاں سے بے داغ نہیں گیا ہے۔ وہ بھی ایک گولی بدن میں لیکے گیا ہے" اگر یہ بات صحیح ہو تو ضروری ہے کہ اُنھوں نے ایک ہی نال میں دو گولیاں بھری ہوں۔ کیونکہ صبحکو میں نے دیکھا تو میری پالکی کے ایک دسنے میں ایک گولی دکھائی دی جو خوب پیوست ہوگئی تھی۔ مجھسے ضبط نہ ہوسکا اور میں نے محافظ صاحب کو یہ گولی دکھائی۔ انکی دیدہ دلیری دیکھیے کہ اُنھوں نے اپنی ریش مرسل پر ہاتھ پھیر کے فرمایا کہ اُنھوں نے تو یہ نشان بہت دن ہوے جب ہی دیکھا تھا۔ اور یہ کہ اُنکے خیال میں یہ گولی جب لگی تھی جبکہ ایک شب کو میں پالکی کے اندر سو رہا تھا۔ مگر یہ سب واہیات تھا۔

اُس رات بھر پھر کوئی نہیں سویا۔ کیونکہ دہاتیوں نے یہ خبر سُنکے کہ بادشاہ معہ باڈی گارڈ کوچ فرما گئے۔ لشکر پر چار طرف سے یورش کردی۔ تیرہ و تار رات کے لا انتہا گھنٹوں میں ہمنے بھی خیام شاہی کی طرف سے عورتوں اور مردوں کے شور وشین کی آوازیں سُنیں۔ حرم شاہی کی ادنی ملازم عورتیں ساتھ نہیں جاسکی تھیں۔ اور وہ ان ستم رسیدہ دہاتیوں کے ہاتھوں انواع واقسام کی ایذا و بے حرمتی کا نشانہ بنیں۔ خیمے پھاڑے اور لوٹے گئے۔ ہاتھ گلے کے زیور چھینے گئے۔ صندوق صندوقچے توڑے گئے اور محل کے اعلٰی درجے کی خاتونوں کی پوشاکیں دہاتیوں کے ہاتھ لگیں۔ ہمارا یہ حال تھا کہ ہم لوگ حفاظت خود اختیاری کے اولیں فرض پر کاربند تھے۔ کیونکہ یہ ہمارا کام نہ تھا کہ ہم سارے لشکر کی حفاظت کرتے یہ نواب کا فرض منصبی تھا۔ ہمکو خود ہر لحظہ یہی اندیشہ لگا تھا کہ کہیں ہمارے خیمے پر یورش نہ ہو۔ اور ہم میں سے ہر شخص بالکل مارنے مرنے پر تیار بیٹھا تھا۔ اسمیں کچھ شک شبہہ نہیں کہ لٹیروں نے ہمارے خیمے کے اردگرد بھی تاڑے لگائے مگر ہمکو مستعد بمقابلہ پاکر کسی کو ہماری طرف رُخ کرنیکی ہمت نہ پڑی۔

ان حالات کے پڑھنے کے بعد شاید کوئی صاحب ہمسے یہ سوال کریں کہ "حضرت۔ آپلوگ سارے کرشمے دیکھا کیے اور کسی صاحب سے اتنا نہ ہوسکا کہ ذرا خیمے سے نکل کے ان بیچاریوں کی حفاظت کرتا جنکو دہاتی لوگ ستا رہے تھے" لیکن اسکا جواب بآسانی ہم یہ دے سکتے ہیں کہ اول تو یہ عورتیں جو پیچھے چھوڑ دی گئیں

تھیں اُنمیں اکثر تو نظروں سے گری ہوئی آشنائیں تھیں۔ کچھ گائنیں تھیں۔ کچھ رنڈیاں تھیں اور کچھ ماما اصیلیں تھیں۔ پس اگر ہم لوگ انکے خیموں کے اندر جاتے تو یہ مبتذل عورتیں لکھنؤ کے بازاروں میں یہی مشہور کرتیں کہ ہم لوگ کسی بُری نیت اور ارادۂ فاسد سے وہاں گھُس گئے تھے اور اُنکے دامن عفت کے چاک کرنیکے مرتکب ہوئے تھے پھر تو حرم شاہی میں مداخلت بیجا کا جرم قائم ہو جاتا۔ اور ایک طرف شاہی عتاب اور دوسری طرف بڑے صاحب کے غیظ و غضب کا طوفان ہم پر نازل ہو جاتا۔ دار و گیر ہوتی عذاب میں مبتلا ہو جاتے۔ اور آیندہ کی تمام توقعات تو خیر جاتی ہی رہتیں اُسی کے ساتھ ہی پچھلا اندوختہ بھی ضبطی قرقی سے نیست و نابود ہو جاتا دوسری یہ بات بھی تھی کہ اگر ہم لوگ اُنکی حفاظت کو جاتے تو خود ہمارے خیمے میں موقع غنیمت سمجھکے لُٹیرے بے تکلف اور بلا تامل گھُس آتے اور سارا مال اسباب تہس نہس کر ڈالتے۔ اور یہ ظاہر ہی کہ ایسے مواقع پر بہادر سے بہادر آدمی بھی اپنے مال اسباب کی حفاظت کو دوسروں کے مال اسباب کی حفاظت پر مقدم سمجھتا ہی ماورا اسکے ہم صرف چار نفر تھے اور یہ چار نفر مستورات کے ایک جم غفیر کا تحفظ ہی کیا کر سکتے تھے۔ اور اگر ہم اپنی جانوں پر بھی کھیل جاتے تب بھی یہ عورتیں ہرگز ہماری جانبازی کا شکریہ ادا نہ کرتیں۔ اور بفرض محال اگر ہم لوگ اُنکی حفاظت کو چلے بھی جاتے تو ہمارے کپڑوں۔ گھوڑے کی کاٹھیوں۔ میز کرسی چارپائیوں اور جملہ رخت سفر حتیٰ کہ پالکی گھوڑوں وغیرہ کو غارتگری سے کون بچا سکتا تھا۔

ہمارے گھوڑے خیمے کے گرد قطار در قطار اسطرح سے باندھ دیے گئے تھے۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص چُپ چُپاتے بغیر شور و غل برپا ہوئے اُنکو کھول لیجاتا۔ پہلے ہی جھٹکے میں سائیس ہوشیار و خبردار ہو جاتے کیونکہ ہم لوگوں نے یہ ترکیب کی تھی کہ جن رسیوں سے گھوڑے بندھے تھے اور جنسے میخیں کسی ہوئی تھیں وہ سائیسوں کے بازوؤں میں بھی ایکطرف سے باندھ دی گئیں تھیں۔

اس شب تاریک میں جسکا ایک ایک نفس ایک ایک برس ہو رہا تھا ہم لوگ اپنے چُرٹ پیا کیے اور یہ سارے کرشمے دیکھتے اور یہ سارا شور و غل سُنتے رہے۔ صبحکو جب ہم لوگ شب گزشتہ کی غارت گری کے نتائج دیکھنے کو باہر نکلے تو عجب بوقلوں اور وحشت خیز سماں ہر طرف نظر آیا۔ جسکا نہ ٹھیک بیان ہی ہو سکتا ہی نہ تصور کیا جا سکتا۔ ایک شاہی خیمہ بالکل گر گیا تھا۔ اور بادشاہ اپنی روانگی لکھنؤ کی دُھن میں ایسے پڑے تھے کہ اُنکو اسکے دوبارہ استاد کرانے کی ذرا پروا نہ تھی۔ اُنھیں کے ساتھ ہر ہر متنفس رخت سفر کے درست کرنے اور جلد سے جلد چل کھڑے ہونیکی طیاریوں میں ایسا گھبرایا بوکھلایا ہوا تھا کہ کسیکو اس خیمے کی حالت پر اصلا توجہ نہوئی۔ کوچ کا ہیکو تھا اچھی خاصی بھگدڑ تھی۔ خیر۔ کسینے خبر لی یا نہ لی۔ لٹیروں نے اس خیمے پر توجہ بھی کی اور خوب خبر بھی لی۔ باوجودیکہ نواب کے سپاہیوں نے پوری کوشش اس خیمے کی حفاظت میں

کی پھر بھی دہاتیوں نے جو کچھ اُسمیں پایا سب لوٹ لیا اور ستیاناس کرڈالا۔ حتیٰ کہ بادشاہ سلامت کا وہ کوٹ پتلون جو گزشتہ شام ہی کو اُنھوں نے اُتارا تھا وہ بھی لوٹ میں گیا۔ خیمے کے گرد کی ساری زمین جگمگا رہی تھی۔ کیونکہ تمام وہ مغرق اور زرتار پوشاکیں۔ حرم شاہی کے وہاں بکھری پڑی تھیں جو بعجلت اور گھبراہٹ میں لٹیرونکے ہاتھوں سے چھوٹ گری تھیں۔ بڑی بڑی گرانمایہ اشیا زمین پر منتشر پڑی تھیں جسمیں خانہ داری اور باورچی خانے کا پورا سامان تھا۔ نفیس نفیس برتن۔ انواع اقسام کے کپڑے بچھے پڑے۔ ہاتھیوں اور اُونٹوں کی زریں جھولیں وغیرہ وغیرہ ڈھیر لگے ہوے تھے۔ ان غارت کردہ اشیاء میں کل سامان دیسی ہی نہ تھا بلکہ ہمکو یہ دیکھکر بہت تعجب ہوا کہ ادھر اُدھر بعض اس قسم کے کپڑے پھیلے پڑے تھے جو ہندوستانی مستورات کے استعمال میں معمولاً نہیں آتے ہیں بلکہ وہ وہی تھے جو یورپین مستورات کے استعمال کیواسطے انگلستان کی بڑی بڑی دوکانوں پر نظر آتے ہیں اور جنکو دیکھکر کنوارے مرد دل پکڑکے رہجاتے ہیں۔ چونکہ ہملوگوں کو اسکا یقین تھا کہ بادشاہ کے یورپین مصاحبین یا ملازمین۔ یعنے باورچی۔ کوچبا یا خاصہ تراش کے قبائل میں سے کوئی عورت اس لشکر شاہی کے ہمراہ نہ تھی اسوجہ سے ظن غالب یہی تھا کہ محل شاہی میں کوئی بیگم صاحبہ ہی ایسی ہونگی جو ایسی پوشاک بھی زیب تن فرمایا کرتی ہونگی اور جنکے وجود کا نہ ہمکو علم تھا نہ ہمنے کبھی سُنا تھا۔

دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لٹیروں اور نواب کے آدمیوں میں سخت جنگ بھی ہوئی تھی۔ کیونکہ ایک جگہ دو لاشیں زمین پر ایسی پڑی ہوئی تھیں جنکے بدن کی بوٹی بوٹی قیمہ کرڈالی گئی تھی اور ہیئت ظاہری سے یہ لوگ لشکر شاہی کے معلوم ہوتے تھے۔ اور ہمنے یہ بھی سُنا کہ نواب کے بہت سے ملازم بھی سخت مجروح ہوے تھے۔

اسکے بعد ہملوگ اس ضرورت سے اپنے خیمے میں چلے آئے کہ روانگی سے پیشتر جلدی سے کچھ ناشتہ کرلیں۔ خیمے میں پہونچے تو دیکھا کہ ہر طرف ایک دُھند مچی ہوئی ہی۔ ہنگامہ برپا ہی۔ اور خوب گالی گفتا ہو رہا ہی۔ بڑی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ذرا خاموشی ہوئی اور اب ہمنے پوچھ پاچھ شروع کی کہ یہ طوفان بے تمیزی کیسا برپا تھا۔ آخر یہ معلوم ہوا کہ کسی بات پر ہمارے نوکروں اور نواب کے آدمیوں سے تکرار تھی۔ اور بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہونچگئی تھی کہ دونوں جانب سے تہدیداً لاٹھیاں اُٹھگئی تھیں۔ اور اگر ہملوگ عین وقت پر نہ پہونچ جاتے تو شاید کچھ سر پھٹول بھی ہو جاتی۔ جب ہملوگ پہونچے تو نواب کے سپاہیوں میں سے ایک شخص نے ہمسے کہا کہ "دیکھیے صاحب! یہ کور نمک۔ نواب صاحب کے حکم کی تعمیل سے انکار کرتے ہیں" اسکے جواب میں ہمارے ملازمین نے اپنے یہاں لوگوں کے

کہا "یہ حرامزادے کہتے ہیں کہ ہم اپنے مالک لوگونکے خیمے کو چھوڑ کے ان لوگونکی ہمراہی کرنے کہیں اور جائیں"۔ غرضکہ دونوں فریق ہندوؤں کی طرح چلّا چلّا کے اپنا راگ گانے لگے۔ ہندوستانیونکا خاصہ ہے کہ لڑائی کے وقت خوب گلا پھاڑ پھاڑ کے چیختے اور ایکدوسرے کو دھمکاتے ہیں۔

ہملوگوں کو اس جھنجھٹ میں کسی قدر دلچسپی ہوگئی تھی۔ تھوڑی دیر تحقیق کے بعد بالآخر یہ عقدہ حل ہوا کہ نواب نے صاحب لوگونکے نوکرونکی بابت یہ حکم عام صادر کیا تھا کہ کوچ کے سامان کرنمیں یہ لوگ بھی مدد دیں اور اس بنا پر نواب کے پیامبر سپاہی ہمارے کہاروں اور سائیسوں کو جو کوئی کام مثل کھانا پکانے یا اسباب باندھنے کے نہیں کرتے تھے پکڑ کے لیجانے لگے۔ اور اگر ہمارے ملازم اس نامنصفانہ حکم پر عمل کرتے تو خدا جانے کب ہملوگونکے کوچ کی نوبت آتی۔ چونکہ تمام کپڑوں کے میلے ہوجانیسے مجھے یہ جلدی پڑی تھی کہ جیسے بنے جلد سے جلد یہاں سے کوچ بولدیں اور میرے علاوہ اور صاحب لوگونکو بھی بہت عجلت تھی کہ کہیں جلد لکھنؤ پہونچ جائیں۔ اور بادشاہ کے ہمراہی لوگ سارے لشکر کے قریب قریب کل کہاروں کو اپنے ساتھ لیے چلے گئے تھے۔ پس ایسی حالت میں ہماری اسبابکے اٹھانیمیں مدد دینے کو بہت کم کہار باقی رہگئے تھے۔ اگر نواب لوگ بھی ہمسے پیشتر یہاں سے تشریف لیجاتے تو ہمارا لکھنؤ پہونچنا مشکل پڑجاتا۔ بلکہ یہی خیال تھا کہ پھر خدا جانے لکھنؤ کی صورت دیکھنا بھی ہو کہ نہ ہو۔ کیونکہ بالعموم باشندگان اودھ بادشاہ کے یورپین مصاحبین کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور جی ہی جی میں انکو دیکھ کے کڑھتے تھے۔

ہملوگوں نے نرمی کے ساتھ سمجھا بجھا کے ان لوگوں کو یوں راضی کرنا چاہا کہ "حسب الحکم شاہی ہمکو حضوری شاہ میں بہت ہی جلد حاضر ہونا چاہیے"۔ اسکے جواب میں نواب کے سپاہیوں نے ہمسے کہا کہ "آپلوگونکی روانگی میں اگر کچھ درنگ واقع ہوگی تو نواب صاحب اسکی جوابدہی کریں گے"۔

پھر ہمنے کہا کہ "ہمارا فرض ہے کہ فوراً بادشاہ کی حضوری میں حاضر ہوں۔ اور اگر ہملوگ یونہی اپنے نوکرونکو دیدینگے تو گویا جہاںپناہ کے حکم کی نافرمانی کا ارتکاب کرینگے"۔ اسکا جواب ہمکو یہ ملا کہ "بادشاہ کی غیبت میں نواب حاکم مطلق ہیں اور انکا حکم سب کے لیے واجب التعمیل ہے"۔ ابتو ہملوگوں نے ذرا تیور بدل کے کہا کہ "ہملوگوں کے پاس کئی جوڑیاں پستول کی ہیں۔ چند شکاری بندوقیں ہیں۔ دو رفل ہیں۔ اور تلواریں تو متعدد ہیں۔ بس۔ یہ سمجھ لو کہ ہم اپنی اور اپنے نوکروں کی بخوبی حفاظت کرسکتے ہیں"۔ اسکے جواب میں ہمسے کہا گیا کہ "نواب کے پاس آپ کے ایک آدمی کے جواب میں تین تین آدمی ہیں اور ہتھیاروں کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔ بے انداز ہیں۔ اور اگر آپ ایسا ہی مجبور کریں گے تو یاد رکھیے کہ آپ کے ساتھ کیواسطے ایک آدمی بھی باقی نہ چھوڑا جائیگا"۔

نواب کے آدمیونکے ساتھ جو افسر تھا اُسنے ایسے استقلال اور سنجیدگی سے یہ ساری گفتگو کی کہ جس سے ہمکو بھی یقین ہوا کہ اس معاملے میں نواب نے جو دل میں ٹھان لی ہے وہی کرینگے۔ اس افسر کی گفتگو میں اگرچہ خوشامدانہ جملے بھی تھے۔ ہماری بہادری کی تعریف بھی تھی۔ مگر باانیمہ وہ اپنے اصرار پہ قائم تھا اور ایک انچہ بھی اپنے قول سے نہیں ہٹتا تھا۔

ابتو ہملوگ بہت ہی دق ہوے۔ اور عجب ضغطے میں پڑ گئے۔ کیونکہ ہمارا یہ منشاء ہرگز نہ تھا کہ ہم نواب کا مقابلہ کریں گے۔ یہی قیل و قال ہو رہی تھی کہ ہمکو اپنے مہربان خاصہ تراش کا خیال آیا۔ کیونکہ یہ وقت ہی ایسا نازک آپڑا تھا۔ کہ ہم ایسے ہی شخص کی دوہائی دیتے جس سے از اعلیٰ تا ادنی ہر ایک ملازم شاہی کی روح لرزتی تھی۔ اور جبکو وہ رسوخ بادشاہ کے مزاج میں تھا جس سے ہر کہ و مہ واقف تھا۔ ایک پُرانی بھدیسی مثل مشہور ہے "جسکا تصور کیا جاتا ہے وہ مل ہی جاتا ہے" چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہمارے خیال کے مطابق بے نشان گمان خاصہ تراش صاحب نمودار ہوے۔ وہ بھی لکھنؤ کے سفر کے تہیہ میں بہت مستعجل تھے۔ اور اسوجہ سے اب ہمیں گویا اُنکی بھی غرض اٹکی ہوئی تھی کہ ہملوگونکے ساتھ ہی چلیں اور جسقدر جلد ممکن ہو لکھنؤ پہونچیں اُنسے سب حالات بیان کیے گئے۔ سُنتے ہی مارے غصہ کے پھول کے کُپّا ہو گئے۔ پہلے تو اُسنے انگریزی میں افسر سے مخاطب ہو کے کہا کہ "تم سب بدمعاش۔ نواب بھی اور اُسکے سب ساتھی بھی بدمعاش ہیں" پھر ٹوٹی پھوٹی اُردو میں اُسنے کہا کہ "جاؤ اور وزیر اعظم صاحب سے عرض کرو کہ مجھے فوراً جاکے جہاں پناہ کی اصلاح بنانا ہے۔ میں ذرا توقف نہیں کر سکتا۔ اور یہ سب صاحب لوگ میرے ہی ہمراہ جائیں گے۔ لہذا کوئی نوکر نہیں دیا جائیگا۔ گنوار بیگا رونکی یہاں کون کمی ہے"

اسکے جواب میں اُس افسر نے زبان بھی نہ ہلائی۔ چُپکے سلام کیا اور چلتا ہوا۔ ہملوگ بھی چُپ بیٹھے یہ تماشہ دیکھا کیے۔ خاصہ تراش کا کام نکلا۔ ہمارا بھی مقصد پورا ہو گیا۔ اگر نواب کو کچھ سوختی ہوئی۔ تو ہوا کیے۔ وہ اپنی خفت ہمپر کیوں ظاہر کرنے لگے تھے۔ البتہ اس ساری کارروائی کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ پھر نوکرونکی مانگ نہیں ہوئی۔

جب ہملوگ لکھنؤ کے قریب پہونچے تو معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت نہایت اشتیاق کے ساتھ دلکشا میں یعنے جہاں سے ہملوگ روانہ ہوے تھے۔ ہمارا انتظار فرما رہے تھے۔

ایک روز صبحکو جو ہملوگ سلام کو گئے اُسوقت خاصہ تراش حسب معمول بالونکے سنوارنے میں منفرد تھا بادشاہ سلامت نے ہمسے مخاطب ہو کے فرمایا کہ "صاحبو۔ اس سنسان مقام میں تملوگوں نے مجھے بالکل بحال خود پریشان رکھا ہے" ہماری جماعت کے ایک صاحب نے عرض کیا کہ "حضور تو معمولی انسانو

کے بہ نسبت کہیں تیزی و سرعت کے ساتھ طے منازل فرماتے ہیں۔" اسپر بادشاہ سلامت بول اُٹھے کہ "خیر تملوگ صحیح سلامت آ گئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اُن مادر بخطا دیہاتیونکے ہاتھ سے خیام شاہی کی بربادی و غارتگری کا حال سُنا ہے۔ مجھسے خاں (یعنے خاصہ تراش) نے ساری کیفیت بیان کی ہے ذرا اُسکا مفصل حال پھر تو بیان کرنا۔" ہملوگوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہی بجنسہ عرض کر دیا۔ جسکو سُن کے بادشاہ سلامت بہت ہی غضبناک ہوگئے۔ اور ہکلا ہکلا کے فرمانیلگے "ان موذیوں کے ناپاک ہاتھوں سے میری اور میری بیگمات کی پوشاکونکی یہ ستیاناسی ہوئی ہے۔ ابا جانی کے سر کی قسم۔ دیکھو توان بدمعاشونکو کیسی سخت سزا دیتا ہوں کہ ہمیشہ یاد کریں گے۔" خاصہ تراش نے عرض کیا کہ "حضور میں نے سُنا ہے کہ نواب نے اُنکو گرفتار کر لیا ہے۔ اور بغرض صدور حکم سزا پیچھے لیے آتے ہیں۔" بادشاہ سلامت نے ارشاد فرمایا کہ "سُنا خاں! اُن میں سے ایک ایک متنفس کی گردن ماری جائے گی۔ چاہے گنتی میں سو ہی کیوں نہوں سب کی جان لونگا۔ اور دنیا میں کسی کی یہ تاب طاقت نہیں کہ ان نابکارونکو بچا سکے۔" یہی سزا اُن کمبختونکے واسطے جہاں پناہ نے تجویز فرما دی تھی۔

بعد اسکے ہمنے ان مصیبت زدہ لوگوں کو اُسوقت دیکھا جب وہ محل شاہی کے سامنے لائے گئے۔ واقعی اُنکی صورتیں بہت ڈراؤنی اور خونخوار تھیں۔ دیکھنے ہی سے جلّاد معلوم ہوتے تھے۔ ہر شخص ایک چارپائی پر اُسی طرح بندھا پڑا تھا۔ جیسے انگلستان میں شرابیونکو پولیس والے چارپائی میں باندھکے لے جاتے ہیں۔ انہیں سے ہر ایک کے بدن میں تلوار کے کاٹ یا خنجر کے بھونکنے کے زخم تھے۔ اور سب زخم کھلے اور آسلے تھے۔ جنکی مرہم پٹی کچھ نہوئی تھی۔ شمار میں انکی تعداد غالباً بارہ تھی۔ آخرکار اُنکو حکم قتل سُنا دیا گیا اور اُسی روز اُنکے سر گردن سے جدا کر ڈالے گئے۔

مین اسبات کا تصفیہ نہیں کر سکتا کہ آیا درحقیقت یہی لوگ اصلی سرغنہ غارتگران خیام شاہی کے تھے یا نہ تھے۔ نواب نے کہا تھا کہ یہی لوگ بانی مبانی ہیں۔ اور اُنکی رائے مان لی گئی تھی۔ نواب کا تو یہ کام ہی تھا کہ اس قسم کے مجرموں کو پیش کر کے غیظ و غضب شاہی کو فرو کریں۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ لوگ بخطا اور بے شر دیہاتی تھے۔ جنکو نواب کے سرکش سپاہیوں نے اس غرض سے پکڑ لیا تھا کہ کسی طرح بلا ٹلے اور بادشاہ کا غصہ اُتر جائے تو یہ کوئی عجیب بات نہوگی۔ ہندوستان میں سلسلے کے ساتھ ایسے واقعات ہوا ہی کرتے ہیں۔ اور صرف ہندوستانی ہی درباروں میں نہیں کیونکہ اس ملک میں کوئی سنگین واقعات ایسے نہیں ہوتے جسمیں پولیس کچھ بے گناہ غریبونکو پکڑ کے سزا نہیں دلا دیتی اور جنکی بابت اگر تم پولیس کے بیان پر یقین کرو تو کافی شہادت پیش ہو جائیگی کہ

یہی اصلی خطاکار اور مجرم ہیں۔

اودھ میں تحقیقات سرسری ہی پر بالکل انصاف کا دارومدار تھا۔ بجز لکھنؤ کے ملک بھر میں کہیں جیلخانہ نہ تھا۔ اور مقامات پر اگر کوئی شخص چوری کے جرم میں پکڑا جاتا اور اُسپر ارتکاب جرم کا قوی شبہہ پیدا ہوجاتا یا اُسکے اثبات جرم کے شہادتوں میں سخت قسم کھائی جاتی تو فوراً اُسکا سر تن سے جدا کردیا جاتا چکلہ داروں کو یورپ کے طریقے کے مطابق دادگستری کے انتظام کی فرصت ہی نہ تھی۔ اگرچہ کمپنی کے قوانین اور مقامات پر کیسے ہی ناقص کیوں نہوں لیکن میں یہ عقیدہ راسخ رکھتا ہوں کہ اودھ کے واسطے ایک یورپین مجسٹریٹ ہزار درجہ عمدہ انصاف چکلہ داروں سے کریگا۔ اگرچہ اُنکی دیسی زبان سی وہ کتنا ہی بے بہرہ اور جاہل اور اُنکی شہادتوں کے سمجھنے سے کتنا ہی معذور اور قاصر کیوں نہو۔

باب پنجم

جسکو پی چاہے سہاگن ہو وہی

جہاں ایسے بادشاہ کے ہاتھ میں عنان حکومت ہو اور جہاں عام طور سے رعایا اس طرح شاہی احکام کی مطیع و منقاد ہو جیسی ہندوستان میں ہوتی ہے اُس دربار میں کسی مقرب بارگاہ سلطانی کے نامتناہی عزاز و اقتدار کا یقین کر لینا کچھ بھی بعید از عقل نہیں ہو سکتا۔ بااینہمہ دربار اودھ میں خاصہ تراش کا مزاج شاہی میں رسوخ حاصل کر لینا اور پھر اُس رسوخ کا قائم رہنا ایک انوکھی بات تھی۔ کیونکہ نہ تو یہ صاحب بہادر یسی زبان میں بخوبی اظہار مدعا کرنے پر قادر تھے نہ بادشاہ سلامت کو زبان انگریزی میں اتنی مہارت تھی کہ بے تکلف اپنے خیالات ظاہر کر سکتے۔

امارت کے خطاب۔ دربار شاہی میں بے پایاں اختیارات۔ اور اُسی کی معرفت جملہ یورپین اشیأ ی خرید کا تذکرہ میں اُوپر کر چکا ہوں۔ ماورا ان اعزاز مخصوص کے اُسکے سپرد شاہی مناجری (نقش خانہ) ی افسری بھی تھی۔ ایکبار میں نے بھی اُسکے حساب کی ضخامت کو جو اُسنے میرے سامنے شاہی ملاحظے کے اسطے پیش کیا تھا دیکھا تھا۔ تفن[1] یا پنچ سے فراغت ہو چکی تھی اور اب وہ وقت تھا کہ ہم لوگ مرخص ہونیکو تھے کہ خاصہ تراش صاحب اپنے حساب کا ایک طومار ہاتھ میں لپیٹ کر حضوری میں حاضر ہوئے۔ ہندستان یں دستاویزات قانونی یا کاغذات متعلق تجارت عام دستور کے مطابق بڑے لمبے لمبے تختوں پر تحریر کیے جاتے یں اور کتاب کی طرح متعدد صفحوں پر جداگانہ تحریر نہیں کیے جاتے بلکہ یہ کیا جاتا ہے کہ بڑے بڑے کاغذ یکے بعد دیگرے طولاً چسپاں کر کے طول طویل تختہ بنا کے اُسی پر لکھتے ہیں۔ اور پھر اُسی کو لپیٹ کے چونگلا یسا بنا لیتے ہیں۔ خاصہ تراش کو اس حیثیت سے دیکھکے بادشاہ نے مسکرا کے فرمایا "اخاہ۔ خان ہے۔ کیا ہے۔ ماہواری حساب ہوگا۔ کیوں ہے نا؟" اُسنے جواب دیا "جی خداوند" بادشاہ نے ارشاد فرمایا " لاؤ۔ کھولو۔ دیکھیں کیا ہے۔ کتنا طول طویل ہے۔ کھولو۔ خان کھولو" بادشاہ اُس وقت مسرور تھے۔ اور خاصہ تراش تو اُسی رنگ میں ڈوب جاتا تھا جسمیں بادشاہ سلامت کو دیکھتا تھا۔ چنانچہ اُسنے فوراً ہی کاغذ ا ایک سرا اپنے ہاتھ میں لیلیا اور باقی چونگلا زمین پر اس طرح لڑھکا دیا کہ خود بخود کھلتا چلا گیا اور جاتے جاتے وسرا سرا کمرے کی سامنے والی دیوار سے جا لگا۔ اس کاغذ پر نہایت خوشخط رقمیں سلسلہ وار باریک قلم سے ز اول تا آخر لکھی ہوئی تھیں۔ بادشاہ کے حکم سے ایک گز لایا گیا اور کاغذ کی ناپ ہوئی۔ ساڑھے چار گز

---

[1] ناشتۂ صبح و سہ پہر۔

لانا نکلا۔ میں نے جو اُسکی میزان پر نظر ڈالی تو کل حساب نوے ہزار سے زائد کا معلوم ہوا۔ نو ہزار پاؤنڈ سے زیادہ[1]!!

بادشاہ نے بھی صرف میزان کی رقم پر نظر ڈالی اور پوچھا کہ "خان۔ یہ حساب معمولی ماہواری حساب سے زیادہ معلوم ہوتا ہے؟" خاصہ تراش نے عرض کیا "قبلۂ عالم۔ اس حساب میں نقرئی و طلائی ظروف اور نو خرید ہاتھیوں وغیرہ کی قیمت درج ہے۔" اسکی بات کو قطع کر کے بادشاہ بول اُٹھے "ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک۔ جاؤ۔ نواب پاس لیجاؤ۔ اور کہو بیباق کر دیں۔" بادشاہ کے دستخط ہوئے اور حساب بیباق ہو گیا۔

ایک بار ایک مقرب مصاحب نے حضور میں عرض کیا کہ خان تو بالکل حضور کو لوٹے ہی لیتا ہے۔ اُسکا حساب تو دیکھئے۔ کیا بھاری بھرکم ہوتا ہے۔" اُسکا جواب بادشاہ نے نہایت حقارت کی نظر سے یہ دیا کہ "اگر میری مرضی یہی ہو کہ خاں کو دولتمند بنا دیکھوں۔ تو بتاؤ اسمیں تمہارا یا کسی کا کچھ اجارہ ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ اُسکا حساب بہت کچھ فرضی ہوتا ہے۔ اور بڑا بھاری ہوتا ہے۔ مگر ہونے دو۔ میری خوشی اسی میں ہے۔ وہ ضرور دولتمند بنیگا!!"

شاہی الطاف و عنایات کی یہی ایک مثال نہ تھی کہ وہ خاصہ تراش کو مورد عطیات خسروانہ بنائے ہوئے تھے۔ مجھے اور بھی دو خاص مثالیں یاد ہیں کہ جنمیں بادشاہ کی نظر عنایت اور تلون طبع کی بدولت فیاضی میں استقدر مبالغہ ہوا ہے کہ اسراف تک نوبت پہونچگئی ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ایسے تلون کے ساتھ فضولی عموماً خود مختار بادشاہوں اور بالخصوص مشرقی حکمرانوں کے خمیر میں پڑی ہوتی ہے۔ از انجملہ ایک مثال ایک کشمیری گانیوالی کی ہے۔

یہ کشمیری گانیوالی جو از حد حسینہ و جمیلہ تھی۔ جسکی بڑی بڑی سیاہ سیاہ آنکھیں تھرتھراتی تھیں اور جسکا تناسب اعضا جو اُسکی پوشاک کے تناؤ کھچاؤ سے نمودار تھا۔ بیمثل تھا۔ دربار شاہی میں وارد ہوئی۔ اس مقام پر مجھے یہ کہنا ضروری ہے کہ بدن کی ترکیب اور ساخت میں جو خوشنمائی فطرتی ہوتی ہے وہ ہندوستانی عورات کے لباس میں انگریزی عورتوں کے لباس سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انگلستان میں عورتیں اپنی پوشاک سلی سلائی کسی دوکان سے خرید لاتی ہیں۔ جس سے وہ اصلی حُسن بدن کا ظاہر نہیں ہو سکتا برخلاف اسکے ہندوستان میں عورتیں اپنے خاص جسم کے مناسب و موزوں لباس سلوا کے پہنتی ہیں اور لباس سے بدن کے اصلی جوہر بخوبی عیاں ہوتے ہیں۔

اس کشمیری طوائف نے جسکا نام نتھوا تھا اپنے زاہد فریب حسن اور دلکش اداؤں سے بادشاہ کو

[1] آنکھیں کھل گئی ہونگی۔ یہی تو جلن ہے جسنے قلم کو اُسترا بنا کے ہر جگہ خاصہ تراش کا سر مونڈا ہے۔ (مؤلف)

بھی اپنا والہ وشیدا بنا لیا۔ زیادہ تر اسوجہ سے کہ جو شخص اس طوائف کو پنجاب سے لایا تھا۔ اُسنے اس کے اوصاف ومناقب اپنی زبان سے کچھ زیادہ بیان نہین کیے تھے۔ اُسکی آواز مین غضب کی کھٹک تھی اور عجب درد بھرا تھا۔ اور جب وہ اپنے وطن یعنے کشمیر جنت نظیر کی مدح میں غزل سرائی کرتی تھی تو عجب دلکش ودردناک، انداز سے حسرت کا سماں کھینچدیتی تھی۔ اور سُننے والونکے دلونپر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ اُسکی بڑی بڑی آنکھونمیں حیا وشرم بھی تھی اور حسرت ونامرادی بھی۔ اور اُسکے انداز وادا میں سہویت اور لاؤبالی پن نے وہ دلکشی ودلربائی پیدا کردی تھی کہ جسکا لطف دیکھنے سننے پر منحصر تھا۔

اگرچہ دربار شاہی میں وہ بطور ایک معمولی طوائف کے پیش کی گئی تھی۔ مگر اُسکی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس شب کو اور جتنے تماشے تھے وہ سب ایسے بے لطف ہوے کہ سب لوگ خواہ مخواہ اُسی کی طرف زیادہ متوجہ ہوے۔ اور گھور گھور کے دیکھنے لگے۔ خود بادشاہ سلامت نے اُسکی صورت دیکھی۔ ناچنے بھاو بتانے کی ادا دیکھی۔ سُریلی آواز کا گانا سُنا۔ خوش ہوے اور لگے جھوم جھوم کے داد دینے۔ بادشاہ سلامت کے داد دینے سے بیچاری نھوا مارے خوشی کے جامے میں نہ سماتی تھی۔ دل کا کنول کھل رہا تھا اور کلیجہ بانسون اُچھلتا تھا۔ آنکھیں جوش انبساط سے اور بھی روشن ہوگئیں۔ چہرے پر سُرخی جھلک آئی۔ جسوقت وہ اپنے جذبات کو روکتی اور جی کو سنبھالتی تھی اُسوقت اُسکے سینے کی حرکت دور سے نظر آتی تھی۔ بادشاہ بولے "شاباش! نھوا شاباش!!" اب تو شرم وحیا اور خوشی ومسرت سے چہرے پر ایک رنگ آنے ایک رنگ جانے لگا۔

اچھے ناظرین! آپ بیچاری نھوا پر الزام نہ دیجیے گا۔ ذرا خیال کیجیے کہ یہ داد اُسکو کسی معمولی آدمی سے نہیں مل رہی تھی۔ ایک بادشاہ وقت تھا کہ جو اُسکی ناز وخوبی کی اداؤں پر ریجھ رہا تھا۔ اور اُسی بادشاہ کی چھ بیگمات میں سے دو ایسی تھیں جو نھوا سے بھی کم درجے کی تھیں۔ اور ہندوستان میں انھیں طوائفوں کے بطن سے بہتیرے وارثان تاج وتخت پیدا ہوچکے ہیں۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ جو رنجیت سنگھ شیر پنجاب کے بیٹے تھے اور جنکو حضور ملکۂ معظمہ کے مہمان رہنے کا افتخار حاصل ہوچکا ہے اُنکی ماں بھی رنڈی ہی تھی۔ تو ایسی حالت میں اگر بیچاری نھوا خوشی سے بیتاب ہوگئی تو اُسپر الزام نہیں دینا چاہیے۔ تھوڑی دیر تک تو میں یہ سمجھتا رہا کہ اُسکا پیمانہ طبع اُسے بے ہی ڈالے گا۔ لیکن نہیں۔ اُسنے فوراً ہی اپنے کو سنبھالا اور اپنے آپے میں آگئی۔ میز پر ہم جتنے بیٹھے تھے اُسوقت سب کا یہ حال تھا کہ سب کی ٹکٹکی اُسکے رُخ روشن پر بندھی ہوئی تھی۔ جسوقت اُسنے اپنے حواس درست مجتمع کرلیے وہ اور بھی جی توڑ کے ناچی۔ گائی۔ حتی کہ جہاں پناہ بول اُٹھے "آجکے گانے کے انعام میں تمھیں ایک ہزار روپیہ ملیں گے"

ایک[1] ہزار روپیے! ایک سو پاؤنڈ!! ایک غریب کشمیری چھوکری کے واسطے تو ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔

ابتو بادشاہ سلامت نے اور بھی پاؤں پھیلائے۔ یعنی جب ناچ ہو چکا اور حرم میں جانے لگے تو نھنوا کے سوا اور کسی کے شانے کا سہارا اُنھیں اچھا نہیں معلوم ہوا۔ چنانچہ وہ اُسی کے شانے پر سر نہوڑائے ہوئے حرم میں داخل ہوے۔ وہ سماں بھی قابل دید تھا کہ بیچاری نھنوا کا چہرہ شرم اور رُعب سے کیا جلد جلد رنگ بدل رہا تھا۔ بادشاہ کی یہ حرکت کہ حرم سلطانی میں ایک رنڈی کو لیے چلے گئے۔ کسی قدر بدنما تھی۔ کیونکہ ہندوستان میں اسکو معیوب سمجھتے ہیں۔ مگر بادشاہ سلامت کو ایسے دستورات کی مطلق پروانہ تھی جو اُنکی آزادی اور تلون مزاجی میں حارج ہوتیں۔

دوسری شب کو نھنوا کے سوا اور کسی کا گانا ہوا ہی نہیں۔ آج اُسکا بناؤ سنگار بہت اعلیٰ تھا۔ جواہر نگار زیور ہاتھ گلے۔ شانے اور سینے پر ایسی چمک دمک دکھا رہے تھے کہ نظر خیرہ ہوتی تھی۔ اور چہرہ مارے خوشی کے لالوں لال ہو رہا تھا۔ جب ناچ ختم ہوا تو بادشاہ نے فرمایا کہ "آج کی شب تمکو دو ہزار روپیے (دو سو پاؤنڈ!) انعام ملیں گے"۔ آج پھر جہاں پناہ اُسی کے شانے پر سر نہوڑائے داخل محلسرا ہوے۔ کئی شب متواتر یہی کیفیت رہی۔ بادشاہ کی داد دہش حد و پایان سے گزر گئی۔ اور نوبت بایں جا رسید کہ سارا دربار اُسکے سامنے سر تسلیم خم کرنے لگا۔ اور وہ ایسی سب میں رِل مِل گئی کہ ازواج شاہی نے اُسکا رنڈی ہونا بھی دل سے بھلا دیا۔ شاہی خواصوں نے بھی جنھوں نے پہلی رات کو اُسے حقارت کی نظر سے دیکھا تھا رفتہ رفتہ اپنا برتاؤ بالکل بدل ڈالا۔ پہلے اخلاق و تواضع شروع کیا۔ پھر عزت و تکریم کرنے لگیں۔ پھر تو مطیع و فرمانبردار ہو گئیں۔ اور چاپلوسی و خوشامد میں لگ گئیں۔

ایک شب نشے کی ترنگ میں بادشاہ سلامت نے نھنوا کیجانب مخاطب ہو کے فرمایا کہ "میں تیرے واسطے سونے کی اینٹوں کا ایک مکان بنوا دونگا۔ اور ایکدن تجھی کو بادشاہ بیگم بھی بنا دوں گا"۔ ابتو نھنوا کی عزت افزائی کی گویا حد ہو گئی۔

اس درمیان میں کسی ایسی تعطیل کی وجہ سے ایک ہفتے کے لیے ہملوگوں کی خاصہ کیوقت کی حاضرباشی میں خلل پڑ گیا۔ اور اس عرصہ میں ہمنے نھنوا کی جھلک بھی نہ دیکھی۔ جب یہ زمانہ ختم ہوا تو پھر ہمنے اُسے دیکھا وہ اپنی اُسی آن بان سے ناچتی۔ گاتی۔ دلونکو لبھاتی تھی۔ لیکن بادشاہ سلامت کی طبیعت بدل چکی تھی۔

---

[1] آپکے پیٹ میں کیوں قراقر ہوتا ہے۔ کاش آپ بھی اسی زمرے میں ہوتے۔ کئی پشتوں کے کھانے پینے کی فکروں سے فراغت ہو جاتی۔ مترجم

Sir Roger

جناب مترجم صاحب آپکے ریمارکس بھی سر روجر کے ریمارکس سے کچھ کم دلخوش کن نہیں ہیں

چنانچہ ایک بار وہ اُسکی طرف دیکھتے ہی دیکھتے انگڑائی لیکے بولے۔ "ارے معاذ اللہ۔ اب تو یہ اجیرن ہو گئی ہے۔ کیا آجکی شب کے واسطے کوئی دوسرا تماشہ نہیں ہی۔ اجی۔ خاں۔ لاؤ۔ آج بٹیر بازی ہو جائے۔" خاصہ تراش تو بٹیر منگوانے اُٹھ گئے۔ اور بادشاہ سلامت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نھوا بیچاری کو تاکنے گھورنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بولے تو یہ بولے "اسکو اگر یورپین لباس پنھایا جائے تو یہ کیسی معلوم ہو" یہ جملہ کچھ تو آپ ہی کہا آپ ہی سنا اور کچھ ماسٹر صاحب سے مخاطب ہو کے کہا جو قریب ہی بیٹھے تھے مگر کسی نے کچھ جواب نہ دیا کہ اتنے میں خاصہ تراش صاحب پھر نمودار ہوے۔ اور بادشاہ سلامت نے وہی فقرا اُنسے بھی کہا۔ اور اُنھوں نے جواب دیا "پیرو مرشد۔ اسکا معلوم ہونا کون مشکل بات ہی۔ دیکھیے ابھی انتظام ہوا جاتا ہی" چونکہ وہ خود متاہل تھے۔ اُنھوں نے فوراً اپنے گھر سے سایہ۔ گون اور دیگر انگریزی لباس منگا بھیجا۔ اور جب آگیا تو نھوا سے کہا گیا کہ "ذرا اسے پہنکے آؤ"

بٹیر آگئے اور شاہی میز پر جوڑ لڑنے لگے۔

بیچاری نھوا بھی تھوڑی دیر بعد نئی کینچل میں نمودار ہوئی۔ یہ لباس اُسپر بالکل بے پھاب تھا۔ ڈھیلا۔ ڈھالا۔ جھابڑ جھبول لباس۔ بدنمائی کے ساتھ کچھ ادھر لٹکتا۔ کچھ اُدھر۔ اُسکو خود محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بالکل بدہیت ہو گئی ہی۔ سارا حسن تشریف لیگیا۔ ساری نزاکت پر پانی پھر گیا۔ اور اب جو وہ آکے بددلی کے ساتھ بیٹھی تو اُسکی صورت دیکھکے ترس آتا تھا۔

اُسکی اس حالت پر بادشاہ سلامت اور خاصہ تراش دونوں خوب جی کھول کے اور کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ اور بیچاری نھوا کے گلگوں رخساروں پر بڑے بڑے آنسو ڈھلکنے لگے خواصوں کو بھی مطلق رحم اُسپر نہ آیا۔ بلکہ وہ اُسکے اس توہین پر برابر دبی زبان سے ذرا مسکرا مسکرا کے کہا کیں "ہا۔ چوڑیل" "اور لے" اسی طرح کئی دن بلکہ کئی ہفتے تک بیچاری نھوا سب کی نشانۂ تمسخر اور روئے ظرافت بنکے حاضر ہوا کی۔ بادشاہ سلامت اُسے کسی دوسرے لباس میں دیکھنا اب پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اُسکی کوئی ادا اُنکے لیے دلفریب نہ تھی۔ بلکہ کسیقدر ناگوار ہی تھی۔ جب دربار کا رنگ بدلا دیکھا۔ بادشاہ کی نظر پھری پائی۔ تو اس بیچاری نے متواتر اجازت چاہی کہ اپنے وطن کشمیر ہو آئے مگر ہر مرتبہ درخواست نامنظور ہوئی حتّٰی کہ اُسنے خاصہ تراش کو بیچ میں ڈالا اور اُس سے بھی سفارش کرائی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بادشاہ کے پہلو میں دل نہ تھا۔ پتھر کا ایک ٹکڑا تھا۔

اسی زمانے میں محرم آگیا اور کامل چالیس دن تک ہلوگ دنیا سے الگ تھلگ رہے۔ کبھی کبھار دربار شبگاہی میں اتفاقاً بادشاہ کی زیارت ہو جاتی تھی۔ عزاداری کی وجہ سے ناچ رنگ اور انگریزی

وعوتیں یکقلم بند تھیں وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی سے پیشتر یہ منت مانی تھی کہ اگر مجھے کبھی تخت شاہی نصیب ہوگا تو میں بجائے عشرہ کے (جسمیں عام لوگ محرم منایا کرتے ہیں) اربعین تک عزاداری کیا کرونگا چنانچہ اس عہد پر سختی کے ساتھ وہ قائم رہے۔

محرم کے آجانے سے ہملوگ بیچاری تھوا کے دیدار سے محروم ہوگئے۔ جب محرم ہوچکا تب بھی وہ ایوان شاہی میں کہیں نظر نہ آئی۔ یہ کچھ نہ کھلا کہ اُس بیچاری کا حشر کیا ہوا۔ خاصہ تراش سے پوچھا اُسنے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ خدا جانے وہ بھی ہماری طرح ناواقف تھا یا جان بوجھکے چھپاتا تھا۔ بظاہر اُسنے اپنا یہ قیاس بیان کیا کہ غالبًا بادشاہ نے اپنے کسی محل کو بطور خواص اُسے عطا کر دیا ہے۔ اور محلات ہی میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگی۔ مگر ایک خواجہ سرا سے معلوم ہوا کہ محلات میں تو وہ ہے نہیں۔ میں نے ایکبار تذکرۃً بادشاہ سلامت کے حضور میں اُسکا نام لے لیا۔ مگر اُنھوں نے اسپر مطلق التفات نہ فرمایا۔[1]

ایک مثال تو ہوچکی۔ اب دوسری مثال سناتا ہوں۔ یہ ذرا پہلی سے درجے میں گھٹی ہوئی ہے۔ یعنی ایک مرتبہ بادشاہ سلامت کی سواری جلوس کے ساتھ اُس سڑک پر جو رمنے کے اندر سے نکل گئی ہے چاند گنج (جہاں موذی جانوروں کی لڑائی ہوا کرتی تھی) جا رہی تھی۔ خود بادشاہ سلامت ایک کھلی گاڑی میں پورے انگریزی ساز و سامان سے سوار تھے۔ کوچ بکس پر اُنکا آئرش (باشندۂ آئرلینڈ) کوچبان بیٹھا ہوا تھا اور نہایت خوبصورت۔ عربی النسل۔ نقرئی رنگ جوڑی ہانک رہا تھا۔ دسمبر کا مہینہ اور موسم خوشگوار تھا۔ ہوا خنک اور روح پرور تھی۔ اور تمازت آفتاب کا اثر محسوس نہ ہوتا تھا۔ بادشاہ سلامت نے کوچبان کو حکم دیدیا تھا کہ ذرا آہستہ قدم قدم چلے کہ ٹھنڈی ہوا کا لطف ملے۔

ہملوگ شاہی گاڑی سے تھوڑا پیچھے گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور شاہی باڈی گارڈ کا رسالہ ہمارے پیچھے تھا۔ کبھی کبھی جب ہم میں سے کسی کو کچھ عرض معروض کرنا ہوتا تھا تو وہ آگے بڑھتا تھا اور ٹوپی اُتار کے بادشاہ کی گاڑی کے برابر چلا جاتا تھا اور جو کچھ عرض کرنا ہوتا تھا عرض کر لیتا تھا۔ کیونکہ یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ جب کبھی بادشاہ ہم میں سے کسی طرف متوجہ ہوکے اُس سے کچھ فرمانے لگتے تھے یا ہم کچھ عرض کرنا چاہتے تھے تو فوراً اپنی ٹوپی سر سے اُتار کے ہاتھ میں لے لیتے تھے۔ چنانچہ گاڑی چلی جا رہی تھی۔ اور ماسٹر صاحب بادشاہ کی گاڑی کے برابر موجود تھے۔ کہ ایک شخص نیم برہنہ۔ کشیدہ قامت۔ قوی الجثہ سڑک کے ایک کنارے سے سامنے آکر ناچنے اور وحشیانہ پن سے گانے لگا۔ بادشاہ اُس شخص کیطرف مڑ کے

---

[1] آخر اسقدر تحقیق کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں ٹھیک ہے۔ آپ تو تجرد ہی کی حالت میں تھے۔ بڑا تعجب ہے اپنی بیقراریوں کی سرگزشت مفصل نہ سنائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ دور ہی دیکھنے کے عاشق بنے رہے۔ مترجم

دیکھنے لگے۔ اتنے میں دو ایک سوار آگے بڑھے کہ اس شخص کو سامنے سے ہٹا دیں۔ مگر بادشاہ سلامت نے اُنکو منع فرمایا اور حکم دیا کہ گاڑی ٹھہرالو۔ اُس وقت یہی لہر آگئی تھی کہ گاڑی روک دی ورنہ کوئی اور موقع ہوتا تو سواروں کی اس دار و گیر اور تعدی کو دیکھکے بیساختہ ہنستے اور قہقہے مارتے۔

پیرو (یہ اس شکستہ حال وحشی خصال شخص کا نام تھا) یہ سمجھ کے کہ بادشاہ سلامت اُسپر متوجہ ہیں خوشی کے مارے اپنے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اور جب اُسکی کشش نے یہ اثر دکھلا دیا کہ شاہی سواری رُک گئی اور سارا جلوس جہاں کا تہاں تھم گیا تو وہ اور بھی خوش فعلیاں دکھانے لگا۔ بے تکان ناچتا بھی تھا۔ بھنبھنی آواز سے گاتا بھی تھا۔ گاتا کیا تھا؟ ایک گیت تھا۔ جو خود اُسنے جوڑا تھا۔ اس گیت کی ایک کڑی جسمیں بادشاہ سلامت کی بہت کچھ ثنا و صفت کی تھی۔ اور چاپلوسی کی تھی قبلۂ عالم کو بھا گئی۔ اور وہ جھوم جھوم کے اول سے آخر تک گیت سُنا کیے۔ آخر ایک خدمتگار کو حکم ہوا کہ اسے پانچ اشرفیاں انعام دو اور اُس سے فرمایا کہ ہم تمھارا گانا کل ایوان شاہی میں سُنیں گے۔ اسکے بعد حکم دیا کہ سواری بڑھے۔ اُس وقت پیرو نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ قبلۂ عالم کا ظل ہمایوں مجھپر ویسا ہی پرتو افگن ہے جیسے کھجور کے درخت پہ شعاع آفتاب:-

پیرو لیتے وحشیانہ طریقے کا ایک شاعر تھا۔ البتہ شعرائے قدیم کے خلاف اُسمیں شرم و لحاظ کی کمی تھی۔ شوخی طراری زیادہ تھی۔ دوسرے دن وہ در دولت پر حاضر ہوا۔ اور ایک نو تصنیف گیت گانا چاہا۔ لیکن بادشاہ کو وہی گیت مرغوب ہو چکا تھا جو پہلے دن سُنا تھا۔ اور کچھ سُننا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ کئی دن برابر پیرو حاضر دربار ہو کے وہی راگ گاتا رہا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ سلامت کو اُسکے سُننے سے ہر روز نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اب تو انعام اکرام۔ اور داد و دہش کا مینہ برسنے لگا۔ اور پیرو بھی لکھنؤ کے شماری لوگوں میں سمجھا جانیلگا۔ ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ بادشاہ سلامت کی مرضی دیکھکے نواب صاحب جنرل صاحب۔ اور راجہ بختاور سنگھ جنرل پولیس نے بھی خوب تحفے تحائف پیرو کو دیے اور ہر طرف سے چھپر پھاڑ کے دولت برسنے لگی۔

ان حالات کو دیکھکے ہر شخص یہی سمجھنے لگا کہ ایک نہ ایک دن پیرو بھی عمائد سلطنت کے زمرے میں داخل ہو جائیگا۔ چنانچہ لوگوں نے جدھر سے وہ نکلتا تھا تعظیم دینا شروع کر دی۔ غالباً بعض ناظرین یہ خیال کریں گے کہ "یہ کیفیت دیرپا تو نہ ہوگی" نہیں یہ بات نہ تھی۔ اُسکے اقبال کا دریا زوروں پہ بہ رہا تھا۔ اور بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ایوان شاہی میں اُسکی سکونت کیواسطے کچھ کمرے بھی مرتب کر دیے گئے اور پہلے جس جسم پہ ثابت کپڑے بھی نہ تھے۔ اب زرد و سُرخ گرنٹ وغیرہ سے آراستہ و پیراستہ رہنے لگا

نواب صاحب اور جنرل صاحب اور راجہ بختاور سنگھ یہ تینوں اعلیٰ اراکین سلطنت اُس سے بدرجہ مساوات تخاطب کرنے لگے۔ اور پیرو بھی اپنی زرق برق ملبوس اور تازہ بتازہ عزت افزائیوں سے ہر وقت بر سر حساب رہنے لگا۔ بھلا۔ ایسا شاعر کہیں اور بھی ہوا ہی۔ جسے اسطرح داد سخن ملی ہو۔

رفتہ رفتہ روزانہ سے ہفتے وار اور ہفتے وار سے ماہوار ہوا اور بالآخر کبھی کبھار پیرو دربار شاہی میں گانے کو حاضر ہونیلگا۔ لیکن اب بھی الطاف و عنایات شاہی بدستور رہتے تھے۔ اٹھارہ مہینے تک کا تو حال میں جانتا ہوں۔ کیونکہ جس روز یہ شخص سڑک کے ایک گوشے سے جنگلی جانور کی طرح نکلکر شاہی گاڑی کے سامنے آیا تھا اور سواران ہمراہی اپنے نیزوں سے اُسے شکار کرنے کو بڑھے تھے۔ اُسکے اٹھارہ مہینے بعد جب میں نے لکھنؤ کو چھوڑا تھا۔ اُسوقت تک پیرو مشاہیر امراے لکھنؤ میں سمجھا جاتا تھا۔ پیرو کا خطاب مجھے ٹھیک یاد نہیں ہی مگر اتنا خیال ہی کہ پہلے سنگھ کا پھر راجہ کا خطاب اُسے ملا تھا۔ کیونکہ وہ ہندو تھا۔ اور جہانتک مجھے یاد ہی راجہ اور سنگھ ہندوؤں کا لقب و خطاب ہی اور میر اور نواب مسلمانوں کا۔

چونکہ اس موقع پر میں شاہی نظر عنایت اور الطاف و مراحم خسروانہ کی قصیدہ خوانی کر رہا ہوں اسلیے مناسب معلوم ہوتا ہی کہ میں ایک اور روایت بیان کروں جسمیں بادشاہ سلامت نے میرے ایک یورپین دوست پر جو عنایات مبذول فرمائیں اُنھیں قلمبند کروں۔ یہ صاحب اُسوقت کلکتے سے آئے تھے اور اب ولایت میں قصبۂ مڈل سکس کے شریف (یعنے ؟ ...) ہوگئے ہیں۔ اور اُنکے حال پر بادشاہ سلامت بہت مہربان ہوگئے تھے۔

مجھے لکھنؤ میں آئے ہوئے چند مہینے گزرے تھے کہ ان صاحب نے مجھے الہ آباد سے لکھا کہ قبل واپسی انگلستان میں یہ قصد رکھتا ہوں کہ بالاے ہند کے صوبجات کو بھی تھوڑا سا دیکھ لوں"۔ اُنکی اس تحریر کا منشا یہ تھا کہ وہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ اگر وہ لکھنؤ آئیں گے تو اُنکو کوئی موقع مل سکیگا کہ یہاں وہ جانوروں کی لڑائی دربار لکھنؤ کی کچھ سیر۔ اور یا اُن باتوں میں سے کوئی بات دیکھ سکیں گے جو لکھنؤ کیواسطے مخصوص ہیں اور جنکے واسطے اودھ کا دار السلطنت مشہور و معروف ہی۔

میرے ان مہربان نے کلکتہ میں بذریعہ تجارت بہت کچھ دولت پیدا کر لی تھی۔ اور چونکہ وہ میرے بڑے جگری دوست بھی تھے لہذا مجھے یہ تمنا تھی کہ میں کسی طرح اُنکو اپنا مرہون منت بنا لوں۔ کیونکہ روپئے والے آدمیوں کے دوست احباب کی ہمیشہ یہی آرزو ہوتی ہی کہ کسی طرح اُنکو اپنا ممنون و احسانمند بنا لیں۔ چنانچہ میں نے اُنکو لکھ بھیجا کہ تم فوراً چلے آؤ میں تمکو قصر شاہی کے سیر بھی دکھا دونگا۔ قفس خانے بھی لیچلونگا۔ اور بادشاہ سلامت کی زیارت سے بھی مشرف کرا دونگا۔ اس سے زیادہ اور کچھ وعدہ میں نکرسکا

اُنکو لکھ چکنے کے بعد میں نے ایک دوست سے جو مصاحب شاہی تھے اسکا تذکرہ کیا اور اُنھوں نے مجھسے کہا کہ "اگر کوشش کیجائے تو خاصہ تراش سے سعی کرا کے جانورونکی لڑائی کا تماشہ مثلاً ہاتھیونکی لڑائی کا تماشہ بھی ضرور دکھلا دینا چاہیے۔ کوشش ضرور کرنا چاہیے اسمیں ہرج ہی کیا ہے"

خاصہ تراش کے مکان پر بادشاہ نے ایک میز انٹا کھیلنے کی ہم یورپین لوگوں کیواسطے منگا کے رکھوادی تھی۔ اور ہم میں سے کوئی نہ کوئی ضرور دوپہر کو وہاں جایا کرتا تھا۔ چنانچہ اُسی روز میں وہاں گیا۔ دیکھا کہ باڈی گارڈ کے کپتان سے خاصہ تراش صاحب کھیل رہے ہیں میں نے اُنسے کہا کہ "کلکتہ کے مسٹر آر جو میرے بڑے دوست ہیں الہ آباد سے لکھنؤ کی سیر دیکھنے آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُنکو توش خانے کی سیر کا موقع تو غالباً ملجائیگا" اُنھوں نے مہربانی کے لہجے میں جواب دیا کہ "بیشک بیشک۔ تم کہوگے تو میں اپنا ایک چوبدار ساتھ کردونگا وہ سارا توش خانہ دکھلائیگا" چونکہ یہی خاصہ تراش باغ کا نگراں۔ اور توش خانے کا مہتمم تھا۔ لہذا توش خانیمیں جتنی چیزیں قابل دید تھیں اُنکے دکھانیکو اُسکا چوبدار کافی تھا۔ پھر میں نے کھیل دیکھتے دیکھتے رواروی میں اور کسی قدر بے پروائی کے ساتھ کہا کہ "میں جانتا ہوں بالفعل کوئی موقع ہاتھیوں کی لڑائی کا نہوگا" اتنے میں خاصہ تراش نے کہا کہ "کپتان صاحب! نشانہ مار لیگئے۔ بھئی واہ بازی جیت لی" پھر میری طرف مڑ کے کہا کہ "میں سمجھتا ہوں آجکل کوئی ہاتھی مست نہیں ہے" پھر تھوڑی سکوت کے بعد دفعتاً مجھسے پوچھا کہ "کیوں جی۔ تمھارے یہ دوست کچھ تجارتی کاروبار کرتے ہیں نا؟ بھلا اگر میں چاہوں تو وہ میرے واسطے کمپنی کے کچھ نوٹ خرید دینگے؟" میں نے کہا کہ "بیشک۔ وہ تاجر ہی ہیں اور شاید تمنے کلکتہ کے مسٹر آر۔ مالک کارخانہ آر۔ پی۔ اینڈ کمپنی کے مالک کا نام سنا ہوگا۔ بس یہ وہی صاحب ہیں۔ انھوں نے خود بہت کچھ دولت پیدا کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے ممنون بنانیکو ضرور وہ میری ہر ایک بجا خواہش کی تعمیل کریں گے۔ اسپر خاصہ تراش نے کہا "چلو۔ بس ٹھیک ہے۔ معاملہ ٹھیک ہے۔ اچھا تو اب میں بھی جانورونکی لڑائی کا کچھ انتظام کردونگا۔ اگر مست ہاتھی نہیں ہیں۔ نہ سہی۔ شیر اور گینڈے وغیرہ تو موجود ہیں" پھر کھیل میں مصروف ہوکے مجھسے کہا کہ ہماری طرف سے تم شمار کرتے جانا۔ "ایں کپتان صاحب پھر نشانہ مار لیگئے۔ اور بازی ہوگئی۔ اچھا بھئی۔ تمھارے پچاس روپیے کا میں دیندار ہوا"

کھیل ختم ہو چکا تو میں باطمینان تمام اپنی قیامگاہ پر واپس آیا۔ دوسرے دن صبحکو میرے دوست آگئے۔ اور میں جانورونکی لڑائی کی بابت سُن گن لینے دربار شاہی گیا۔ اُسوقت حسب معمول خاصہ تراش بادشاہ سلامت کے بال سنوار رہا تھا اور اُنسے باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ ایک دفعہ ذرا سکوت کرکے اُسنے بادشاہ سے عرض کیا کہ "جہاں پناہ نے بہت دنوں سے جانورونکی لڑائی کا تماشہ ملاحظہ نہیں فرمایا" بادشاہ

نے فرمایا کہ ”ہاں بہت دنوں سے اتفاق نہیں ہوا۔ میں اس لڑائی سے اُکتا گیا ہوں۔ میری دانست میں آجکل کوئی مست ہاتھی بھی لڑائی کے قابل موجود نہیں ہی۔“ اسپر خاصہ تراش نے عرض کیا کہ ”خداوند نعمت ! ہیں تو۔ مجھے آج صبح ہی کو خبر ملی ہی کہ مست ہاتھی موجود ہیں۔“ پھر بادشاہ نے فرمایا کہ ”کیوں کیا تم ہاتھیوں کی لڑائی کی سیر دیکھنا چاہتے ہو؟“ اُسپر خاصہ تراش نے عرض کیا ”قبلہ عالم ! جو حضور کی مرضی۔“ مگر بالفعل مسٹر آر کلکتہ کے ایک بڑے دولتمند تاجر دہلی اور آگرے وغیرہ کی سیر کرتے ہوے یہاں وارد ہوے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھی طرح لکھنؤ کی سیر دیکھکے اور یہاں کی یاد لیکے جائیں۔“ بادشاہ سلامت فرمانے لگے ”بیشک بیشک !! یہ تو ضرور ہونا چاہیے۔ اور میرے نزدیک تم اُنسے کلکتہ یا انگلستان میں کچھ کام بھی لے سکوگے۔“ اسپر اُس خودغرض نے عرض کیا کہ ”جہاںپناہ تو اُڑتی چڑیا کے پر گنتے اور دل کی بات تاڑ جاتے ہیں۔“ غرضکہ یہ طے ہو گیا کہ دوسرے دن ایک بجے چاندگنج میں جانوروں کی لڑائی ہوگی سب طے ہو چکا۔ تو میں اپنے دوست کے پاس یہ مژدہ سُنانے واپس آیا۔ اور میں نے اُنسے کہا کہ ”ذرا آپ خاصہ تراش صاحب سے تپاک کے ساتھ ملیے گا۔ کیونکہ اُنھیں نے تمھارے واسطے یہ سب باتیں طے کی ہیں۔“ وہ کہنے لگے ”بیشک۔ میں اُنسے بہت تپاک سے ملونگا۔ کیونکہ جس حال میں بادشاہ کے منظور نظر ہیں رئیس بھی ہیں تو بھلا ایسے شخص سے کون ایسا ہوگا جو تواضع و تکریم سے پیش نہ آئیگا۔ میں ضرور بہت اخلاق تواضع سے ملونگا۔“ واضح ہو کہ مسٹر آر میں ایک مصاحب بننے کا مادہ پہلے ہی سے بہت کچھ موجود تھا۔

وقت معینہ پر چوبدار حاضر ہوا اور اُسکے ہمراہ ہم قبل اسکے کہ ہم قش خانے جاکر چیتوں کو دیکھیں ”لکھنؤ کے شیروں“ کے دیکھنے کو چلے گئے۔ ان شیروں کی بابت میں تھوڑا بہت بعد کو لکھونگا۔ اس مقام پر یہ ذکر چھیڑ کے اپنے سلسلۂ سخن کو قطع نہ کرونگا۔ اور چیتوں کی بابت تو مجھے آگے چلکے بہت کچھ لکھنا ہی ہی۔ خیر۔ تو اس چوبدار کے ساتھ ہملوگ سیر کو چلے۔ چوبدار کی چوب میں عصاے موسیٰ کیطرح عجب سحر تھا۔ کہ جس سے ہر طلسم ٹوٹ جاتا تھا اور ہم ہر ایک مقام پر بے روک ٹوک چلے جاتے تھے۔ ایوان شاہی۔ دفاتر سرکاری۔ میگزین۔ توپ خانہ۔ امام باڑہ (جسکو پادری ہیبر صاحب نے غایت تقدس سے مسلمانوں کا عبادت خانہ تحریر کیا ہی) مساجد۔ باغات کانسٹنشیا (یعنے جنرل مارٹین صاحب کی کوٹھی) قش خانہ۔ اور رمنہ ہر جگہ اُسکی یکساں تاثیر ظاہر ہوتی تھی۔

دوسرے دن صبحکو ہملوگ چاندگنج سوار ہو گئے۔ کیونکہ اسی مقام پر ہاتھیوں کی لڑائی کا سب سامان کیا گیا تھا۔ یہ مقام شہر سے تین میل کے فاصلے پر دریاے گومتی کے اُس پار تھا اور یہیں معمولاً جانوروں کی

لڑائی ہوتی تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی عمارت ڈاک بنگلہ کے قطع کی بنی ہوئی تھی۔ اور اُسکے گرداگرد ذرا میدان دیکے اونچا اونچا احاطہ کھچا ہوا تھا۔ یہاں پہونچکے میں نے اپنے دوست کو ایک چوبدار کے سپرد کردیا تاکہ وہ اُسکے ہمراہ نشیبی حصۂ عمارت مین بیٹھکے نہایت آسانی کے ساتھ سامنے کے صحن میں جو لڑائی ہوگی اُس کا تماشہ بخوبی دیکھ سکیں۔ میں اسوجہ سے اُنکے ساتھ ساتھ نہیں رہسکتا تھا کہ میرا فرض منصبی یہ تھا کہ اوپر کی منزل میں جاپناہ کی حضوری میں حاضر رہوں۔

جب ڈنکے اور نقارے کی آواز میرے کان میں آئی اُسوقت میں اپنے دوست کو پیچھے چھوڑ کے چل کھڑا ہوا۔ کیونکہ یہ علامت بادشاہ کی تشریف آوری کی تھی۔ اور سوا بادشاہ یا بادشاہ بیگم کی سواری کے اور کسیکی سواری کے ساتھ نوبت نقارہ ہو نہیں سکتا تھا) بالاخانے پر آکے میں اپنی جاے معینہ پر کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں بادشاہ سلامت تشریف لائے اور تخت پر متمکن ہوگئے۔ اور اُنکے پس پشت خواصیں مگس رانی کرنے لگیں۔ ہملوگ اپنے اپنے موقع محل سے اسطرح کھڑے ہوگئے کہ کوئی کٹہرے پر جھکا ہوا تھا اور کسیکا ہاتھ گوشۂ تخت سے ٹکا ہوا تھا۔ بادشاہ سلامت نے میری طرف دیکھا اور پوچھا کہ ”کیوں جی! وہ کلکتہ والے مسٹر آر تمھارے ہاں ٹھہرے ہوے ہیں“ میں نے جواب دیا ”جی۔ پیرو مرشد“ ”ارشاد ہوا“ ”اسوقت کہاں ہیں“ میں نے عرض کیا ”خداوند۔ اُنکو نیچے کے درجے میں ایسے موقع سے بٹھا دیا ہی کہ جہاں سے وہ لڑائی کی سیر بخوبی دیکھ سکتے ہیں“ پھر پوچھا کہ ”تم اُنکو یہاں کیوں نہ لیتے آئے“ مین نے عرض کیا ”حضور مجھے اسکا کچھ خیال نہ رہا کہ جاپناہ اُنھیں حضوری میں باریاب ہونیکی عزت بخشین گے“ بادشاہ نے فرمایا ”لاحول ولاقوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہی۔ ابھی اُنکو یہاں بلوالو۔ وہاں سے کہینا خاک دیکھ سکیں گے“

اگر میں جرأت کرتا کہ بلا صریح حکم شاہی اپنے دوست کو اپنے ساتھ لیے جاتا تو یقیناً اُن بیچارے کو ”دورباش“ ضرور سُننا پڑتی۔ اب یہ حکم پاکے فوراً مین نیچے اُترا اور میں نے اُنسے کہا کہ ”چلو تمھیں جاپناہ یاد فرماتے ہیں“ وہ بولے کہ ”بادشاہ کی یاد فرمائی کا تو میں شکرگزار ہوں۔ مگر مجھے یہیں رہنے دو تو بہتر ہی“ مین نے کہا ”نہیں جی۔ تمکو ضرور چلنا چاہیے۔ نہ جاؤگے تو بڑی توہین فرمان شاہی کی ہوگی“ وہ یہ کہتے ہوے اُٹھے کہ ”بعضے آدمی ایسے ہیں جنپر چھپر پھاڑ کے عزت وعظمت برستی ہی“ اور جلدی جلدی زینے پر چڑھنے لگے۔ مین نے اُنھیں روکا اور کہا ”ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ اتنی تیزی نہ دکھاؤ“ پھر مجھے خیال ہوا اور میں نے کہا ”ایں تم تو خالی ہاتھ بادشاہ کی حضوری میں جاتے ہو۔ کچھ اشرفیاں تو نذر دکھانے کو لیلو“ انھوں نے کہا ”مجھسے تو یہ بات ہونا نہیں ہی۔ کہ خالی بادشاہ کی زیارت کے واسطے اپنی کچھ

اشرفیوں کا خوں کروں۔ میں نے سمجھایا کہ "بھئی۔ یہ صرف ایک رسم ہے۔ کچھ بادشاہ اشرفیاں لے تھوڑی لیں گے۔ وہ تو اپنی سرد مہری یا گرمجوشی کو سر کی جنبش یا ہاتھوں سے اشرفیونکو چھو لینے سے ظاہر کر دینگے چلو۔ بس۔ نذر قبول ہو جائیگی۔ پھر تمکو اشرفیوں پر اختیار رہوگا اپنی جیب میں رکھ لینا"۔ میں نے جلدی سے اشرفیاں کہیں سے مستعار منگائیں اور انکو دیں۔ وہ اشرفیاں لیکے اسطرح چڑھے کہ کھُلی ہتیلی پر ایک سفید رومال تہ کیا ہوا رکھا تھا اُسپر اشرفیاں دھری تھیں۔ اسی انداز سے وہ حضوری میں باریاب ہوے۔ بادشاہ نے پہلے اُنکو بہت غور سے دیکھا۔ پھر ایک ہاتھ اُنکے ہاتھ کے نیچے رکھ کے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اشرفیوں کو چھو لیا۔ یہ گویا بڑی عزت افزائی اور گرمجوشی کی دلیل تھی۔ اور میرے دوست کو اس اعزاز خاص پر فخر کرنا چاہیے تھا۔ بجائے اسکے وہ کچھ بوکھلا سے گئے۔ جسکی توجیہ اُنھوں نے بعد کو مجھسے یہ کی کہ "بادشاہ نے جو اسطور سے اشرفیاں چھوئیں تو میں سمجھا کہ وہ ان اشرفیونکو لیلیں گے۔ اور میں نے یہ قصد کیا کہ اپنی ہتیلی بند کر لوں تاکہ وہ اشرفیاں بچا سکیں۔ کیونکہ ہندوستانیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے"۔ لیکن بادشاہ نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اُنکو اطمینان ہو گیا اور جلدی سے اُنھوں نے اشرفیاں جیب میں پہونچا دیں۔

اسکے بعد اشارہ کیا گیا اور دونوں طرف سے پہلوانِ کوہ پیکر جھومتے ہوے بڑھے۔ یہ ایک معمولی لڑائی ہاتھیونکی تھی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نے دوسرے کو بھگا دیا۔ اسمیں کچھ جدت نہ تھی۔ تاہم میرے دوست نے اُسے بہت حیرت کی نگاہ سے دیکھا اور اُنکو بیحد حظ حاصل ہوا۔ اُنکی اس حیرت و استعجاب پر بادشاہ سلامت بھی بہت محظوظ ہوے۔ لڑائی کے ختم ہونے سے پیشتر ہی بادشاہ اُنسے اسقدر بے تکلف ہو گئے تھے کہ اُنکو تخت پر اپنے پہلو میں بیٹھ جانیکا حکم ہوا۔ مگر اُنھوں نے بلحاظ اسکے کہ ہم سب کھڑے ہوے تھے۔ بیٹھنے کو ایک حرکت بیجا اور نامناسب سمجھا اور عرض کیا کہ "میں بہت آرام سے کھڑا ہوں۔ کچھ تکلیف نہیں ہے"۔ یہ حرکت اُنکی غایت درجہ اُجڈپنے کی تھی۔ کیونکہ بادشاہ نے یہ خاص عزت افزائی اُنکی کی تھی اور اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ایسے داب دربار کے خلاف جواب پر بادشاہ کو غصہ آجاتا اور اپنے سامنے سے نکال دینے کا حکم صادر فرماتے مگر اتنا غنیمت ہوا کہ بادشاہ اُسوقت عالم سرخوشی میں تھے لہذا وہ اس بے تکلفی پر ہنس پڑے اور بیٹھنے کیواسطے دوبارہ اصرار فرمانے لگے اُسوقت میرے دوست نے گھبرا کے میری طرف دیکھا۔ کیونکہ بادشاہ کے ہنسنے سے وہ یہ ضرور سمجھے کہ لاعلمی سے کوئی حرکت خلاف ادب سرزد ہو گئی ہے۔ میں نے اُنسے اشارہ کیا کہ بیٹھ بھی جاؤ۔ چنانچہ وہ فوراً تخت کے ایک گوشے پہ تکلیف و تکلف سے بیٹھ گئے۔ اُنکے بیٹھتے ہی خواصیں جو بادشاہ

وہ فوراً تخت کے ایک گوشے پر بے تکلیف و تکلف سے بیٹھ گئے۔ اُنکے بیٹھتے ہی خواصیں جو بادشاہ کے پس پشت مگس رانی کر رہی تھیں۔ اب بادشاہ اور اُنکے مہمان دونوں کی پشت پر مگس رانی کرنے لگیں کیونکہ دربار کا یہ معینہ آئین تھا۔

آخرکار ہاتھیوں کی لڑائی ہو چکی۔ سب لوگ اُٹھکے اپنے اپنے ہاتھیوں پاس پہونچے۔ میں بادشاہ کو گاڑی پر سوار کرانے چلا گیا۔ بادشاہ نے گاڑی پر سوار ہوتے وقت مجھسے فرمایا کہ "آج ہم اکیلے ہی کھاتے۔ تم اپنے دوست کو اپنے ساتھ لیتے آنا۔" جسوقت اُنھوں نے یہ ارشاد فرمایا تھا اُسوقت وہ اپنے منظور نظر کے شانے پر سہارا دیے کھڑے ہوئے تھے۔

جب میں مسٹر آر کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہولیا۔ تو میں نے اُنسے کہا کہ "یار جے۔ تم بڑے خوش نصیب ہو آج تمکو جہاں پناہ کے ساتھ خاصہ نوش کرنا ہوگا۔" اُنھوں نے جھنجھلا کے کہا "میری کمبختی آئی ہے بادشاہ کے ساتھ کھانا کھانے سے تو ہزار درجہ میں اسکو بہتر سمجھتا ہوں کہ اکیلے یا تمھارے ساتھ کھاؤں۔" میں نے کہا کہ "غضب کرتے ہو۔ کہیں ایسا بھی ہوسکتا ہی۔ تم تو بادشاہ کے منظور نظر ہو چلے ہو۔ یہ عزت افزائی کیا کچھ کم تھی کہ اُنھوں نے تمکو اپنے برابر بیٹھنے کا حکم دیا۔" وہ بولے "واہ۔ اچھی عزت افزائی تھی۔ میں باز آیا ایسے اعزاز سے۔ مجھے ایسے بیٹھنے سے کھڑے رہنا گوارا تھا تخت کے باڑھ دار کنارے نے مجھے بہت بیچین رکھا۔"

باوجودیکہ بظاہر میرے دوست اس اعزاز کی ہجو کر رہے تھے اور ناخوش معلوم ہوتے تھے مگر دل ہی دل میں وہ اسپر خوش بھی تھے کہ ایک ہی دفعہ کی ملاقات میں بادشاہ کے دل پر اُنکی صحبت کا اچھا نقش ہوا۔ میں نے اُنکو بہت ہی آسانی سے بادشاہی دعوت قبول کر لینے پر راضی کر لیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُنکو خود یہ خیال پیدا ہوا کہ قدرت نے اُنکو بادشاہ کی مصاحبت کیواسطے زیادہ موزوں بنایا ہی نہ تاجرانہ زندگی بسر کرنیکو۔ کیونکہ ایسے ہی کسی خیال کیوجہ سے اُنھوں نے دعوت میں جاتے وقت اپنا بناؤ چناؤ بہت دیر تک کیا اور معمول سے کہیں زیادہ بن سنور کے چلے۔

جب ہملوگ بادشاہ کے پیچھے پیچھے کھانیکے کمرے میں داخل ہوئے۔ اُسوقت معلوم ہوا کہ بادشاہ کا یہ منشاء ہی کہ وہ اپنے پہلو ہی میں میرے دوست کو جگہ دینگے چنانچہ اُنھوں نے سیدھے ماسٹر صاحب سے مخاطب ہوکے فرمایا "ماسٹر جی۔ یقین تو ہے کہ تم مسٹر آر کو میرے پہلو میں بیٹھنے کو جگہ دوگے۔" اسپر ماسٹر صاحب نے فوراً اُنکے واسطے جگہ خالی کر دی۔ میرے دوست یہاں اعزاز بخشیوں کی ایسی بھرمار ہو رہی تھی کہ ہر جدید عزت افزائی کو وہ نہایت سہولت اور سنجیدگی سے قبول کرتے تھے چنانچہ

وہ اس انداز سے کرسی پر جا کے بیٹھے جیسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُنکی تمام عمر خاصے کی میز پر بادشاہونکے پہلو میں بیٹھتے گزری ہی۔

جب کھانے باری باری سے آنے لگے اور شرابوں کی بوتل پر بوتل کھُلنے لگی تو بادشاہ سلامت کا غنچۂ خاطر شگفتہ ہوا۔ حجاب و تکلف کے پردے اُٹھ گئے۔ بادشاہ نے میرے دوست سے مخاطب ہوکے فرمایا "ہمارے ایک بڑے جگری دوست آجکل انگلستان میں ہیں۔ تم وہیں جاتے ہونا" واضح ہو کہ یہ جگری دوست ایک انگریز تھے جو سابق میں رزیڈنٹ اودھ رہ چکے تھے اور اُنسے بادشاہ سلامت سے بڑی بے تکلفانہ دوستی ہوگئی تھی۔ ان صاحب کا نام مسٹر اسمتھ فرض کیے لیتا ہوں کیونکہ یہ نام بھی اُنپر زیب دیتا ہی۔ اسمتھ صاحب کی بیوی کی صورت بہت دلفریب تھی۔ اور مشہور تو یہ ہے کہ بادشاہ بہ نسبت مسٹر اسمتھ کے مسز اسمتھ کے زیادہ گرویدہ تھے۔ چونکہ یہ واقعات میرے زمانۂ ورود لکھنؤ سے پیشتر کے ہیں اور میں جو کچھ لکھتا ہوں وہی لکھتا ہوں جو زبانزد عوام و خواص ہی۔ مشہور ہے کہ جب اسمتھ صاحب لکھنؤ سے علیحدہ ہوے تب اُنکے پاس پچھتر لاکھ روپیہ تھا۔ اور یہ معتدبہ رقم مسٹر اسمتھ صاحب کے نام سے کمپنی کے کاغذات میں جمع تھی۔ یہ بھی مشہور ہی کہ اسکی بابت تحقیقات بھی کی گئی اور بنگال گورنمنٹ نے بہت اخفا کے ساتھ کارروائی تحقیقات عمل کی جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ اسمتھ صاحب ملازمت سے مستعفی ہوکے انگلستان چلے گئے۔

پھر بادشاہ سلامت نے فرمایا کہ "میرے بڑے گہرے دوست اسوقت انگلستان میں ہیں اور تم وہیں جاتے ہو" یہ کہتے وقت بادشاہ کی آواز میں ایک دردسا پایا جاتا تھا۔ یہ کچھ کچھ تو اندرونی جذبات طبیعت کے اشتعال اور کچھ شامپین کے اثر سے تھی۔ میرے مسٹر آرتھر نے کسی قدر جرأت کرکے سوال کیا کہ "حضور انگلستان میں ایسا کون ہی جسے حضور کی دوستی کا اعزاز حاصل ہوا ہو" بادشاہ بولے "واہ واہ۔ آپ کو کچھ خبر بھی ہی۔ وہاں میرے دوست اسمتھ صاحب ہیں جو سابق میں یہاں رزیڈنٹ تھے" میرے دوست فوراً پکار اُٹھے کہ "اے وہ مسٹر اسمتھ! اخاہ۔ میں اُنھیں خوب اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ کیونکہ میں ایک زمانے میں اُنکا مختار و کارکن رہ چکا ہوں" بادشاہ نے خوش ہوکے فرمایا "میرے اچھے دوست میرے بڑے اچھے دوست تم کہتے ہو کہ تم اُنسے بخوبی واقف ہو۔ میں تو اُنسے بہت محبت کرتا تھا اور ہے —— خیر۔ اب کیا ہی۔ معاذاللہ۔ معاذاللہ۔ میرا دل بیتاب ہی۔ ہاں۔ صاحبو۔ ذرا اپنے اپنے گلاس بھرو۔ خوب بھرو۔ لبالب بھرو۔ اور مسٹر اسمتھ کا جام صحت و تندرستی نوش کرو"

سبھوں نے غٹ غٹ جام صحت نوش کیا۔ بعد اسکے پھر بادشاہ نے ارشاد فرمایا "اچھا سے

اب پھر اپنے اپنے جام بھرو۔ چھلکتے ہوئے بھرو۔ لبالب بھرو۔ اور مسز اسمتھ کا جام صحت دوبارہ پیو۔" پھر دو دورے ہو گئے اور شاہپین کی بوتل پر بوتل یاروں کے حلق کے نیچے اُتر گئی۔ اب بادشاہ بالکل مست ہو رہے تھے۔ اور کچھ تو جذبات کی اشتعالک اور کچھ شاہپین نے آپے سے باہر کر دیا تھا۔ بادشاہ نے میرے دوست سے پوچھا "کیوں جی۔ انگلستان میں تم مسٹر اسمتھ سے بھی ملو گے کہ نہیں؟" مسٹر آر نے عرض کیا کہ "میں اُنسے ضرور ہی ملونگا۔ کیونکہ مجھے اُنسے کچھ خاص کام بھی ہے۔" تب بادشاہ نے اپنی نہایت خوبصورت اور مرصع گھڑی جو ایک اعلیٰ درجے کے کاریگر کی بنائی ہوئی تھی اور پندرہ ہزار فرانک (مکایاذ النس ..... کو شہر پیرس سے خرید ہو کے آئی تھی۔ مع زنجیر مرصع اپنے گلے سے اتار کے اپنے دست مبارک سے مسٹر آر کے گلے میں پہنا دی اور ہکلا ہکلا کے فرمایا کہ "بھئی دیکھو! ایک جنٹلمین کا ایسا قطعی وعدہ مجھسے کرو کہ یہ گھڑی مع زنجیر بجنسہ تم اسمتھ صاحب کی میم صاحبہ کے گلے میں پہنا دو گے اسی طرح سے پہنانا جیسے میں نے تمہارے گلے میں پہنائی ہے۔ دیکھو وعدے کا خیال رکھنا۔" مسٹر آر نے جواب دیا کہ "حضور۔ میں بحیثیت ایک جنٹلمین کے اپنی زبان دیتا ہوں کہ میں اسکو اسی طرح اسمتھ صاحب کی میم کے گلے میں پہنا دونگا بشرطیکہ اُنھوں نے منظور کیا۔" بادشاہ نے فرمایا کہ "وہ تم اُنسے کہدینا کہ یہ میری نشانی ہے۔ وہ بے تکلف منظور کر لینگی۔" پھر خاصہ تراش سے مخاطب ہو کے فرمایا کہ "خان جاؤ۔ حکم دیدو کہ ہمارے دوست مسٹر آر کے واسطے ایک خلعت۔ مگر دیکھو گراں بہا خلعت ہو۔ مع پانچسو اشرفیوں کے فوراً لائیں۔" چنانچہ بتعمیل حکم شاہی فوراً ایک خلعت جسمیں دو نہایت بیش قیمت کشمیری شالیں اور ایک رومال گلوبند تھا آیا۔ اور خود بادشاہ نے اپنے دست مبارک سے اور خاصہ تراش کی اعانت سے اُسکو اپنے نئے دوست مسٹر آر کے کاندھے پر ڈال دیا۔ جسکی گرمی سے بیتاب ہو کے مسٹر آر پسینہ پسینہ ہو گئے اور جی ہی جی میں اپنی عزت افزائی پر اسقدر خوش تھے کہ باچھیں کھلی جاتی تھیں۔

یہ خوش فعلیاں صبح تک ہوتی رہیں۔ بادشاہ سلامت صرف مسٹر اسمتھ اور اُنکی میم صاحبہ کا تذکرہ ایسے ایسے عنوان سے فرماتے رہے جسکی تفصیل لکھنا مناسب مصلحت نہیں۔

جلسہ برخاست ہوا۔ بادشاہ کو لوگ سہارا دیکے حرم سرا میں لیچلے۔ چلتے چلتے وہ بڑے تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ مسٹر آر سے جو ہنوز مخلع تھے رخصت ہوئے۔ اب میں اپنے دوست کے ساتھ پالکیوں میں سوار ہو کے نیچے برآمدے میں آیا۔ جہاں ہماری گاڑیاں انتظار میں موجود تھیں گو فاصلہ زیادہ نہ تھا مگر زینے بڑے پونسے چڑھنے کرنا پڑتے تھے۔

دوسرے دن ہمکو کھانے سے پیشتر نواب کے ایک خادم نے اشرفیوں کی تھیلی لا کر نذر پیش کی

گئی ہوئی پانچسو اشرفیاں تھیں۔ کہنے لگا کہ حضور جہاں پناہ نے جو خلعت مسٹر آر صاحب کو دیا ہے یہ اُسی کے ساتھ کی اشرفیاں ہیں پہلے تو مسٹر آر کو ان اشرفیوں کے لینے میں تامل ہے اور یہ ارادہ ہوا کہ واپس کر دیجائیں مگر میں نے انکو سمجھایا[1] کہ اس سے بڑھکے اور کیا گستاخی ہوسکتی ہے۔ غرضکہ بہت گفت وشنید کے بعد وہ راضی ہوگئے کہ اس رقم کو قبول کریں۔ ہنستے ہوئے بولے آٹھ سو پاؤنڈ اپنی جیب میں داخل فرمائیے۔ کیونکہ یہ بات آداب دربار میں داخل تھی کہ عطیات شاہی فوراً قبول کر لینا چاہیے نہ قبول کرنے میں علاوہ تحقیر شاہی کے یہ مطلب نکلتا ہے کہ یہ رقم مقدار میں کم ہے۔ جس سے معنًا ایک طرح کی حرص بھی ترشح ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہی ہرکارہ میرے لیے فوراً حاضری دربار کا حکم لیکر آیا۔ میں جھٹ پٹ حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی بادشاہ نے فرمایا کہ "میں تمھارے دوست سے ملکے بہت محظوظ ہوا۔ اُنھوں نے تو مجھے اپنا گرویدہ کر لیا ہے اُنسے کہو کہ اگر وہ یہاں کا قیام گوارا کرکے میری ملازمت قبول کرلینگے تو میرے بہت بڑے دوست ہو جائینگے۔" اسپر خاصہ تراش صاحب کو بہت تشویش لاحق ہوگئی اور جب میں واپس جانیلگا تو وہ مجھے دروازے پر ملے اور پوچھنے لگے "کیوں جی۔ بھلا تمھارا خیال کیا ہے مسٹر آر ٹھہرینگے کہ نہیں؟" میں نے کہا "میں ٹھیک طور سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بادشاہ کی عنایات بعید از انداز سے وہ خوش تو بہت معلوم ہوتے ہیں۔"

مکان پہونچکے میں نے اپنے دوست کو شاہی پیام سُنایا۔ مگر اُسکو سنکے انھوں نے بہت کچھ اپنا امتنان ظاہر کیا اور کہا کہ میں مصمم عزم کرچکا ہوں اور اُسے فسخ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اُسی شب کو وہ لکھنؤ سے روانہ ہوگئے۔ سچ یہ ہے کہ ایک آوارہ وطن کیلیے حب وطن اور بالخصوص انگلستان جیسے وطن کے مقابلہ میں الطاف وعنایات شاہی کی کچھ وقعت ہو نہیں سکتی

غالباً ناظرین کتاب ہذا یہ خیال کرینگے کہ ہزارہا روپیہ اور صدہا اشرفیوں کی داد ودہش ادنیٰ درجے کے منظور نظر اشخاص پر اور قریب قریب دس ہزار پاونڈ ماہوار سے خاصہ تراش کے حساب کی بیباقی اور نیز امراء کی فضول خرچی واسراف سے بادشاہ کا خزانہ بہت جلد خالی ہوگیا ہوگا۔ بلاشک یہ خیال صحیح ہے کہ ملک اودھ کی آمدنی برائے نام پندرہ لاکھ سالانہ تھی اور اسمیں جملہ اخراجات فوج ودربار شاہی ادا کیے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی اسکے یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ نصیر الدین حیدر کے والد غازی الدین حیدر بادشاہ نے خزانہ بھرا پُرا چھوڑا تھا اور اُسے نصیر الدین حیدر نے اپنی داد ودہش اور اسراف سے بالکل خالی کر دیا۔ یہ بات بھی تھی کہ معمولی آمدنی ملک کے علاوہ کثرت سے ضبطیاں اور جرمانے برابر ہوا کرتے تھے۔ اور اُسمیں اتنی رقم آجایا کرتی تھی جو بادشاہی انعامات وعطیات کو مجرا دیکے بھی کچھ بچ رہتی تھی۔ ماورا اسکے اکثر اہل خاندان شاہی کی دولتیں بادشاہ کے ہاتھ لگتی تھیں اور باوجودیکہ آمدنی کے اتنے سب ذریعے تھے پھر بھی نصیر الدین حیدر کے عہد سلطنت کے ختم ہونے سے ایک یا دو برس پیشتر دربار لکھنؤ میں روپے کی کمی کی چار طرف سے چیخ پکار مچی ہوئی تھی

---

[1] آپ کیوں نہ سمجھائے۔ آپکا تو کمیشن مقرر ہوگا۔ سچ کہیے کیا ٹھہرا تھا۔ ٹھیک کا معاملہ تھا!

باب ششم

عمارات نفیسہ

قصر شاہی یعنی فرح بخش کی بنسبت اگرچہ میں تھوڑا بہت لکھ چکا ہوں مگر ابھی اُسکے متعلق کچھ اور بھی لکھنا باقی ہی۔ اُسکی وسعت اور گنجائش۔ اُسکے متعدد قطعے اور ہر قطعے میں اچھے خاصے صحن۔ جسکے تالاب یا آراستہ حوضیں۔ اُسکے مختلف باغچے اور چمن۔ اور اُسکے لانبے لانبے مکانات شاگرد پیشہ کی ایک نظر دیکھ لینے سے صرف اُسکی بیرونی شوکت اور اوپری اوپری حالت کا اندازہ ہوسکتا ہی لیکن اُسکے دروں دروازوں کی بھاری بھاری پردے اُسکی دیواروں پر گنگا جمنی ملمع کاری اور رنگ آمیزی اُسکی زرق برق آرائش و زیبائش اُسکے ذخیرۂ نوادرات و عجائبات صنعت۔ اُسکے نظر خیرہ کرنیوالے جھاڑ۔ فانوس۔ کنول۔ مردنگ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ قصر شاہی کے اندر کیا کچھ ہی۔ اور کن مخصوص چیزوں سے اُسکی اصلی نمود ہی۔

اسی کوٹھی میں وہ کمرہ بھی تھا جسمیں تخت شاہی رکھا تھا اور اُسکی کیفیت خاص طور سے بیان کرنا ضروری ہی۔ تقلید یورپ کے محض خبط نے نصیر الدین حیدر کے وقت میں جسطرح قصر شاہی کے اور حصص میں اپنا رنگ دکھایا تھا اسی طرح اس کمرے کی دیواروں پر چھائے ہوئے سُرخ رنگ کے زربفتی پردے پڑے لٹکتے تھے جو بجائے خود بہت فریبندہ و دلچسپ تھے۔ دیواروں پر ادہر اُدھر کیطرف جو کھڑکیاں تھیں اُنسے بہت پاک و پاکیزہ ہلکی ہلکی روشنی پھیلتی تھی کہ جس سے شاہی دربار کا جبروت دوبالا ہوجاتا تھا۔ انھیں پردوںکے بیچ بیچ میں شاہان اودھ کی چند قد آدم تصویریں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ تصویریں کسی طرح بُری نہیں کہی جاسکتی تھیں۔ اور پادری ہیبر صاحب نے یہ بہت منصفانہ بات کہی ہی کہ غازی الدین حیدر اول شاہ اودھ کی تصویر جس مصور نے کھینچی ہی وہ اگر لندن یا پیرس جاتا تو وہاں بھی نام و نمود پیدا کرتا۔ اس وسیع دالان کے ایک سرے پر جو ذرا بلند تھا تخت شاہی رکھا ہوا تھا۔ اور وہ بہت ہی گراں بہا تھا۔ وہ بالکل ایک چبوترے کی قطع کا تھا، وسعت میں دو گز مربع فرش سے چند فٹ بلند اور اُسکے سامنے کی طرف چند سیڑھیاں طے کرکے اُسپر پہونچنا ہوتا تھا۔ باقی تین طرف سونے کا کٹہرا لگا تھا۔ اس چبوترے کی دیواریں ٹھوس چاندی کی تھیں اور اُنپر بافراط جواہرات جڑے ہوے تھے۔ سابق شاہ اودھ یا نوابان اودھ کی عادت یہ تھی کہ اسی چبوترے پر ایک اعلیٰ درجے کا مسند بچھوا کے مشرقی لوگوں کیطرح زانو توڑ کے (جیسے ہمارے ملک میں درزی بیٹھتے ہیں) بیٹھتے تھے۔ لیکن نصیر الدین حیدر کا یورپین مذاق بھلا اُسکو کیونکر گوارا کرسکتا تھا انھوں نے ایک بیش بہا و نفیس کرسی جو سونے اور ہاتھی دانت کی بنی تھی بجائے مسند کے اسی تخت پر رکھوا دی تھی

اس تخت پر ایک مربع شامیانہ تنا ہوا تھا جسکی چوبیں اندر سے لکڑی کی تھیں اور اوپر سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ اس شامیانے اور شامیانے کی چوبوں میں گراں بہا جواہرات بے حساب جڑے ہوئے تھے۔ اسی شامیانے میں سامنے کے رُخ پر ایک بہت ہی بڑا زمرد جڑا ہوا تھا جسکے بابت کہا جاتا ہی کہ دنیا مین اُسکا ثانی نہیں ہی۔ کمرے کے دروں کیطرح اس شامیانے کے پردے بھی ارغوانی رنگ کے نہایت نفیس کاشانی مخمل کے تھے جنپر سنہری زردوزی کام بنا ہوا تھا اور گرد موتیوں کی جھالر ٹنگی ہوئی تھی۔ تخت کے داہنے جانب پہلو میں ایک سنہری ملمع کی کرسی صاحب رزیڈنٹ کیواسطے ہمیشہ رکھی رہا کرتی تھی

دربار عام کے مواقع پر یا کسی خاص مجلس شورے میں کل عمائد اودھ۔ اور وہ انگریز حکام جنھیں رزیڈنٹ صاحب پیش کرنا چاہتے تھے حضوری شاہ میں باریاب ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہاتھوں میں اُسی طرح نذریں لیکے چلتے تھے جسطرح میں بیان کرچکا ہوں۔ اور جب کمرے میں داخل ہوتے تھے تو سر نیاز جھکاتے اور بہت جھک جھک کے تسلیمیں بجالاتے حاضر ہوتے تھے پھر جسکے حال پر بادشاہ مہربان ہوتے تھے اُسکی نذر اپنے ہاتھ سے چھو لیتے تھے اور جسپر کچھ عتاب ظاہر کرنا منظور ہوتا تھا اُسکو دور ہی سے اشارہ کر دیتے تھے۔ بعد اُسکے نواب یعنی وزیر اعظم نذریں لے لیکر تخت کے ایک کنارے پر رکھتے جاتے تھے اور درباری لوگ نذریں پیش کرکے پچھلے پاؤں پیچھے ہٹ جاتے تھے اور اگر انگریز ہوتے تھے تو تخت کے داہنی جانب اور ہندوستانی ہوتے تو بائیں جانب مودب کھڑے ہوجاتے تھے۔ جب سب نذریں گزر چکتی تھیں۔ تب بادشاہ ایک ہار صاحب رزیڈنٹ کے گلے میں پہناتے تھے۔ اُسپر صاحب رزیڈنٹ ایک ہار بادشاہ کو پہنا دیتے تھے۔ ان مراسم کے ادا ہوچکنے پر بادشاہ اور صاحب رزیڈنٹ دونوں اُٹھکے اس کمرے کے وسط میں آکے کھڑے ہوجاتے تھے اور جن لوگوں کو خود بادشاہ سرفراز فرمانا چاہتے تھے یا صاحب رزیڈنٹ کی خواہش ہوتی تھی کہ سرفراز فرمائے جائیں انھیں ہار پہنائے جاتے تھے۔ یہ ہار اکثر سنہری گوٹے کے بنے ہوتے تھے۔ ہم ملازمان خانگی کو اکثر یہ ہار عطا ہوا کرتے تھے اور یہ لوگ بعد کو انھیں دربار کے ہندوستانی جوہری کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ اُنکی قیمت پانچ روپے سے لیکر پچیس روپیہ تک ہوتی تھی

ہاروں کی تقسیم کے بعد دربار برخاست ہوتا تھا اور بادشاہ کمرے کے دروازے تک صاحب رزیڈنٹ کی مشایعت کو آیا کرتے تھے۔ اور رخصت کیوقت اُنکے ہاتھ مین تھوڑا عطر گلاب ٹپکاکے فرماتے تھے "خدا حافظ" اسکے بعد بعجلت تمام بادشاہ اپنے بیچ کے کمرے میں تشریف لاتے تھے اس کمرے میں ہم سب ملازمان خانگی ناشتے کی میز پر اُنکی تشریف آوری کے منتظر ہوتے تھے۔ یہاں آتے ہی آتے وہ بہت ہی بے تکلفی اور سادگی سے شاہی تاج اور قبائے شاہی اُتار کے پھینک دیتے تھے اور انگلیاں چٹخانے لگتے تھے۔ اور پھر

کرسی پر متمکن ہوکے فرماتے تھے "ہاں یارو تازہ بتازہ نو بنو - خدا نے بڑا فضل کیا کہ جلد فرصت ہوگئی - افوہ! پیاس کے مارے میں تو جاں بلب ہو رہا ہوں - معاذ اللہ - یہ سارے تکلفات مجھے تو تھکا مارتے ہیں"

بلحاظ فن تعمیر کے بادشاہ کا امام باڑہ جو شاہ نجف کے نام سے مشہور ہے لکھنؤ کی نہایت نفیس عمارتوں میں اول درجے کی عمارت ہے - امام باڑہ اس عمارت کو کہتے ہیں جو شیعہ مسلمان محرم کی عزاداری کیواسطے بناتے ہیں جسکا ذکر آگے چلکے کسی باب میں مفصل کرونگا - اکثر ذی مقدور خاندان اپنا اپنا امام باڑہ جداگانہ تعمیر کراتے ہیں اور اکثر صاحب تعمیر اُسی میں دفن بھی ہوتے ہیں -

قدیم امام باڑہ شاہی لکھنؤ میں رومی دروازے کے متصل واقع ہے - یہ دروازہ اُس دروازے کی نقل بنا ہے جسکی وجہ سے سلطان ٹرکی کو باب عالی کا لقب ملا ہے - امام باڑہ اور رومی دروازہ دونوں تعمیریں بہت عمدہ بنی ہیں اور ایک عمارت دوسری عمارت پر موزوں ہے - امام باڑے میں سامنے کیطرف دو بڑے بڑے وسیع صحن ہیں - جن پر عمدہ تراشے ہوئے پتھروں کا فرش ہے - اور اندرونی صحن بیرونی صحن سے چند فٹ بلند ہے - اس امام باڑے کی وضع کو پادری ہیبر صاحب نے مشرقی گاتھک کی قطع کا قرار دیا ہے - اس عمارت میں اُونچے - نکیلے گنبد ہندوؤں کے مندروں شوالوں کے قطع کے ہیں اور بلند مینارے مسلمانوں کی مسجدوں کے ایسے بنے ہوئے ہیں - بحالت مجموعی یہ عمارت نہایت مرتفع خوشنما شاندار اور متناسب ہے - اس عمارت میں بیچ کا دالان طولاً ۱۵۰ فٹ اور عرضاً ۵۰ فٹ سے زائد ہے اسکی آراستگی کی شان و شوکت کو اسی بات سے قیاس کرنا چاہیئے کہ ایک سنجیدہ خیال نامہ نگار[1] جسنے یقیناً بچشم خود اُسے دیکھا تھا - نے لکھا ہے کہ "اودھ کے بڑے سیر چشم اور اولوا العزم نواب وزیر یعنے آصف الدولہ نے اس امام باڑے کو دس لاکھ پاؤنڈ کے جھاڑ فانوس اور آئینوں سے سجا تھا"

اب میں کانسٹنشیا یعنی جنرل مارٹین صاحب کی کوٹھی کے حالات بیان کرتا ہوں - عمارتوں کا یہ سلسلہ ناتمام ہی جسکے دیکھنے سے اُسکے بانی کے تلون طبع اور جدت پسندی آشکارا ہے - جنرل مارٹین صاحب فرانسیسی کا تعمیر کیا ہوا ہے - گزشتہ صدی کے خاتمے پہ یہ حضرت کمپنی کی فوج میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے داخل ہوئے - بعد چندے اُنکے خدمات نواب اودھ کی فوج میں منتقل ہوگئے یہاں پہونچکے درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے وہ جنرل فوج ہوگئے - اسی ترقی مراتب کیساتھ ساتھ انھوں نے دولت فراواں حاصل کرلی - چونکہ مرغ بازی میں بڑے ہوشیار تھے اور کمال رکھتے تھے اس لیے نواب سعادت علیخاں کو انسے بازی بدنے کا بہت شوق تھا -

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۳ صفحہ ۳۵۱

جنرل مارٹین صاحب نے ایک لاکھ پاؤنڈ کی ایک جائداد اپنے مولد مقام لیانس مین یتیم بچونکی تعلیم کیواسطے ایک مدرسہ قائم کرنے کی غرض سے چھوڑی۔ اور اتنی ہی مقدار کی ایک اور جائداد اسی طرح کی ایک اسکول کی کلکتہ میں قائم کرنیکی غرض سے چھوڑی۔ اور پھر قریب قریب اتنی ہی جائداد اور چھوڑی کہ جس سے لکھنؤ میں بھی ویساہی مدرسہ قائم کیا جائے۔ انمیں سے ہر ایک مدرسہ کا نام لامارٹینیر رکھا گیا۔ کیونکہ اُسکے بانی کی یہی ہدایت تھی۔ اور یہ سب مدرسے بخوبی چل رہے ہیں اور اُنکی بدولت بہت فیض جاری ہی کانسٹنشیا جسمیں وہ خود رہتے تھے اُسکو اُنھوں نے سرائے یا کالج کے کیواسطے چھوڑا تھا۔ میں نے سنا ہو کہ اس عمارت کا نام اُنھوں نے اپنی پہلی معشوقہ کے نام پر رکھا تھا جنکو وہ اپنے وطن فرانس میں چھوڑ آئے تھے اور جنھوں نے اُنکی ترقی دولت و ثروت سے پیشتر دنیا کو خیرباد کہدیا تھا۔ اس خیال سے کہ مرنے کے بعد کہیں نواب اُنکی کوٹھی ضبط کرلیں۔

جنرل صاحب نے یہ وصیت کردی تھی کہ میں اسی کوٹھی مین دفن کیا جاؤں۔ چنانچہ وہ اُسی میں دفن کیے گئے۔ کیونکہ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ مسلمان چاہے کتناہی ظالم کیون نہو قبر کی بزرگداشت ضرور کرتا ہے۔ جو سیاح اس عمارت کو دیکھنے جاتے ہیں اُنکو جنرل صاحب کی قبر ایک زیرزمین تہ خانے میں دکھائی جاتی ہو اوپر ایک تابوت بنا ہو جسے دو رنگین صورتیں سپاہیونکی اُٹھائے ہوے ہیں۔ اور اسی تابوت پر جنرل صاحب کا ایک بت سنگ مرمر کا تراشا ہوا رکھا ہو۔ یہ ساری دستکاری اور نقاشی نہایت اعلیٰ درجے کے مذاق سلیم کو ظاہر کررہی ہو۔

جنرل صاحب کے مرنے پر اُنکی کوٹھی کا اسباب آرائش نیلام ہوا تھا جسکو کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے ایجنٹوں نے نواب گورنر جنرل کی کلکتہ والی کوٹھی کی آراستگی کے واسطے خرید کرلیا تھا۔ چونکہ کمپنی کے مقابلے کی وجہ سے بادشاہ نے اس نیلام میں بولی نہیں بولی تھی اسوجہ سے کمپنی کو یہ سارا سامان بالکل اونے پونے مل گیا تھا۔ اور کمپنی کو اس تاجرانہ چال پر بڑا ناز تھا۔ شاید ایسی چالاکی تو کوئی معمولی دست فروش سوداگر بھی نہ کرتا۔

یہ جو کہا گیا ہو کہ کانسٹنشیا کی عمارت بہت وسیع اور بے تکان ہو حقیقت مین سچ کہا گیا ہو۔ مجھکو اس مقام کے بعض حصص کو دیکھنے سے مارسیلز کے باغات یاد آگئے۔ بالخصوص اُس مقام پر جہان ایک نہر صلیب کی قطع کی نکالی گئی ہو اور اُسکے گرد خوبصورتی سے ترشے ہوے درختوں کے جھنڈ لگے ہوے ہین۔ لیکن اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہو کہ ان نتائج پیش نظر کے حاصل کرنیکے واسطے زر خطیر صرف کیا گیا ہوگا تاہم جو کچھ سامنے نظر آتا ہو وہ بحالت مجموعی بے جوڑ اور بھچپل سا ہوتا ہو۔ کیونکہ اس عمارت کے صحن اور فوارے تو بہترین ہیں مگر گنبد اور مینار

ایشیائی وضع قطع کے ہیں۔ گھرونکی شان تو کچھ یورپین ہی لیکن برآمدے اور دریچے بالکل ہندوستانی ہیں

لکھنؤ کی مسجدیں اور بازاریں دیگر مشرقی شہرونکی بازاروں اور مسجدوں سے کچھ ایسے زیادہ مختلف الوضع نہیں ہیں جنکی تصریح کی زیادہ حاجت ہو۔ البتہ بازارونمیں سب سے نرالی ادا جو ہی وہ اسی قدر ہی کہ انھیں بکثرت مسلح لوگ سپاہیانہ منش کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کہ یہ بات کہیں اور پائی نہیں جاتی۔ معمولی طور سے یہان کے رئیس اور امیر جب سڑک پر نکلتے ہیں تو انکے ساتھ کچھ ہتھیار ضرور ہوتے ہیں۔ اور جسقدر جو شخص امیر عالی مرتبہ ہوتا ہی اسی قدر ہمراہیوں کی تعداد اسکے جلو میں زیادہ ہوتی ہی۔ اور شہر کے نشیبی حصے میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہی کہ گلیون میں انھیں سپاہیوں کیوجہ سے دنگا فساد ایک ادنی سی تکرار پر ہو جاتا ہی جب کبھی اس قسم کی ہنگامہ آرائی ہوتی ہی تو لڑنیوالونکی شور وغل سے دور دور تک خبر پہونچ جاتی ہی جس سے صلح جو یا بزدلے لوگ اسوقت اپنی گھرون سے باہر نہیں نکلتے اور اُس گلی کا رخ نہیں کرتے جہان سے غل اُٹھتا ہی البتہ شوریدہ سر لڑنے بھڑنے والے لوگ ہر طرف سے اُمنڈ آتے ہیں۔ اور اسطور پر اکثر اوقات بہت سخت خونریزی ہو جایا کرتی ہی یہی حالت اسوقت تھی جب ۱۸۳۵ء میں میں لکھنؤ میں تھا اور اخبارات سے معلوم ہوتا ہی کہ اب بھی ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ کی یہی حالت ہی۔

لکھنؤ کے اول درجے کے مکانات کی ایک خصوصیت خاص ذکر کرنے سے رہگئی۔ یعنی یہ کہ اکثر ان عمارتوں میں زیر زمین بہت مکانیت ہوتی ہی۔ اور جب گرمیوں کے موسم میں آفتاب کی تمازت اور موسمی حرارت بہت بڑھجاتی ہی تو لوگ جان بچانے کو اُنھیں تہ خانوں میں جا کے چھپتے ہیں۔ یہ عجب بات ہی کہ ایک حصۂ دنیا میں لوگ شدت سردی سے محفوظ رہنے کے واسطے تہ خانوں میں پناہ لیتے ہیں اور ایک حصے میں شدت گرمی سے محفوظ رہنے کے واسطے۔ یا اس سرے یا اُس سرے۔

قصر شاہی میں بھی ایک تہ خانہ تھا۔ جسکی سطح صحن کی سطح سے بھی نیچی تھی۔ اور ہم یورپین درباریکے نزدیک یہ زیر زمین کمرے بہت ہی بند بند تھے۔ اسکی ہوا سے جی گھبراتا اور دم گھٹنے لگتا تھا۔ میں تو اوپر کے کمرونکی۔ جلتی بھنتی گرما گرم ہوا کے تھپیڑون کو اُس تہ خانے کے بند کثیف اور دم گھٹنے والی ہوا پر ہر طرح ترجیح دیتا جسمیں قبلہ عالم اور جہان پناہ جا کے پناہ لیا کرتے تھے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان تہ خانوں میں بادشاہ نے ہمکو بہت کم یاد فرمایا۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود بادشاہ سلامت کو بھی وہ زیادہ پسند نہیں ہیں۔ سچ یہ ہی کہ جسوقت وہ محل میں تشریف رکھتے تھے اور سلسلے کے ساتھ متواتر پنکھے جھلے جاتے تھے تو اگرچہ گرمی کتنی ہی شدید کیوں نہو

اُنپر زیادہ موثر نہوتی تھی وہ جب کبھی تہ خانے میں تشریف بھی لیجاتے تھے تو اسے ایک فیشن کی بات سمجھکے۔ کیونکہ یہ سارا اودھ کا عام فیشن تھا کہ ایک مخصوص موسم میں وہ لوگ تہ خانوں ہی میں بسر کرتے تھے۔ اور چونکہ ایسے فیشن جلسے بادشاہ کو نہ زیادہ آرام ملتا تھا نہ حظ حاصل ہوتا تھا انکی پابندی وہ بہت کم فرماتے تھے۔ لہذا سال بھر میں بہت ہی کم دن ایسے ہوتے تھے جنمیں وہ تہ خانے کو آباد کرتے تھے۔

لکھنؤ میں فقرا و مساکین کی کثرت بھی یہاں کی مخصوصات میں سے ہی۔ لیکن چونکہ اس بارے میں اکثر حضرات خامہ فرسائی کرچکے ہیں اسلیے یہ مضمون پامال ہوگیا ہی۔ اور اسپر زیادہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جن لوگوں نے ملک اٹلی کے شہروں میں سیاحت کی ہی اُنکو تو لکھنؤ میں یہ حالت کوئی نرالی نہ معلوم ہوگی اور چونکہ فی زمانہ فرانس۔ دریاے رہائن اور اٹلی کا سفر کرنا کوئی کرامات نہیں ہے۔ اور بہت ہی تھوڑی مدت میں آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہی۔ اسوجہ سے لکھنؤ میں بھک منگوں کا جو زور ہی اُسپر زیادہ خامہ فرسائی نہ کرونگا۔ بعض لوگوں کی رائے ہی کہ دنیا میں سب کہیں سے زیادہ اودھ میں بوڑھیاں دریوزہ گری کرتی نظر آتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ رائے صحیح ہی اگرچہ میں اُنکی توجیہ نہیں کرسکتا۔

لکھنؤ کے ہر گلی کوچے میں کچھ نہ کچھ مرد یا عورتیں جنمیں بعضے جواں ہونگے بعضے نہایت ضعیف نحیف بوڑھے بھی۔ اور اُنھیں سے اکثر تو بیمار۔ دردگی ہونگے۔ اکثر کی صورتیں بگڑی ہوئی بدقوارہ نکبت زدہ اور نہایت زار نزار حالت میں نظر آئینگے۔ انمیں سے بعض تو پیاپے صدائیں لگاتے۔ جگر خراش کلمات منھ سے نکالتے۔ رحم اور سلوک کی آوازیں بلند کرتے ہونگے۔ بعض ٹھہر ٹھہر کے کانپنے کراہتے۔ درد انگیز ہاے واے سے دلونکو گھلاتے ہونگے۔ چونکہ یہ عام دستور ہوگیا ہی کہ جب کسی بڑے رئیس کی سواری نکلتی ہی۔ یا جب کوئی مذہبی تہوار آپڑتا ہی یا کسی کے گھر مین کوئی تقریب منائی جاتی ہی اُسوقت بہت بہت سارہ روپیہ خیرات مین تقسیم کیا جاتا ہی اسوجہ سے یہ دریوزہ گری کا کاروبار بہت چمکا ہوا ہی۔ اور اپاہجوں کی تعداد برابر بڑھتی چلی جاتی ہی۔ ہندوستان مین اگر یونہی بغیر ہاتھ پانون ہلاے کسی کو کچھ مل سکتا ہی تو وہ اُسکے انتظار مین حیرت انگیز طور پر صبر و تحمل سے کام لیتا ہی۔ سچ تو یہ ہی کہ صبر و تحمل کے ساتھ انتظار کرنے کی صفت منطقہ حارہ میں خوب پھولی پھلی ہی۔ ایک یورپین سیّاح چاہے کیسا ہی جہاندیدہ اور سرد و گرم چشیدہ کیوں نہو اُسے لکھنؤ کے بھک منگوں کی یہ خاص ادا ضرور ہی متحیر کردیگی کہ جسقدر مرد فقیر ہیں وہ سب ہتھیار بند ہیں اور اُنمیں سے بعض تو بہت بیباکی سے کھلے خزانے ہتھیار باندھے اور بھیک مانگتے ہیں گویا کہ اُنکو اپنی اس حرکت پر ذرا غیرت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ غیرت تو درکنار وہ تو اپنی ہر ادا سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا یہ پیشہ باعث فخر و ناز ہی۔ یہ عیاں کہ فقیر

ڈھال تلوار سے مسلح ہوتے ہیں کسی مالدار کو دیکھکے فوراً ہاتھ پھیلا دیتے ہیں اور دعا دینے لگتے ہیں "الٰہی آفتاب دولت و اقبال ہم غریبوں پر ہمیشہ سایہ گستر رہے۔ کچھ نام اللہ بھی ملجائے" بس اتنا کہہ دینے سے اپنے نزدیک وہ دن بھر کی مزدوری پانیکے مستحق ہوجاتے ہیں۔ اگر کہیں کسی نے اُنکی طرف سے بے اعتنائی کے ساتھ منھ پھیر لیا تو بالکل سادگی اور بے تکلفی سے مادر و خواہر کی مغلظات گالیاں سنانے لگتے ہیں جنکے ترجمے کی مجھے جرأت نہیں ہوتی۔

یہ کہ لکھنؤ میں بھیک مانگنے کا پیشہ معیوب نہیں سمجھا جاتا یہ اُس اکڑفوں سے ثابت ہے جو یہاں کے فقرا کرتے رہتے ہیں۔ اور نیز اس بات سے بھی کہ جب کبھی کسی امیر کے گھر لڑکا پیدا ہوتا ہی یا اُس کے بیٹی بیٹا کی شادی ہوتی ہی اُسوقت وہ نہایت تہ دلی کے ساتھ حساب لگاتے ہیں کہ اب کی تو ضرور اتنا روپیہ ملے گا۔ اُن لوگوں کو اس قسم کی تقریبات کے اخراجات کا رتی رتی حال معلوم ہوتا ہی۔ اور وہ فوراً اپنا حق اسی حساب سے سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے ایک نامی فقیر کا حال سنا ہی کہ اُسکے پاس اُسکا اپنا ہاتھی تھا جسپر سوار ہوکے روزانہ وہ شہر کا چکر لگاتا تھا اور اپنے سرپرستوں سے تحصیل وصول کیا کرتا تھا۔

باب ہفتم

آدم خوار

ایک روز میں لکھنؤ کی ایک نفیس سڑک پر بگھی پر سوار جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک دوست بھی بگھی میں تھے۔ ہم دونوں دریاے گومتی کے قریب سے محلات شاہی کے ایک محل کو جا رہے تھے آگے بڑھکے مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ اس سڑک پر سناٹا سا ہی۔ بڑی دور تک نظر کرنے سے کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ اور اگر اتفاقاً کہیں کوئی نظر بھی پڑا تو اس حالت میں کہ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے اُس سے کترا کے بھاگا چلا جا رہا ہی۔ جب کسی مقام پر کوئی ایسا حکمراں ہوتا ہی جسمیں تلون کے ساتھ جفا کاری ہوتی ہی اور جو ایسے اصول کا پابند نہیں ہوتا جن سے طبیعت کی روک تھام ہو سکے تو وہاں ایسے تعجب خیز واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں جنکو اگر کوئی تازہ ولایت انگریز دیکھے تو دم بخود رہجاے۔ لیکن چونکہ ہم ایسی چیزوں کے دیکھنے کے خوگر ہو رہے تھے لہذا ہمکو چنداں استعجاب نہوا۔ اور آپس میں خیال دوڑانے لگے کہ معلوم ہوتا ہی کسی کو سزاے قتل یعنی حد یا عبرت کا نیا نمونہ پیش کیا گیا ہی۔ بس یہی کچھ ہوگا۔ اور کوئی بات نہیں۔

بالآخر. چلتے چلتے بیچ سڑک پر پہونچکے ہمنے دیکھا کہ ایک خون آلودہ لاش پڑی ہی جس کی صورت پہچان نہیں پڑتی۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا تھا کہ ہے کسی انسان کی لاش۔ ہمنے اُس کے دیکھنے کو گھوڑی روک لی۔ دیکھا کہ ایک غریب ہندوستانی عورت کی لاش ہی۔ لیکن ایسی طرح نقشہ بگڑا ہی کہ دیکھے دیکھی نہیں جاتی۔ سارا بدن زخموں سے چور تھا۔ کپڑے چیتھڑے ہوگئے تھے۔ اور چہرے کو کسی نے دانتوں سے اس بے دردی سے نوچا تھا کہ سوا گوشت کے لوتھڑوں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا سر کے لانبے لانبے بال جنکی چوٹی بندھی تھی بچ رہے ساری سڑک پر خون میں لتھڑے پڑے تھے۔ یہ سماں ایسا دردانگیز اور مہیب تھا کہ آنکھ بھر کے دیکھا نہ جاتا تھا۔ بظاہر لاش میں کچھ بھی دم درود نہ تھا۔ بالکل بیجان تھی۔ ہم لوگ ذرا نہ ٹھہرے اور فوراً آگے بڑھے۔ جہانتک آگے بڑھتے جاتے تھے ہو کا عالم نظر آتا تھا۔ کسی طرف کائی چڑیا تک نہ تھی۔ کوئی سانس بھی نہ لیتا تھا۔ تھوڑی دور آگے چل کے ایک نوجوان آدمی کی لاش دکھائی دی۔ یہ بھی بجنسہ اسیطرح چور چور تھی اور ویسی ہی خون آلود۔ یہ نعش کسیقدر سڑک کے ایک کنارے کی جانب تھی۔ اسی جگہ سے قریب ایک مکان تھا جسکی چھت پر ایک بادشاہی سپاہی کھڑا ہوا نظر پڑا جو غور سے اسی سڑک پر چاروں طرف نظر ڈال رہا تھا۔ ہمنے اُس سے پوچھا کہ "کیوں جی۔ یہ معاملہ کیا ہی؟" اُسنے جواب دیا کہ "آدم خوار چھوٹ گیا ہی۔ واللہ۔ دیکھیے وہ پھر اُسی طرف پلٹتا ہی۔ صاحب۔ آپ اپنی جان بچائیے۔ آج یہ آدم خوار بہت ہی خونخوار ہو رہا ہی" میں نے پہلے بھی سنا تھا کہ بادشاہی سواروں میں سے ایک شخص کا گھوڑا بنام آدم خوار مشہور تھا کیونکہ وہ کئی آدمیوں کو ہلاک کر چکا تھا۔

اُس سپاہی نے چھت پر سے ہمکو پکارا اور کہا "صاحب۔ صاحب۔ دیکھیے وہ آرہا ہی۔ ادھر ہی چلا آتا ہی اپنی جان بچائیے" ہمنے دور سے دیکھا کہ ایک بڑا قد آور کمیت گھوڑا دوڑتا ہوا ہماری طرف رخ کیے آرہا ہی۔ منھ میں ایک بچہ دبا ہوا ہی اور وہ اُسے بڑی بے رحمی سے جھنجھوڑتا چباتا چلا آتا ہی۔ جیسے ہی اُسنے گھوڑی کو دیکھا لڑکے کو سڑک پر دے ٹپکا اور نہایت تیزی سے ہماری طرف جھپٹا۔ ابھی ہمسے وہ دور فاصلے پر تھا۔ ہمنے موقع غنیمت سمجھ کے فوراً اپنی گھوڑی کی راس پھیری۔ ہمارا گھوڑا خوف کیوجہ سے بے قابو ہو رہا تھا مگر ہمنے اُسے دوڑایا اور سرپٹ بھگایا بھاگتے بھاگتے ہملوگ ایک احاطۂ آہنی میں داخل ہوگئے۔ جسمیں آہنی پھاٹک لگا ہوا تھا اسیطرف سے ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم گزرے تھے۔ ہمکو یوں جی چھوڑ کے بھاگتے دیکھکر اس آدم خوار نے بڑی زور شور سے تعاقب کیا۔ اُسکے نعل بندھے ہوے سموں کے ٹاپوں کی آواز برابر

سڑک پر ہم سن رہے تھے۔ جیسے ہی ہم لوگ احاطے میں داخل ہوئے ساتھی صاحب بگھی سے پھاند پڑے۔ خوش قسمتی سے پھاٹک میں آہنی زنجیر بھی تھی۔ قلابے بھی تھے۔ انھوں نے فوراً ہی پھاٹک بند کرکے اپنی حفاظت کا اطمینان تو کر لیا۔ پھاٹک کی شکنی کے بند ہونے کا کھٹکا ہوا ہی تھا کہ آدم خوار زور زور سے ٹاپیں مارتا ہوا پہونچ گیا۔ اُس وقت اُسکی ہیئت یہ تھی کہ سر پہ تمام خون کی چھیٹیں تھیں منھ سے تازہ خون ٹپک رہا تھا اور اُسکے شکار کے ہڈیوں کی خراش یا دم مرگ کی کشاکش سے چہرہ کئی مقام پر چھلگیا تھا۔ اب وہ یہاں پہونچکے کھڑا ہو گیا اور لگا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے لوہے کے کٹہرے کو دیکھنے۔ اسوقت اُسکی صورت نہایت خوفناک اور بھیانک تھی۔ کان کھڑے کیے ہوئے۔ نتھنے پھلائے ہوئے خونخوار دیدے نکالے ہوئے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی دیو ہے کہ غیظ و غضب کی مجسم صورت بنگیا ہے۔ اُسکے ہنہنانے کی ہیبت ناک آواز سے ہمارا گھوڑا اسطرح کانپ رہا تھا جیسے جاڑا چڑھا ہو۔ آدم خوار برابر کٹہرے کے اندر دیکھ دیکھ کے چاروں طرف کاوے لگاتا تھا اور بڑھا ہوا تھا کہ کسیطرح اندر پہونچے اور ہم لوگوں کو شکار کرے۔ مگر کسیطرف راستہ نہ ملتا تھا۔ آخر مجبور ہو کے ایک مرتبہ گھوم پڑا نعل بندھے ہوئے سموں سے کٹہرے کی سلاخوں کو کھڑکھڑایا پھر سر اٹھا کے دم سیدھی اور کان کھڑے کرکے ایک باریک محراب پر جو کٹہرے میں تھی کھڑا ہو گیا۔ اسی جگہ پر چند سپاہیوں نے جو گھات میں لگے ہوئے تھے موقع پاکے نہایت چالاکی سے اُسکی اُٹھی ہوئی گردن میں پھندا ڈال کے کھینچا۔ اور جب وہ زمین پر گر پڑا تو رسیوں میں جکڑ کے کشاں کشاں اُسکے اصطبل میں لیگئے۔ ناظرین پوچھیں گے کہ اُس عورت نوجوان اور بچے کا کیا حشر ہوا۔؟ ہمکو صحیح معلوم نہیں لیکن یقیناً یہی ہوا ہوگا کہ اُنکے حباب و اعقاب لاشوں کو اُٹھالے گئے اور زیر زمین دفن کر آئے ہونگے۔ اور ہونا کیا تھا۔

اُسی روز ڈنر کے وقت مین نے جرات کرکے یہ سارا ماجرا بادشاہ سلامت سے عرض کیا۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "ہاں بھئی۔ ہاں ہمنے بھی اکثر اس آدم خوار گھوڑے کا تذکرہ سُنا ہے۔ کیوں جی یہ تو بڑا خونخوار ہے" میں نے عرض کیا کہ "خداوند نعمت! شیر سے بھی زیادہ" بادشاہ نے فرمایا "شیر سے بھی زیادہ؟ اچھا تو لاؤ شیر سے لڑائیں۔ دیکھیں یہ ہمارے بھوریا سے کیونکر مقابلہ کرتا ہے اور کون جیتتا ہے" بھوریا نام ایک شیر تھا جسے بادشاہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ چونکہ یہ شیر دامن کوہ ہمالیہ کے ایک موضع بھوریا سے پکڑا آیا تھا اسلئے اسکا بھی نام بھوریا ہو گیا تھا۔ بادشاہ اُسکو کسی شیر یا ہاتھی سے کبھی نہیں لڑاتے تھے اور جب لڑاتے تھے تو ایسے جانوروں سے جنپر وہ بآسانی فتح پاسکے۔

دوسرے دن صبح کے ناشتے کے بعد ہم لوگ چاندگنج پہونچے۔ اور وہاں ایک صحن کے گرد کے مکانات میں ٹھہرے یہ صحن قریب ساٹھ فٹ مربع تھا جسکے گرد چاروں طرف دو منزلہ مکانات بنے ہوئے تھے

جسمیں اوپر کی منزل میں برآمدے تھے اور نیچے کے درجے میں غلام گردش۔ غلام گردش کے سامنے موٹے موٹے بانسوں کے ٹھٹھر سے ایک احاطہ کھینچ دیا گیا تھا جسکی وجہ سے صحن کی قطع ایک بڑے پنجرے کی ایسی ہوگئی تھی۔ آدم خوار گھوڑے کو ایک چھوٹی ٹٹوانی دکھا کے احاطے میں داخل کردیا۔

حسب معمول بادشاہ سلامت اوپر کی منزل میں سریرآرا ہوئے اور خواصوں نے دستور کے مطابق مگس رانی شروع کردی۔ ہم لوگ بھی چپ و راست برآمدوں پر جھکے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ اس مقام سے ہر شخص اس احاطے کی سیر بخوبی کرسکتا تھا۔ اور مستورات کو اس تماشے میں بہت دلچسپی تھی۔ آخر کو بادشاہ سلامت نے حکم دیا اور بھوریا کا کٹہرا لاکے غلام گردش میں رکھا گیا۔ بانسوں کے ٹھٹھر کا دروازہ جو اس غرض سے بنا رکھا گیا تھا کھولا گیا اور کٹہرے کی کھڑکی بھی کھولی گئی اور اُسمیں سے بھوریا میدان میں اپنی دُم چاروں طرف ہلاتا ہوا اور آدم خوار اور اُسکی ہمدم ٹٹوانی کو غیظ و غضب سے گھورتا ہوا آکودا۔ تمام ہندوستان میں بھوریا سے زیادہ خوبصورت اور حسین شیر نظر آنا دشوار ہے۔ اُسکی چمکدار کھال جسپر نفیس دھاریاں بنی تھیں احاطے میں چھوٹی سی ٹٹوانی کی رنگت کے مقابلے میں بہت نظر فریب معلوم ہوتی تھی بلکہ آدم خوار کی چکنی چکنی کھال کے مقابلے میں بھی بھوریا کی رنگت کی چمک بہت کھل رہی تھی

ایک دن پیشتر سے شیر بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔ اور کھانا پانی اسلیے نہیں دیا گیا تھا کہ بھوک کے تاؤ میں وہ حریف سے مرد میداں ہوئے مقابلہ کرسکے۔ کٹہرے سے نکلتے ہی اُسنے گھوڑوں کی طرف غور سے دیکھا اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں اُنکی طرف چلا۔ آدم خوار نے بھی اپنی آنکھیں اُسی کی آنکھوں سے ملائے رکھیں اور ایک لمحہ بھی نظر اُدھر سے نہ پھیری۔ وہ باطمینان تمام اپنا سر جھکائے۔ ایک قدم آگے بڑھائے کھڑا تھا اور تھوڑا بہت آگے بھی بڑھ رہا تھا اور گویا حملے کا منتظر ہی تھا۔ لیکن کھڑے ہوتے اور چلتے دونوں حالتوں میں اُسکی نظر اُدھر ہی جمی رہی۔ بیچاری ٹٹوانی کا یہ حال تھا کہ مارے خوف کے زندگی سے مایوس تھر تھر کانپ رہی تھی اور ایک گوشے میں قضا کی منتظر کھڑی تھی۔ ایک ہلکی سی زقند مار کے بھوریا تو ٹٹوانی کو چھاپ بیٹھا۔ بیچاری ٹٹوانی ایک ہی طمانچے کی ضرب سے پشت بزمیں رسید ہوگئی اور اسکی گردن میں بھوریا کے دانت پیوست ہوگئے۔ اور اب وہ لگا خون چوسنے۔

بادشاہ نے ہاتھ مل کے یہ انگریزی میں فرمایا کہ ”دیکھنا۔ اب بھوریا اور بھی جلاد ہو جائے گا۔ خون منھ میں لگ گیا ہو نا“ یورپین مصاحبین نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اور خواصوں نے اگرچہ زبان نہیں ہلائی مگر بادشاہ کو خوش دیکھکے بغلیں بجائیں، تماشے سے نظر پھیر کے آپس میں چہلیں کیں اور گوشہ چشم

کے اشارے سے ایک نے دوسرے کی تائید کی۔

چار پانچ منٹ تک تو بھوریا ٹٹوانی کا خون چوستا رہا۔ لیکن اس حال میں بھی اُسکی ٹکٹکی آدم خوار ہی کی جانب لگی تھی اور بجائے خود آدم خوار بھی اطمینان سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اُسکے تیور درست تھے پریشانی یا بدحواسی کہیں نام کو ظاہر نہوتی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ ہنہنانے کی آواز یا کنوٹیوں کا چڑھا ہونا دم کا کھڑا ہونا یا حریف کو خوں فشاں نگاہوں سے دیکھنا ہی ثابت کر رہا تھا کہ وہ اطمینان کے ساتھ حملے کا منتظر اور جوابی ترکی بترکی دینے پر مستعد ہے آخر کار بھوریا خون پیکے سیر ہو گیا اور ٹٹوانی کا سارا خون اُسکے پیٹ میں پہونچگیا۔ اب وہ اپنے پنجے لاش پر سے اُٹھا کے اور ایک ادھ بار جھرجھری لیکے بدن چراتے ہوئے احاطے کا اسطرح چکر کاٹنے لگا جیسے چوہے کی تاک میں بلی آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ اُسکے بڑے بڑے پنجے نرم زمین پر اسطرح آہستہ اور سنبھل سنبھل کے پڑتے تھے کہ ذرا چاپ سُنائی نہیں دیتی تھی۔ آہستگی سے قدم اُٹھتا تھا اور آہستگی سے زمین پر پڑتا تھا۔ لانبی پیٹھ نہایت سہولیت سے کبھی آگے بڑھتی تھی اور آگے کے بازوؤں کے اوپر اُبھر آتی تھی۔ کبھی پچھلے پاؤں کیطرف سمٹ جاتی تھی۔ ڈھیلی ڈھالی کھال ادہر ادہر اسطرح لٹکتی تھی گویا بدن کے اوپر کوئی جھول ڈالدیگئی ہو جیسے ہڈی چمڑے سے کچھ اتصال ہی نہیں یہ عجیب سماں تھا جو عمر بھر یاد رہیگا۔ بادشاہ اور اُنکی خواتین تو اس تماشے میں زیادہ مصروف نہ تھے مگر یورپین مصاحبین کا یہ حال تھا کہ ٹکٹکی لگی ہوئی تھی ہر جنبش پر نگاہ لڑائے اور ہر صدا پر کان لگائے تھے۔ شیر کے چلنے پھرنے کو دیکھکے اُسکے قدم بقدم آدم خوار بھی صحن کے وسط میں کچھ چکر کاٹنے لگا۔ اُسکی تیور ویسے ہی تھے۔ سر گردن کان اور دُم سب اُسی طرح تھے۔ اور شیر اگرچہ اسقدر قوت وقدرت رکھتا تھا مگر ابھی تک بلی کی سی چال چل رہا تھا۔ اُسوقت ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ سوا آدم خوار کی ٹاپوں کی آواز کے اور کسی طرف سے کوئی صدا سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف لوگ دم بخود اور منتظر کھڑے تھے۔ کوئی سانس تک نہ لیتا تھا۔

دفعتہ بجلی کیطرح شیر اپنے حریف پر آپڑا جسکے واسطے آدم خوار بھی طیار کھڑا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ بھوریا نے یہ تاک لگائی تھی کہ وہ اپنے حریف کے سر یا گردن پر قبضہ کرے مگر آدم خوار نے اُسکو ایسا موقع ہی نہ دیا۔ اُسنے بڑی چستی اور چالاکی سے اپنا بدن چُرا لیا اور ایسی ترکیب کی کہ شیر اُسکے پچھلے پاؤں پر آپڑا۔ اور اُسکے پنجے پچھاڑی کے پٹھوں میں گھس گئے۔ شیر نے ہرچند کوشش کی کہ اپنی پچھلے پنجوں سے آدم خوار کے اگلے پاؤں دبا کے اور جھاپ بیٹھے مگر آدم خوار نے پیچھے سے اپنی ٹانگوں کو اُٹھا کر اس زور سے دولتی جھاڑی کہ دم کے دم میں شیر جانور بن شانے چت زمین پر آگرا

اور اگرا تو ایسی خرابی سے کہ آدھا جسم بانسون کے ٹھاٹھر پر تھا اور آدھا زمین پر۔ مگر وہ ذرا ہی سنبھلا اور بہت تیزی و تندی سے دانت پیستا ہوا بے باؤن چلا۔ اور اسطرح مستعد جنگ ہوگیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ آدم خوار بھی بمثل سابق اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور کسی قدر حقارت آمیز آواز سے ہنہناتا رہا۔ البتہ اب اُسکے پچھلے پٹھوں پر شیر کی خراش تھی اور خون جاری تھا۔

بادشاہ سلامت نے ایک یورپین مصاحب سے جو اُن کے قریب ہی تھا فرمایا کہ "بھوریا اب بھی اپنے حریف کی جان لیگا؟" اُس مصاحب نے عرض کیا "حضور۔ بیشک"

بھوریا اب پھر بلی کی چال چلنے لگا۔ اُسکا منھ حریف کیجانب تھا۔ قدم آہستہ آہستہ اُٹھتے اور آہستہ سے زمین پر پڑتے تھے اور کھال اُسیطرح بدن پر جھول رہی تھی۔ آدم خوار بھی نتھنے پھلائے۔ کان اُٹھائے۔ نگاہ دشمن کی اداؤن پر جمائے۔ گردن نہوڑائے۔ کنوتیاں چڑھائے بمثل سابق اپنے اگلے دھڑ کو سمیٹے اور ایک قدم ذرا آگے بڑھائے کھڑا تھا اور منتظر تھا کہ حریف کب حملہ کرتا ہی۔ آٹھ دس منٹ تک بھوریا برابر چکر لگاتا رہا۔ اور آدم خوار اُسکے سب کرشمے دیکھا کیا مگر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ البتہ کبھی کبھی غصے مین ہنہنا لیتا تھا۔ بھوریا نے دو ایک بار اپنے جبڑے کو کھول کے ادھر اُدھر منھ مین جو خون بھرا تھا اُسے زبان سے چاٹ لیا۔ پھر ٹٹوانی کی لاش کے پاس گیا اس خیال سے کہ شاید ابھی کچھ خون اُسکے جسم میں باقی ہو۔ پھر اُدھر سے مڑا اور چکر کاٹنے لگا آخرکار۔ حملے کا وقت آگیا اور ٹٹوانی کی لاش کے پاس ہی سے اس تیزی و سُرعت کے ساتھ چلا کہ ہم سارے تماشائی دفعتہ جھجک گئے بلکہ بعض ملازمان شاہی کے منھ سے چیخ کی آواز نکل گئی۔ لیکن بھوریا نہ غرایا نہ ڈہکا۔ بلکہ یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی برقی قوت نے اُسے دفعتہً ہوا میں اُچھال دیا۔ آدم خوار کو اسکی اس فوری جست سے کچھ بھی انتشار نہیں ہوا۔ اُسنے ابکی بار اپنا سر پہلے سے بھی زیادہ نیچا کر لیا اور یہ معلوم ہوا کہ اُسکا پچھلا دھڑ خود بخود حریف کے بدن کے نیچے سما گیا۔ پھر بھوریا کے پنجے آدم خوار کے پچھلے پٹھوں میں گڑ گئے۔ بلکہ اس قربہ شیر کا سر گھوڑے کی دم سے بھی آگے لٹک گیا اور اُسکے پچھلے پنجے آدم خوار کے پٹھے مین دھنس گئے تھوڑی دیر تو اُس کی یہی کوشش رہی کہ اپنا بدن سنبھالے اور اپنے شکار کو چارون پنجون سے قابو مین کرے کیونکہ برابر وہ اپنے پیٹ سے آدم خوار کی پیٹھ پر زور لگا رہا تھا۔ لیکن پھر اُس سفاک آدم خوار نے اپنی پچھلی دولتی جھاڑی اور بڑے زناٹے سے جھاڑی حتی کہ اُسکے نعل بندھے سُم بڑے زور سے بھوریا کے جبڑون کے اوپر پڑے اور دفعتہً وہ چارون شانے چت زمین پر دراز ہوگیا۔

بعد چندے وہ اسطرح پر بانسوں کے ٹھاٹھر کے برابر برابر دوڑنے لگا جس سے ظاہر ہوا کہ

اب وہ حملہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ بھاگنا چاہتا ہے۔ اُسکے جبڑے کی ہڈی بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ اسوجہ سے وہ دُم دبائے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ اور درد کی وجہ سے بیتاب ہو رہا تھا۔ آدم خوار اُسے غول سابق بغور دیکھ رہا تھا جس سے پایا جاتا تھا کہ ابھی اُسکو حملے کا خوف ہے۔ لیکن بیچارے بھوریا میں اب سکت نہ رہی تھی اور اب وہ اسی فکر میں تھا کہ کسیطرح جان بچاکے بھاگ نکلے۔ اسی عرصے میں نیچے کی منزل میں جو لوگ تماشائی تھے اُنمیں سے کسی شخص نے کہا کہ "معلوم ہوتا ہے کہ بھوریا کا جبڑا ٹوٹ گیا ہے۔" یہ آواز اوپر پہونچی اور خود بادشاہ نے سنی اور ہم لوگوں کی جانب مخاطب ہوکے اُنھوں نے فرمایا کہ "کیا بھوریا کا جبڑا ٹوٹ گیا؟ تو اُسے میدان سے ہٹا ہی لینا چاہیے نا۔" ہم لوگوں نے جواباً عرض کیا کہ "خداوند نعمت۔ جیسا ارشاد ہو۔" چنانچہ اشارہ کر دیا گیا اور کٹہرا لاکے کھول دیا گیا۔ اور بانسوں کا ٹھاٹھر بھی ہٹا دیا گیا۔ یہ دیکھکے بھوریا فوراً اپنے کٹہرے میں گھسا اور اُسکے ایک کونے میں دبک رہا۔

بھوریا نے میدان خالی کر دیا تو آدم خوار اپنی ظفریابی پر ہنہنانے اور ٹاپیں مارنے لگا۔ پہلے وہ ٹٹوانی کی لاش کی طرف متوجہ ہوا۔ اُسے سونگھا۔ اور اپنے پانوں سے اُٹھاکے اُسے پھینک دیا۔ اور کٹہر ٹھاٹھر کے اِدھر اُدھر گشت کرنے لگا۔ اس خواہش سے کہ کسی نوکر چاکر پر حملہ کرے۔ اُسوقت اُسکا خون نہایت جوش میں تھا اور انسان یا شیر جو اُسکے سامنے آجاتا ضرور وہ اُسپر حملہ کر بیٹھتا۔ اُسکے اس پیچ و تاب کھانیکی ہیئت کو دیکھکر بادشاہ سلامت نے کسی ہندوستانی ملازم سے مخاطب ہوکے فرمایا کہ "اسکے مقابلے کے واسطے اور شیر منگانا چاہیے۔" اور پھر انگریزی میں ہم لوگوں سے یوں مخاطب ہوئے کہ "خدا اس سے سمجھے۔ مجھے اس سے بھوریا کی چوٹ کا بدلہ لینا پڑا۔" ہم لوگوں نے مسکراکے دست بستہ عرض کیا کہ "واقعی۔ حضور۔ بہت صحیح ارشاد فرماتے ہیں۔" اور سر تسلیم خم کرکے دوسرے تماشے کا انتظار کرنے لگے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ "آدم خوار نے بڑے زور سے دولتی رسید کی ہے۔" اُس کے جواب میں ہم میں سے ایک صاحب بول اُٹھے کہ "حضور۔ ایسی ویسی دولتی نہیں تھی۔ میں نے خود بھوریا کے جبڑے کی ہڈی پر اسکی ضرب سنی ہے۔" اتنے میں شیروں کا محافظ و نگہبان آگیا اور اُسنے عرض کرا بھیجا کہ اگر حکم ہو تو حاضر خدمت ہوں۔" بادشاہ نے حکم دیا کہ "اچھا آنے دو۔" محافظ حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ "خداوند نعمت ابھی صرف دو گھنٹے گزرے ہیں کہ سب شیروں کو راتب کھلایا گیا ہے۔ لیکن اُنمیں سے جو سب سے اچھا ہے وہ تھوڑی دیر میں حضور کے سامنے حاضر کیا جائیگا۔" بادشاہ نے برہم ہوکے فرمایا "کیوں بے پاجی۔ دو گھنٹے پیشتر کیوں راتب کھلا دیا گیا۔" بیچارہ محافظ سہم گیا۔ تھر تھر کانپنے لگا اور تسلیمیں کرکے عرض کرنے لگا کہ "خداوند نعمت اُنکے راتب کھلانیکا یہی وقت معمول تھا۔"

بادشاہ نے غصے میں فرمایا کہ "اچھا اگر اس شیر نے آدم خوار پر حملہ نہ کیا تو تجھی کو آدم خوار کے مقابلے میں جانا ہوگا"۔ تھوڑی دیر بعد برآمدے کے نیچے ایک کٹہرا لایا گیا۔ لوگ غور سے شیر کو دیکھنے لگے لیکن بیچارے محافظ کی جان ہی نکلی جاتی تھی کہ جو بات بادشاہ سلامت کی زبان سے نکلی ہے وہ ہو کر رہیگی

بھوریا کے شکست کھانے کے بعد ہی بادشاہ نے شراب لانیکا حکم دیدیا تھا چنانچہ شراب آگئی اور دور چلنے لگا۔ چونکہ شراب برف میں لگا کے سرد کی گئی تھی لہذا اسکے پینے سے دلکو بہت سرور ہوا۔ گرمی دور ہوئی۔ انتشار حواس کافور ہوا۔

اس مقام پر گرمی بہت تھی اور ہم یورپین لوگ تو بیتاب ہو رہے تھے۔ بادشاہ سلامت اپنے مزے میں تھے۔ انکی خواصیں مور کے پروں کے بھاری بھاری مورچھل لیے ہوئے گرمی کو پاس نہیں آنے دیتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عجب دلکش سماں تھا کہ یہ پریچہرہ عورتیں جنکی کلائیوں میں مرصع کنگن اور کڑے اور بازو پر نورتن اور بھوج بند ہر جنبش میں نئی ادا دکھا رہی تھی اپنے شانے تک برہنہ خوبصورت ہاتھوں میں مورچھل اونچیاں لیے ہوئے نہایت نزاکت کے ساتھ بادشاہ سلامت کی مگس رانی کر رہی تھیں اور چہرہ مبارک پر اس احتیاط کے ساتھ سرد ہوا پہونچاتی تھیں کہ کسی چیز کی آڑ نہو اور بادشاہ کی نظر حجاب میں نہ پڑے۔

القصہ شیر کا کٹہرا آیا اور پھاٹک کے دروازے سے ملا کے رکھا گیا۔ کھڑکی کھولی گئی اور شیر نہایت آہستگی کے ساتھ نکلا۔ پہلے اسنے احاطے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر تھوڑی دیر تک وہ کٹہرے کے دروازے کے باہر کھڑا رہا اور آگے بڑھنے میں پس و پیش کرنے لگا۔ ایک نیزے کی نوک چبھائی گئی اور آگے بڑھنے کا اشارہ کیا گیا۔ اب وہ احاطے میں پہونچگیا اور اردگرد گھومنے لگا۔ اب کٹہرے کا دروازہ بند ہوگیا اور پھاٹک بدستور جما دیے گئے۔ شیر نے اطمینان کے ساتھ اپنے حریف پر نظر ڈالی۔ تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر ٹٹوانی کی لاش کی طرف بڑھا اور اسکی گردن میں منھ لگا کے دو ایک قطرۂ خون سے حرص بجھائی۔ پھر نظر اٹھائی اور آدم خوار کو بخوبی دیکھا۔ وہ اپنی حفاظت پر مستعد کھڑا تھا۔

یہ شیر بھوریا سے قد میں طویل تھا مگر اسکے جسم پر ویسی خوشنما دھاریاں نہ تھیں اور نہ ویسی سبک خرامی اور نازک اندامی اسکے حصے میں آئی تھی۔ یہ شیر اپنے جسم کی فربہی اور تنومندی سے بالکل بدتولا معلوم ہوتا تھا ممکن ہے کہ شکم سیر ہونیکی وجہ سے اسوقت وہ بھوریا کیطرح خوبصورت اور کسیلا۔ پھرتیلا نہ معلوم ہوتا ہو۔ بہرحال اب اسوقت احاطے میں پہونچکے پہلی حیرت اسے اس بات پر تھی کہ کٹہرے سے نکالنے کی غرض کیا ہے اور کیا کام لینا منظور ہے۔ کیونکہ وہ ٹٹوانی کی لاش پر جھپٹا وہ اپنے مشتبہ دوست

آدم خوار کی طرف ایک ہوشیار سپاہی کیطرح دیکھتا رہا۔ پھر بڑی تیزی و تندی کے ساتھ اپنے جبڑوں۔ پنجوں اور پورے بدن کی طاقت سے اس جسم بیجان کی چیر پھاڑ کرنے لگا کہ اگر آدم خوار اپنی حالت پہ ذرا بھی غور کرتا تو بہت کچھ سہم جاتا۔

یہ دیکھکر بادشاہ نے غضب ہو کر فرمایا کہ "دوتواق کی لاش کو وہاں سے ہٹا دو۔ یہ کیا حماقت تم لوگوں نے کی کہ اُسے ابتک وہاں پڑا رہنے دیا" بہ تعمیل حکم شاہی دو ایک دہکتی ہوئی لوہے کی سلاخوں سے لوگوں نے شیر کو لاش کیطرف سے ہٹایا اور لاش کی گردن میں پھندا ڈال کے فوراً اُسکو ٹھاٹھر کے باہر کھینچ لیا۔ اس حرکت سے شیر کسیقدر جھنجھلایا اور صحن ہی میں لیٹ کے اپنے ہونٹ چاٹنے اور برآمدے والے آدمیوں کو دیکھ کے غرانے لگا۔ اُسکی نگاہ کبھی آدمیوں پر پڑتی تھی۔ کبھی آدم خوار پر جو حملے کے انتظار میں کھڑا ہوا سب رنگ دیکھ رہا تھا۔ جب شیر اسطرح لیٹا ہوا تھا اُسکے قریب کون جا سکتا اور لڑنے پر ابھار سکتا تھا۔ ناچار گرم گرم سلاخوں سے لوگوں نے اُسے اٹھانا چاہا مگر سلاخیں ایسی چھوٹی تھیں کہ شیر تک پہونچ نہ سکتی تھیں۔ تب ایک بڑا لانبا نیزہ لاکے اُس سے شیر کو گودا جسکی وجہ سے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور نیزے کو پکڑ کے اُسی کے سہارے سے ٹھاٹھر کیطرف جھپٹا اور ٹھاٹھر زور سے ہلانے لگا۔ اگر ایسے وقت میں وہ ٹھاٹھر سے باہر نکل پڑتا تو بڑی مصیبت کا سامنا ہو جاتا مگر لوگوں نے گرم سلاخوں سے اُسے دور وفان کر دیا۔ غرضکہ جسقدر کوششیں لوگوں نے کیں سب رائگاں گئیں اور شیر نے ایکبار بھی آدم خوار پر حملہ نہ کیا۔ گرم سلاخوں سے بدن بھی داغا اور جلایا۔ نیزے بھی مارے ہر طرح پہ جھنجھلاہٹ بھی پیدا کی۔ غصہ بھی دلایا۔ مگر ہر مرتبہ اُسکا غصہ ٹھاٹھر کے بانسوں پر اترتا تھا۔ یا آدمیوں پر۔ کیونکہ ہر ایک کوشش کا یہی انجام ہوتا تھا کہ یا تو وہ ٹھاٹھر پر زور آزمائی کرنے لگتا تھا یا آدمیوں کیطرف غرا کے جھپٹتا تھا۔ مگر آدم خوار کیطرف وہ رخ ہی نہ کرتا تھا اور بجائے خود آدم خوار کو بھی شیر پر از خود حملہ کرنیکی کوئی تحریک نہ پیدا ہوتی تھی۔

جب اس مقصد میں ناکامی ہوئی تو مجھے خوف پیدا ہوا کہ کہیں بادشاہ سلامت اُس بیچارے محافظ کو آدم خوار کے مقابلے کیلئے نہ بھیجیں لیکن بادشاہ اپنی دھمکی کو بھول گئے تھے اور انھوں نے چلا کے فرمایا کہ "واقعی۔ آدم خوار بڑا بہادر ہے۔ شیر کو اُسکے سامنے سے ہٹا لو۔ اور تین ارنے بھینسے لاؤ۔ دیکھیں آدم خوار اُنسے کیونکر نپٹتا ہو"

ارنے بھینسے جسوقت غضبناک ہو جاتے ہیں اُسوقت اُنسے زیادہ خطرناک کوئی جانور نہیں ہوتا حالانکہ ہیئت ظاہری سے وہ بالکل بدقطع بدلیسل ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے خود دیکھا ہو کہ اکثر

عظیم الجثہ ہاتھی کو بھی وہ سینگ مار مار کے بھگا دیتے ہیں۔

ٹھاٹھر کے بانس کھسکائے گئے۔ کٹہرا رکھا گیا اور شیر اسمیں اس تیزی و چالاکی سے داخل ہوا کہ جس تیزی و چالاکی سے نکلا بھی نہ تھا۔

اس درمیان میں پھر مے ارغوانی کا دور بے تکلف چلنے لگا اور آخر کار تین ارنے بھینسے جن کی صورتیں نہایت بھدی بے ہنگم تھیں۔ ڈیل ڈول بہت بڑا بھدیسیل ایک ایک کرکے احاطے میں داخل کیے گئے۔ ان بھینسوں نے عجب بیہودگی کے ساتھ اپنے بھاری بھاری سرونکو خواہ مخواہ ہلاکے وسط احاطے کیطرف بڑھنا شروع کیا۔ انکو بڑھتے دیکھکے آدم خوار بھی ذرا جھجکا اور آہستہ آہستہ پیچھے کھسکنے لگا۔ حالانکہ پہلے شیر سے لڑ چکنے کے بعد جب دوسرا شیر آیا تھا تو اسپر مطلق اثر خوف یا گھبراہٹ کا نہوا تھا۔ لیکن اب یہ ڈراونی اور بھدیسیل صورتیں۔ یہ چوڑی سپاٹ پیشانیاں۔ یہ درختوں کے ٹہنوں کے ایسے سینگ۔ اور یہ پہاڑ ایسے جسم دیکھکے اسکے حواس جاتے رہے۔ اور اب اسکے قدم بھی گھبرا گھبرا کے پیچھے پڑنے لگے۔ بار بار وہ ہنہناتا تھا لیکن اب اسکی ہنہناہٹ سے وہ تیزی و تندی وہ غیظ و غضب آشکارا نہیں ہوتا تھا اب اسکی آواز میں اضطراب اور گھبراہٹ ہویدا تھی۔ اور یہ گھبراہٹ زیادہ تر اس وجہ سے تھی کہ وہ بھینسوں کو دیکھ رہا تھا کہ بے تکان اور آزادی سے پھر رہے ہیں اور اس سے ذرا نہیں ڈرتے۔ ورنہ اگر کچھ بھی اسکو کوئی آثار تشویش یا خوف کے انکی کسی حرکت سے ظاہر ہو جاتے تو وہ کمزوروں پر غصہ دکھانیوالوں کی طرح فوراً انپر حملہ آور ہو جاتا۔

یہ تینوں بھینسے ساتھ ہی ساتھ اپنی گردنیں نیچی کیے کبھی ایک طرف جھکتے تھے کبھی دوسری طرف۔ کبھی زمین پر پھنکار مارتے تھے کبھی برآمدے پر جو آدمی بیٹھے تھے انکو دیکھنے لگتے تھے کبھی غلام گردش کے ستونوں پر نگاہ جماتے تھے اور کبھی بلا ارادہ آدم خوار پر نظر ڈالتے تھے لیکن یہ خیال انکے دماغوں سے کوسوں دور تھا کہ انکو اس آدم خوار پر حملہ کرنا چاہیے۔ انکو اسطرح بوکھلایا ہوا اور بدحواس دیکھکے آدم خوار سے نہ رہا گیا اور آخر کار اُسنے سبقت کی اور اسطرح چہرہ بڑھا کے کبھی تو نتھنوں کو پھلا کے پھنکار مارتا تھا کبھی زور سے ہنہناتا تھا اور کبھی ذرا تامل کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھاتا تھا۔ یونہی رفتہ رفتہ بڑھکے وہ انکے بالکل قریب آگیا۔ مگر باایں ہمہ بھینسوں نے اسکے ان حرکات پر کچھ توجہ نہ کی۔ اپنے اسی طرح آپس میں ملے جلے۔ سرونکو جنبش دیتے آگے چلے جاتے رہے۔ اب تو آدم خوار اُنسے اسقدر قریب ہو گیا کہ اسکا جسم ایک بھینسے کے جسم سے بالکل بھڑ گیا۔ اور وہ ہنہنا کر اُسکی بو سونگھنے لگا۔ اُس نے بھینسے کی طرف گردن بھی بڑھائی مگر بھینسا خبر بھی نہوا۔ مثل مشہور ہے کہ بہت مٹھائی میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی اس سارے اخلاص اور میل

ملاپ کی کارروائی نے آخرکار ایک اور نتیجہ پیدا کیا۔ جب آدم خوار خوب بو سونگھ چکا اور بھینسوں کو دیکھ چکا کہ ذرا بھی حرکت نہیں ہی تو بہت قریب آ کے اطمینان کے ساتھ ایکبار مڑا اور چالاکی سے ایک دولتی بڑے زور سے اپنے پاس والے بھینسے کی رسید کی۔ یہ حملہ کچھ ایسا اچانک، خلاف امید اور سخت تھا کہ بیچارا بھینسا تھوڑی دیر کے لیے چکرا گیا۔ اور اُس کے ساتھی کچھ اس طرح سر ہلانے لگے گویا داد دیتے اور کہتے ہیں کہ "ہاں۔ یہ ہوئی!"

بھینسوں کی حالت دیکھکے بادشاہ سلامت بیساختہ ہنس پڑے اور بولے کہ "بھئی۔ اب تو آدم خوار جاں بخشی کا مستحق ہی۔ اُسے ہٹا لینا چاہیئے"۔ چنانچہ فوراً اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ پھندے ڈال کے آدم خوار پکڑا گیا۔ اور اصطبل میں پہونچا دیا گیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکو بقیہ عمر نہایت امن چین سے بسر کرنا پڑی۔ بادشاہ نے اُسیوقت فرما دیا تھا کہ "میں اسکے واسطے ایک آہنی کٹہرا بنوا دونگا۔ اور اُسکی پرورش کا بھی سامان کر دونگا۔ آپا جانی کے سر کی قسم یہ بڑا بہادر ہی"۔ غرضکہ اُس کے واسطے ایک اتنا بڑا لوہے کا کٹہرا بنوا دیا گیا کہ جو لندن کے معمولی کھلنے کے کٹہرے سے دوچند تھا۔ اُسمیں یہ آدم خوار اپنی فتحمندی پر نازاں تماشائیوں کا نظارہ گاہ تھا اور جب کوئی تماشائی اُسے دیکھنے جاتا تو وہ بہادری سے اُنکی طرف یا کٹہرے کی سلاخوں پر جھپٹ کے اکثر وہی ادا دکھا دیتا تھا جس سے بھینسے پر فتح پائی تھی۔ میرے زمانہ روانگی تک یہ آدم خوار لکھنؤ میں موجود تھا۔

باب ہشتم

"باتیں ہاتھی پائیاں۔ باتیں ہاتھی پاؤں"

دربار شاہی میں یوں تو بڑے بڑے مقتدر حکام تھے۔ عمائد سلطنت تھے لیکن ان سب میں جسقدر بادشاہ کی نظر عنایت اپنی برائے نام جنرل فوج راجہ بختاور سنگھ پر تھی اتنی کسی پر نہ تھی۔ میں نے "برائے نام" اسوجہ سے کہا ہی کہ درحقیقت اودھ میں جو فوج تھی وہ کسی شمار قطار میں نہ تھی۔ کمپنی کی فوج البتہ کارآمد اور یلغار کرنے والی تھی مگر وہ صاحب رزیڈنٹ کے تحت اقتدار و انتظام تھی۔ باقی بادشاہی فوج گنتی گنانے کو تھی اگرچہ اُسمیں پیدل بھی تھے سوار بھی تھے۔ توپخانہ بھی تھا اور مجموعی تعداد بھی چالیس پچاس ہزار تھی۔ اسی بادشاہی فوج میں بعض کی وردیاں اور ساز و سامان عجیبوں کی ایسی تھیں اور بعض کی اُسی طرح کی جیسی کمپنی کی فوج کی تھی۔ اور اس فوج کا سپہ سالار تو نواب کا بیٹا تھا اور جنرل راجہ بختاور سنگھ۔ ہلوگوں سے آپس کے جلسے بادشاہی دعوتوں میں بختاور سنگھ کو سب لوگ "جنرل" "جنرل" کہکے پکارتے

تھے اور نام بہت کم لیتے تھے۔ ان تخلیے کی صحبتوں میں بادشاہ سلامت اپنی ہنسی دل لگی کے شوق کو خوب پورا کرتے تھے اور چونکہ اُن کے سامنے بختاور سنگھ اور خاصہ تراش (جو بجائے خود اس فن میں طاق تھے) برابر جوڑ لڑا کرتے تھے لہذا ہر وقت ہنسی۔ مذاق و دل لگی اور چہل میں گزرا کرتی تھی اور اس طرح چھیڑ بازی ہوا کرتی تھی کہ اگر کوئی اجنبی آدمی دیکھتا تو ہرگز یہ نہ سمجھتا کہ یہ ایک خود مختار بادشاہ کی صحبت احباب ہے بلکہ یہی خیال کرتا کہ کچھ نوعمر طالبعلم ایک جا ہو گئے ہیں جنکو ہنسنے ہنسانے کیواسطے تھوڑی دیر کے لئے مدرسے سے چھٹی مل گئی ہے۔ خود بادشاہ سلامت اکثر ان لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ جی کھول کے ہر قسم کا مذاق آپس میں کریں۔ اسوجہ سے کوئی ایسی بیہودگی نہ تھی جو آپس کی بے تکلفی میں اُٹھ رہتی ہو۔ اگرچہ اس قسم کے مذاق میں سب ہی شریک ہوتے تھے مگر ہندوستانی مصاحبوں میں راجہ بختاور سنگھ اور یورپین مصاحبوں میں خاصہ تراش سب سے پیش پیش رہتے تھے۔ اور زیادہ تر انھیں کے دم سے یہ صحبتیں آباد رہتی تھیں۔

با اینہمہ بختاور سنگھ ناکارہ شخص بھی نہ تھا۔ اُسکو اپنے اعزاز و منصب کا بہت کچھ لحاظ رہتا تھا اور حتی المقدور اپنے کو بہت سیے لیے رہتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اگرچہ وہ بادشاہ کی ہر ایک خفیف الحرکاتی میں شریک حال رہتا تھا پھر بھی بادشاہ کی نگاہ میں بہت موقر تھا اور ایک طرف تو اپنی ذومعنی باتوں حاضر جوابی اور لطیفہ سنجی سے مذاق میں سب سے سربر رہتا تھا اور دوسری طرف اپنی خوشدماغی اور تجربہ کاری و معاملہ فہمی کے جوہروں سے ہندوستانیوں کے طبقہ میں بہت عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ وہ ہر نہج سے شایان افسری ہے۔

بختاور سنگھ کو اگرچہ لوگ جنرل کے لقب سے مخاطب کرتے تھے مگر فی نفسہ اسکو پولیس کا افسر اعلیٰ کہنا زیادہ موزوں تھا۔ کیونکہ اُسکے ماتحت جمعیت سے جو کام لیے جاتے تھے وہ وہی تھے جو انگلستان میں پولیس سے لیے جاتے ہیں۔ یہ جمعیت اکثر عمائد دربار کی اردلی میں تعینات رہتی تھی۔ اور اکثر بادشاہی سواری کی شان و شکوہ اور کر و فر بڑھانے کے لیے جلو میں چلتی تھی اور چونکہ اکثر عمائد دربار کا سابقہ اُس سے رہا کرتا تھا اور اُسی کے ذریعے سے اُنکے کام بنا کرتے تھے لہذا وہ لوگ اُسکی بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ مزید براں چونکہ وہ ہندوؤں کے سردار قوم یعنے راجپوت خاندان سے تھا دولت و ثروت رکھتا تھا۔ اور بادشاہ کا منظور نظر تھا لہذا ہر شخص اُسکو نہایت ممیز و ممتاز مقرب بارگاہ اور ذی اقتدار سمجھتا تھا۔ اگرچہ نواب وزیر اعظم کو اُسکی ترقی مناصب گونہ رشک تھا لیکن بختاور سنگھ کو اسوقت تک اس رشک کی پروا نہ تھی جب تک وہ بادشاہ کا مقرب اور خاصہ تراش کا دوست تھا۔ اس اندرونی کیفیت قلبی کے ساتھ بھی جب کبھی راجہ اور نواب ملتے تھے تو بڑے تپاک سے ملتے تھے۔ سلام کرتے تھے مساوات کے طور پر بغلگیر ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کی

شان میں بڑے بڑے اعزازی اور تعریفی الفاظ (جیسا کہ ہندوستان کے درباریونکا خاصہ ہے) زبان پر لاتے تھے اور کسی برتاؤ سے اپنے بطون کی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ باایں ہمہ سلوک و مدارات نواب پھر مسلمان تھے اور جنرل پھر ہندو۔

ایکبار حوالی لکھنؤ کی ایک کوٹھی میں ہم لوگ سیر و شکار کے تماشے میں مصروف تھے۔ جانوروں کی آویزش و پیکار۔ چیر پھاڑ۔ ایک کے ہارنے اور پالی باہر بھاگنے۔ ایک کے جیتنے اور ظفریابی کے نشہ میں جھومنے کی سیر دیکھتے دیکھتے جب طبیعت اکتا گئی تو سب لوگ رہنے کی ایک کوٹھی میں چلے گئے کہ ذرا تھکن مٹائیں کچھ تنقل کریں۔ اور جی بہلائیں۔ یہاں پہونچکے ہم لوگوں نے ایک ایک بسکٹ کھا کھا کے شراب پینا شروع کر دی۔ بادشاہ سلامت بھی اُسوقت سرور میں تھے۔ زور سے قہقہے مار رہے تھے اور بے تکلفی سے چہلیں ہو رہی تھیں۔ راجہ بختاور سنگھ بھی بادشاہ کو عالم سرخوشی میں دیکھکے کشادہ مزاجی سے مسخراپن کر رہے تھے اور بادشاہ بھی برابر ہنس رہے تھے۔ تھوڑی دیر یہ صحبت رہی۔ اب جلسہ برخاست ہونے کا وقت آگیا کیونکہ شام کے ناشتے کا وقت آرہا تھا۔ ملازموں اور سواروں کو جلوس کی پکار مچی۔ باڈی گارڈ کے کپتان نے حسب معمول سبکو یکجا کیا اور آکے اطلاع دی کہ جلوس سواری طیار ہے۔ بادشاہ بیٹھے سے اُٹھے۔ اُسوقت وہ اپنی معمولی مرغوب طبع انگریزی پوشاک پہنے تھے۔ سر پہ انگریزی ٹوپی تھی۔ کہ ایکبار اُنھوں نے اپنا سیدھا ہاتھ ٹوپی میں ڈال کے اُسے بلند کیا اور پھر ہاتھ اونچا کرکے ٹوپی کو اپنی اُنگلی پہ نچانے لگے۔ اُسوقت تک سب باتیں بدستور تھیں۔ کوئی آثار طوفان قہر سلطانی بپا ہونے کے پائے نہیں جاتے تھے کیونکہ سابق میں اکثر اسی عنوان سے ہم لوگوں کو اس کوٹھی سے نکلنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اور یہ تو بادشاہ کی ایک معمولی عادت تھی کہ جب خوشی میں ہوتے تھے تو اپنی انگریزی ٹوپی کو ہاتھ میں لیکے اسی طرح نچایا کرتے تھے۔ ہم لوگ اب بادشاہ کے قریب ہی قریب جا رہے تھے۔ میں اور بختاور سنگھ بالکل ساتھ تھے۔ اور سب لوگ بادشاہ کے پیچھے پیچھے بلا لحاظ مراتب ملے جلے دروازے سے نکل رہے تھے کیونکہ یہ موقع بالکل بے تکلفی کا تھا اور بادشاہ کی خوشی یہی تھی کہ ایسے مواقع پر آگے پیچھے چلنے کا لحاظ نہ ہوا کرے اور بے تکلفی کے اوقات میں حفظ مراتب نہ رکھا جائے۔ ٹوپی کو اُنگلی پہ نچاتے نچاتے دفعتہً بادشاہ کا انگوٹھا اُسمیں گھس گیا۔ اور باہر نکل آیا۔ حالانکہ بادشاہ کے استعمال کیواسطے جو چیز آتی تھی اعلیٰ اور بیش قیمت آتی تھی مگر یا تو یہ بات تھی کہ یہ ٹوپی کچھ معمولی بازاری ہی ہوئی تھی یا یہ بات تھی کہ بادشاہ اکثر اس طور پہ ٹوپی سے شغل کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا کثرت استعمال سے گھس گھسا کے اُسکے اوپری حصے میں سوراخ ہو گیا تھا۔ بہر حال کچھ ایسا ہی ہو۔

پڑا کہ اُنکا انگوٹھا ٹوپی کے پار ہوگیا۔ اس ادا پر بادشاہ کو ہنسی آگئی اور ہنستے ہوے اُنھوں نے ہماری طرف رخ کیا۔ جس سے غالباً اُنکا یہ ایما تھا کہ اُنکے خوش کرنے کو ہملوگ بھی ہنس پڑیں۔ ہملوگ تو تابعدار ہی تھے۔ اُنکی مرضی پاکے سب لوگ کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ اُسوقت بختاور سنگھ نے ہنسی ہنسی میں چلا کے کہا کہ "حضور تاج میں سوراخ ہوگیا!" یہ فقرہ بے تحاشا بے سوچے سمجھے ہنسی میں اُنکی زبان سے نکل گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے بادشاہ کو بہت ناگوار گزر گیا۔ چونکہ بادشاہ کو تخت و تاج بہت مصیبت سے ملا تھا لہذا وہ اس باب میں بہت ہی ذکی الحس تھے۔ اور کوئی ایسی بات سُن ہی نہ سکتے تھے جسمیں کوئی اشارہ کنایہ تخت و تاج کیجانب ہو۔

اس مقام پر مجھے بطور جملۂ معترضہ یہ کہدینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین حیدر کو تاج سلطنت محض کمپنی کی بدولت ملا تھا۔ کیونکہ اُنکے باپ اور دیگر اہل خاندان کسی طرح روادار نہ تھے کہ انکو تخت شاہی نصیب ہو۔ اُن سبکی صلاح اور کوشش یہی تھی کہ اُنکے بھائی تخت نشین ہوں۔ اور اگر کمپنی اور اُسکے رزیڈنٹ کا قدم درمیان میں نہوتا تو نصیر الدین حیدر کو تاج شاہی کبھی نصیب نہوتا۔ بہرتقدیر۔ بات بگڑنے والی ہی تھی کہ بختاور سنگھ کے منھ سے یہ جملہ نکلا۔ اور نصیر الدین حیدر کے دل پر تیر سا لگ گیا۔ ورنہ اور کوئی موقع ہوتا یا کسی دوسرے عنوان سے یہی بات کہی جاتی تو بادشاہ خود اُسپر ہنس دیتے۔ خیال بھی نہ کرتے۔ لیکن یہ گھڑی خدا جانے کیسی کمبخت تھی کہ اتنی سی بات سنتے ہی اُنکے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی اور ابھی دو گھڑی پیشتر جو سرور و انبساط تھا سب تشریف لے گیا۔ مارے غصے کے منھ تمتمانے لگا اور آنکھیں سرخ ہوگئیں میں چونکہ اُنکے قریب ہی تھا لہذا وہ میری طرف مخاطب ہوے اور فرمانے لگے "تمنے اس کورنمک۔ دغاباز کی باتیں سنیں۔؟" یہ فقرہ اُنھوں نے نہایت غیظ و غضب کیحالت میں اور نیلی پیلی آنکھیں دکھاکے فرمایا تھا کیونکہ وہ جسطرح ہنسی میں آدمی تھے اُسی طرح غصہ و رنج میں بھی۔ اور پھر بادشاہ ہی تھے جنکی بابت حکیموں کا مقولہ ہے کہ "گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت دہند"

مین نے عرض کیا کہ "جی۔ حضور ـــ" میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ بادشاہ نے باڈی گارڈ کے کپتان سے پکار کے فرمایا "اس مردود کو فوراً زیر حراست کرلو" اور پھر روشن الدولہ وزیر اعظم سے ارشاد فرمایا کہ "روشن۔ جاؤ۔ اور اسکا سر قلم کرڈالو۔"

یہ بڑا نازک وقت تھا۔ کیونکہ بادشاہ کو باستثناے ملازمان کمپنی اپنی رعایا کی قتل و زیست کا اختیار کامل تھا اور اُسمیں دست اندازی کی مجال کسیکو نہ تھی۔ اور اُنکی یہ عادت تھی کہ اگر کوئی شخص اُنکا غصہ فرو کرنے کے لیے کچھ مداخلت کرتا تو انکو اور بھی غصہ بڑھ جاتا تھا۔

کپتان باڈی گارڈ اور وزیر اعظم فوراً بختاور سنگھ کے پاس آئے۔ وہ بیچارا اس وقت سر نیچا کیے ہاتھ باندھے۔ سکوت و خاموشی کے عالم میں نہایت ترساں و لرزاں کھڑا تھا۔ یہ لوگ آئے تب بھی وہ ایک حرف نہ بولا۔ وزیر اعظم صاحب نے اگرچہ بظاہر بہت بگڑ [illegible] سکتے تھے مگر اس وقت وہ اپنی خدمت مفوضہ سے کسی طرح انکار نہیں [illegible] کہا ہم سپاہی ہیں ہمکو تعمیل ارشاد فرض ہے؟

جو لوگ ہندوستانی درباروں میں رہا کرتے تھے انھیں ایسے ضدی خود مختار راجہ یا بادشاہ کے دربار میں کسی درباری کے عروج و زوال کی کیفیت ہرگز عجیب نہیں معلوم ہوتی اور انکی آنکھیں ایسے فوری انقلابات کے دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔

نواب کے اس کہنے پر کپتان صاحب نے بختاور سنگھ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ “بختاور سنگھ میرا قیدی اور میری حراست میں ہے” اور یہ کہکے وہ اسے لیکر چلے۔ لیکن چلتے چلاتے اُنھوں نے مجھ یورپین لوگوں کی طرف ایسی نظر سے دیکھا جسکے یہ معنی تھے کہ حتی المقدور اس بیچارے کے حق میں معقول سعی سفارش کرنا۔ اور مجھسے جو ممکن ہوگا میں تو ضرور یہی کرونگا۔

بختاور سنگھ سامنے سے ہٹ چکا تو بادشاہ نے نہایت غصے میں آکے اپنی ٹوپی کو زمین پر پھینک دیا اور پاؤں سے روند ڈالا۔ ابھی اُنکا جوش فرو ہوا تھا اور چہرے کا رنگ ہنوز دگرگوں تھا۔ پھر نہایت خشمگین نگاہ سے میری جانب مخاطب ہو کے فرمایا کہ “کیوں جی یہ بتاؤ۔ اگر کوئی شخص شاہ انگلستان سے ایسی گستاخی کرتا ہے تو وہ کیا کرتے ہیں” اور یہ کہکے پھر ایکبار اُنھوں نے اپنا پاؤں زمین پر دے مارا۔

میں نے عرض کیا کہ “خداوند نعمت ایسے جرم کی پاداش میں شاہ انگلستان مجرم کو اُسی صورت سے گرفتار کر لیتے ہیں جیسے حضور نے کیا۔ اور پھر بعد تحقیقات جو فیصلہ اُسکے حق میں مناسب معلوم ہوتا ہے وہ صادر کرتے ہیں۔” اُسپر بادشاہ نے چلا کے فرمایا کہ “میں بھی یہی کرونگا” اب وہ سر قلم کرنیوالا حکم بھول گئے تھے جو جوش غضب میں بے اختیار منہ سے نکل گیا تھا اور یہ دوسرا حکم ذرا کسیقدر جوش فرو ہونے پر زبان سے نکلا تھا۔ یہ ارشاد فرما کے آہستہ آہستہ وہ دروازے کی جانب بڑھے تو میں سلام کر کے اور یہ عرض کر کے آگے بڑھا کہ “حضور کے ارشاد عالی سے روشن الدولہ کو اطلاع دیدوں”۔

روشن الدولہ وغیرہ گھوڑوں پر سوار ہو کے چل چکے تھے۔ اور اس ترتیب سے جا رہے تھے کہ آگے آگے کپتان باڈی گارڈ۔ اُنکے پیچھے دو سواروں کی حفاظت میں راجہ بختاور سنگھ اور اُن کے پیچھے روشن الدولہ۔ میں نے بلند آواز سے انکو شاہی حکم سنایا۔ اور مجھے خیال ہوتا ہے کہ اُسے سنکے روشن الدولہ نے یہ کہا کہ

مجھے بادشاہ سلامت کی ذات عالی سے رحم اور عفو تقصیر ہی کی امید تھی۔ دل کا حال تو خدا ہی جانے کہ کیا گزری ہوگی مگر اتنا ضرور ہے کہ چونکہ بہت سے لوگ گرد وپیش تھے لہٰذا میرے اور لوگوں کے سنانے کو انھوں نے بآواز بلند یہ برمحل جواب دیا تھا۔ یقیناً بختاور سنگھ نے بھی میرا پیام سُنا ہوگا۔ کیونکہ میں نے اسی خیال سے اُردو زبان میں پکار کے بادشاہ کا حکم سنایا تھا کہ وہ بھی سن سمجھ لے لیکن اُس نے اتنا بھی نہ کیا کہ منہ پھیر کے میری جانب دیکھ ہی لیتا اور مجھے اتنا مطلع کر دیتا کہ میری بات اُسکے کان میں پڑ گئی۔ غالباً اُسنے احتیاط کو دخل دیا ہوگا کیونکہ درباری لوگ ایسی احتیاطوں کے عادی ہوتے ہیں۔

جب بادشاہ سلامت ہاتھی پر سوار ہونے لگے تو خاصہ تراش سے مخاطب ہو کے بولے "بختاور سنگھ کی موت آگئی ہے۔ اس زمین پر کوئی ایسی قوت نہیں جو اُسکی موت کو ٹال سکے۔ شام ہونے سے پہلے ہی پہلے اُسکا سر تن سے جدا ہوگا۔" کسکی مجال تھی کہ اُسوقت زبان ہلاتا اور کہتا کہ ایسا نہ ہو۔ ہم یورپین لوگ اتنا ضرور خیال کرتے تھے کہ اگر صاحب رزیڈنٹ کو مداخلت کی ترغیب دیجائیگی تو یقیناً بختاور سنگھ کی جانبخشی ہوجائیگی۔ چاہے جائداد اور جاگیر ضبط ہوجائے۔

رستے سے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا دریائے گومتی تک چند میل کا فاصلہ تھا۔ اور ہاتھی گھوڑوں اور ہمارے سب کے واسطے ایک چھوٹے کا پل (جو ایک بڑی کشتی کی قطع کا تھا) ہر وقت طیار رہتا تھا اُسی پل کے ذریعے سے چند منٹ میں ہم لوگ دریا اس پار اُتر آئے۔ اور لکھنؤ کی آبادی میں پہونچ گئے۔

یہ چھوٹا پل ہمیشہ صرف بادشاہ اور اُنکے ہمراہیان کے عبور کی غرض سے کبھی اس کنارے اور کبھی اُس کنارے رہتا تھا۔ اگرچہ وہ بہت چھوٹا اور کچھ بدنما بدقطع سا تھا لیکن بادشاہ سلامت کے لئے مخصوص تھا اسلئے لوگ اُسے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس پل کے علاوہ دریا پر ایک پل کشتیوں کا اور بھی عام لوگوں کے واسطے بنا تھا۔ اگرچہ یہ بھی بہت کم حیثیت اور ذلیل حقیقت تھا لیکن گزرگاہ خاص و عام ہونے کی وجہ سے بہت بکار آمد اور باعث آرام تھا۔ دوپہر کے وقت ہمیشہ اُس پل کا درمیانی حصہ دو ایک گھنٹے کے واسطے کھولدیا جاتا تھا تاکہ مال کی ناویں اور کشتیاں نکل سکیں۔ باقی ہر وقت بندھا رہتا تھا۔

در دولت پر پہونچکے بادشاہ کا غیظ وغضب دھیما ہو گیا تھا۔ ہم اس جا جمع ہو گئے تھے۔ اب ہم سب لوگ اسکے منتظر تھے کہ دریافت کریں بختاور سنگھ کے معاملہ میں جہاں پناہ کا مکنون خاطر کیا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے رخصت ہوتے وقت معقول عنوان سے یہ تذکرہ چھیڑ بھی دیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ "بغیر تحقیقات وہ قتل نہیں کیا جائیگا"۔ بادشاہ کے اس یقین دلانے پر ہم لوگوں نے بھی اپنی صورتوں سے اطمینان ظاہر کیا۔ اگرچہ دل ہی دل میں یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔ اب بادشاہ ہوں گے اور

ہندوستانی ملازمین۔ اور یہ لوگ ہرگز بختاور سنگھ کے بارے میں کلمۂ خیر مُنہ سے نہ نکالیں گے۔ بختاور سنگھ ایک دولتمند آدمی تھا اگر وہ قتل کیا جائیگا اور اسکے مال ومتاع کی ضبطی کی جائیگی۔ تو ضرور ہے کہ اُس دولت میں سے ان لوگوں کو بھی بہت کچھ ہاتھ لگے گا۔ اُنھیں وجوہ سے یہ ہمیشہ کا بندھا ہوا دستور تھا کہ جب کبھی کسی مالدار آدمی پر اس قسم کا عتاب ہوتا تھا تو یہ لوگ اُسکے قتل اور ضبطی جائداد کا مشورہ ہمیشہ دیا کرتے تھے۔

ہم لوگوں نے صلاح کرکے کپتان صاحب کو منتخب کیا کہ وہ جاکے صاحب رزیڈنٹ کو اس معاملے کی اطلاع کرائیں اور دیکھیں وہ کیا کہتے کیا کرتے ہیں۔ صاحب رزیڈنٹ نے انھیں مایوس کردیا کیونکہ یہ ایک ہندوستانی ملازم کی تمرد و سرکشی کا معاملہ تھا اور وہ ملازم کسیطرح کمپنی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا لہذا اُنکے نزدیک مداخلت کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔

دردولت سے چلکے ہملوگ پہلے بختاور سنگھ سے ملنے کو گئے۔ وہ ایک نہایت مبتذل مکان میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہ مکان توپخانے کے بیرونی سلسلے میں تھا اور بیشتر اُس میں ایک ادنی درجے کا خدمتگار رہتا تھا۔ اب اسپر دو ہندوستانی سنتری پہرہ دے رہے تھے اور اندر وہ شخص محبوس تھا جسکے واسطے ایسے ذلیل مکان میں رہنا ہی باعث توہین و ذلت تھا کیونکہ وہ اپنی ذات کی لحاظ سے بھی ایسا اعلیٰ درجہ اپنی قوم میں رکھتا تھا کہ ایسے مکان میں اُسے رکھنا اُس کی کافی سزا تھی۔ خیر۔ جب ہملوگ اس مکان میں پہونچے تو ہم نے اس بدنصیب معتوب قہر سلطانی کی حالت ایسی دیکھی کہ جسپر بے اختیار رو دینے کو جی چاہتا تھا۔

وہ اس مکان میں ایک معمولی چارپائی پہ پڑا ہوا تھا۔ جو بانوں سے بنی ہوئی تھی اور جسپر چٹائی یا بچھونا تک نہ تھا۔ بالش تک نہ تھی۔ بس اس چارپائی کے سوا اور کوئی ساز وسامان اُس مکان میں نہ تھا۔ ہمنے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب نے کپتان سے بادشاہی حکم پہونچایا اور کپتان نے حسب الحکم یہ انتظام بیچارے ستم رسیدہ راجہ کی بود و باش کا کیا۔ مکان کی تو یہ مبتذل حالت تھی اب ذرا مکین کی حالت بھی سننا چاہیئے۔

اس معتوب سردار کی ساری پوشاک اُتروالی گئی تھی۔ اب نہ اُسکے سر پر وہ زرتار اور مغرق پگڑی تھی نہ پگڑی پر طرہ و سرپیچ مرصع۔ نہ بدن پر زربفت کی قبا۔ نہ قبا پر کشمیری شال کا پٹکا۔ پوشاک کے ساتھ ہتھیار بھی گئے تھے۔ اور اُسکے پاس نہ تلوار تھی نہ طپنچے کی جوڑی۔ وہ جسم جو حریر و دیبا۔ زری و زربفت سے ہر وقت آشنا رہتا تھا اب معمولی مزدوروں کی سی ایک عرقی اُسکی تن پوشی تھی۔ اور

باقی سارا بدن ننگا تھا جسپر چارپائی کے بانوں کے نشان اتنے پڑے تھے کہ گل بوٹے نظر آتے تھے۔ جسوقت ہملوگ مکان میں داخل ہوے اُسوقت یہ ستم رسیدہ اسی چارپائی پر چپکے سے کروٹین بدل رہا تھا۔

جب ہملوگوں نے اُس سے کچھ بات چیت کی تو اُسنے کہا کہ میں نے تو کوئی ایسی بُری بات نہیں کی تھی جو میرے منھ سے جو کچھ نکلا بھی تھا وہ بالکل بے سمجھے بوجھے کہا تھا ہنسی ہنسی میں ایسی باتیں زبان سے نادانستہ نکل ہی جاتی ہیں۔ اور بادشاہ کو تو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ جب اُن کے والد اور دیگر اہل خاندان [illegible] سے محروم کرنے کے لیے کوشش کر رہے تھے [illegible] ساتھیوں میں ذرا بھی آلودہ [illegible] جو میری زبان [illegible] میری قسمت [illegible] ہونا لکھا تھا۔ کیونکہ دشمن [illegible] نہیں ہو لیکن صاحب لوگ [illegible] اگر آپ بڑے صاحب [illegible] اہل خاندان [illegible] ہوں اسوجہ سے ہر طرح کی تکلیف و مصیبت برداشت کرسکتا ہوں [illegible] موت کی سختی بھی جھیل [illegible] لیکن میری بیبیاں بچے اور میرا [illegible] آپ جو صاحب فراش ہیں [illegible] ہرگز کسی مصیبت کی برداشت نہ ہوگی۔ نہیں معلوم میرے بعد میری بیبیوں پر کیا حشر ہونا ہے [illegible] نے تو اپنے رشتہ داروں کے سوا کسی غیر شخص کا کبھی منھ بھی نہیں دیکھا ہے اور بچے ابھی بالکل نادان ہیں۔ دنیا کو جانتے تک نہیں کہ کیا بلا ہے۔ صاحب آپ لوگ اپنی مہربانی سے مجھسے وعدہ کیجیے کہ اُنکے حق میں کلمۂ خیر زبان سے نکالیے گا۔

یہ بیان ایسا پرتاثیر اور جگرخراش تھا کہ ہملوگوں کے قلوب پر نہایت اثر ہوا اور ہم میں سے اکثر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ حالانکہ ہملوگ اس خودمختار سلطنت اور اُسکے دربار کے ظالمانہ و بیرحمانہ واقعات دیکھنے سننے کے عادی ہوگئے تھے اور صبح سے شام تک ایسی سفاکی کی باتیں اور غریبوں کی آہ و زاری [illegible] دل پتھر ہو چکے تھے لیکن پھر بھی اس ستم رسیدہ شخص کی مصیبت اور اُسکے شاعرانہ بیان کو سنکے ضبط نہ کرسکے۔ جہانتک ہمارے امکان میں تھا ہم نے دلدہی اور دلجوئی کے کلمات کہے اور تسکین دی کہ ہم کسی کوشش میں دریغ نہ کرینگے ہماری ہمدردی سے وہ بھی مطمئن ہوا اور اُسنے کہا کہ ”اور تو جو کچھ میرے پاس تھا سب مجھسے چھین لیا گیا ہے۔ مگر ایک بیش بہا جواہر میں نے چھپا رکھا ہے“ یہ کہکے اُسنے ایک انگوٹھی نکالی جسمیں نہایت قیمتی زمرد جڑا ہوا تھا اور جسے وہ ہمیشہ پہنے رہتا تھا۔ یہ انگوٹھی اُسنے ہماری جماعت کے ایک صاحب کے حوالے کی اور کہا کہ ”اگر میرے اہل خاندان محتاج ہو جائیں۔ اور صرف ضبطی جائداد پر بلا ٹل جائے اور اُنکی جانیں بچ جائیں تو اسوقت اُنکے کفاف کے واسطے آپ یہ انگوٹھی بیچ ڈالیےگا

صاحب۔ آپ لوگ ان بیچاروں کے حق میں کوشش کرکے مظالم اور بے حرمتی سے انکو بچا لیجیے گا۔ بیوہ عورتیں اور یتیم بچے آپ لوگوں کے حق میں دعا کرینگے"

ہم لوگ اس مکان میں دیر تک نہ ٹھہر سکے۔ اور چلتے چلتے ہمنے اُسکو تسکین دی کہ جسقدر کوشش ہم سے ممکن ہوگی ہم اُسمیں ہرگز پہلوتہی نہ کرینگے۔ لیکن اُسکو اپنی جاں بخشی سے قطعاً مایوسی ہوگئی تھی کیونکہ اُسنے اپنے کانوں سے بادشاہ کو حکم قتل دیتے سنا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ میرے قتل میں جو تاخیر ہو رہی ہے وہ اسوجہ سے ہے کہ مارنے سے پہلے سخت ایذائیں اور تکلیفیں دے لینا مقصود ہے۔ کیونکہ اُسنے خود بارہا دیکھا تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ تقصیر پر سخت مظالم کیے گئے تھے۔

موعودہ تحقیقات کا وقت شام کو قرار دے دیا گیا تھا۔ اور بعد تحقیقات ہم لوگ حسب معمول بادشاہ کے خاصے کی میز پر حاضر ہونیوالے تھے۔ اس درمیان میں جسقدر وقت باقی رہا تھا وہ ہم لوگوں نے اپنے اپنے کمروں پر کاٹا۔ ہم میں سے ہر شخص کے دماغ میں یہی حسرتناک سماں اور گردش تقدیر کے یہ سب واقعات جو صبح سے شام تک پیش آئے تھے انھیں پر ہر شخص غور و خوض کرتا رہا۔

جب شام کو ہم لوگ کھانا کھانے سے قبل ایک بغل کے کمرے میں جمع ہوئے اُسوقت کپتان صاحب نے رزیڈنٹ کی گفتگو کا تذکرہ کرکے کہا کہ "خدا ہی کو معلوم ہے کہ کیا انجام ہونا ہے۔ میں تو خدا سے چاہتا تھا کہ میں اس خدمت پر نہوتا۔ کوئی اور کام میرے سپرد ہو جاتا۔ تمنے کچھ اور بھی سُنا۔ بیچارے بختاور کا بیمار و نحیف باپ معہ اُسکے عیال و اطفال گرفتار ہو آئے ہیں اور اسی طرح ذلت سے قید خانے میں محبوس کر دیے گئے ہیں"

اسی عرصے میں ایک چوبدار نے آکر ہم لوگوں سے کہا کہ "آدھ گھنٹے کے بعد جہاں پناہ آپ لوگوں کو یاد فرمائیں گے"۔ تب ہم لوگوں نے یہی صلاح ٹھہرائی کہ "چلو سب ملکے اس غریب خاندان کو مجموعی حیثیت سے دیکھ آئیں۔ اور جو کچھ تسکین و تسلی ممکن ہو دے آئیں۔ کیونکہ یقین تو ہے کہ صاحب رزیڈنٹ ان لوگوں کو بچا لیں گے"۔ یہ حرکت ہماری صرف رحم اور ہمدردی پر مبنی تھی اور ہرگز کچھ بھی تماشہ دیکھنا منظور نہ تھا۔ چنانچہ ہم لوگ صحن میں گئے جہاں یہ سب تباہی زدہ لوگ قید کیے گئے تھے۔

اگرچہ میں نے اپنے وسیع تجربے میں بہت سے جگر خراش اور درد انگیز حالات و معاملات دیکھے ہیں۔ بہتیرے گرفتاران رنج و محن کی داستانیں سُنی ہیں لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دل پر جیسا اثر ان عورتوں اور بچوں کے دکھ درد کو دیکھکے ہوا ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ بختاور سنگھ کی طرح ان لوگوں سے بھی سلوک کیا گیا تھا یعنے اُنکے زیور اور پوشاک اُتار کے ایک ایک ذلیل قسم کی چادر سبکو ستر پوشی

کے واسطے دیدی گئی تھی۔ اُسی کو اوڑھے پہنے یہ لوگ پڑے تھے۔ جان کا خوف بڑا ہوتا ہی۔ یہ سب اپنی زندگیوں سے مایوس۔ جانیں ہتیلی پر لیے ہوئے بھیڑیوں کی طرح کانپتے اور ایک دوسرے سے چمٹے جاتے تھے۔ بختاور سنگھ کا باپ جسکے جسم پر جھریاں پڑی تھیں اور دبلاپے سے سارے جسم کی ہڈیاں ڈھانچے کیطرح نظر آرہی تھیں اور صورت ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ قبر میں پانوں لٹکائے ہے اپنے بیٹے اور اُسکے اہل وعیال کی مصیبتوں پر پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا۔ جوان اور نازنین عورتیں جنکی عمریں ناز برداری میں گزری تھیں جو ہمیشہ عیش وعشرت ہی میں بسر کرتی رہی تھیں اور جن کی صورتوں تک غیر مردوں کی نظریں نہ پہونچی تھیں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی ایک گوشہ میں دبکی پڑی تھیں اور اپنے بچوں کو اپنے کلیجے سے لگائے تھیں اور ستم یہ تھا کہ بے تمیز اُجڈ سپاہی جو ادھر ادھر صحن میں ٹہل رہے تھے وہ ان بیچاریوں کو گھور رہے تھے اور ان پر آوازے کس رہے تھے۔ انھیں عورتوں میں سے ایک کو ہمنے دیکھا کہ اپنے بچے کو اپنی چھاتی سے لگائے ہی اور اپنے تڑپ کر اس آخری وقت مہر مادری کا حق ادا کرکے دل کو تسکین دے رہی ہی۔ ایک اور عورت کو دیکھا کہ خاموشی کے عالم میں نیچی گردن کیے اور زانو پر سر رکھے ہوئے حسرت واندوہ کی دیوی بنی ہوئی ہی۔ ان دونوں عورتوں کے بدن کی خوبصورتی اور سڈول پنے کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ جوڑ جوڑ ایسا ٹھیک بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نقاش یا مصور کی تاب وطاقت نہیں کہ ایسے تناسب اعضا کا نقشہ اُتار سکے چہرہ کا کھلا کھلا گندمی رنگ اور اسپر سادگی کے ساتھ ہلکے کالے بالوں کی لٹوں کا بکھرا ہونا ایک ایسا دلکش سماں تھا جسکی کیفیت ادا نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے قصداً بالوں کی لٹیں کھولکر انکو پریشان کر دیا تھا کہ شانہ وسینہ چھپ جائے اور دل کا غم چہرے کے ماتم سے بخوبی آشکارا ہو سکے

جب ان مصیبت زدوں کو یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگ بختاور سنگھ کے خیر طلب ہیں اور انکی تسکین دہی کی غرض سے آئے ہیں تب انکا وہ خوف دور ہو گیا جو ہمکو آتے دیکھ طاری ہو گیا تھا اور جسکی ہیبت سے وہ ایک دوسرے سے چمٹی جاتی تھیں اور اب اُنکے دلوں میں منت گزاری واحسانمندی کے جذبات کا جوش پیدا ہو گیا۔ اور یہی دلی جذبات اُنکی صورتوں سے بھی آشکارا ہونے لگے۔ جیسے ہی ہم لوگ اُنکے پاس پہونچے بیچاری عورتیں اور بچے ہمارے قدموں پر گر پڑے اور رو رو کے بختاور سنگھ کی جان بخشی کے واسطے ہمسے سعی کے خواہان ہوے۔ ہم لوگوں کے سامنے خوف زدہ حالت میں فرط غم والم سے نالہ وفریاد کرنا۔ اور ہر جملے کے ساتھ آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا ایک ایسا درد انگیز عالم تھا کہ بے اختیار کلیجہ منھ کو آتا تھا اور رحم معلوم ہوتا تھا۔ باایں ہمہ اُنکی یہ منت سماجت اور گریہ وزاری اپنی حفاظت کی غرض سے ہرگز نہ تھی بلکہ اُس

کمبخت کی جاں بری کے واسطے تھی جسکے ایک بے محابا سخن نے ان سب کو گرفتار بلا کرا دیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اگر کبھی ہندوستان نجات پائیگا تو اپنی عورتوں کی عفت اور محاسن اخلاق کیوجہ سے نجات پائیگا۔ کیونکہ ہندوستانی زنانخانوں سے بڑھکر کسی مہذب سے مہذب قوم کی عورتوں میں بھی یہ نیک نیتی۔ یہ پاکدامنی۔ یہ عصمت اور یہ جوہر شرافت نظر نہیں آسکتے۔ اہل یورپ کو ہندوستان کے نیچے درجے کی عورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں اور وہ انھیں کی حالت پر دوسروں کو بھی قیاس کرتے ہیں۔ لیکن یہ قیاس ویسا ہی غلط ہے جیسے کوئی غیر قوم کا آدمی لندن جائے اور وہاں گنجان گلیوں میں سرشام جو شوخ بیباک اور بدراہ عورتیں گیاس کی روشنی میں نظر آتی ہیں انکو دیکھکے عام طور سے انگلستان کی عورتوں کے اخلاق کی بابت رائے قائم کرلے۔

ہم لوگوں نے ان بوڑھیوں اور جوان عورتوں کو دم دلاسا دیا۔ گریہ و بکا سے منع کیا اور پورا وعدہ کیا کہ انکی رہائی کے بارے میں جسقدر کوشش ممکن ہوگی ضرور کرینگے۔ اس تسلی دینے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ صاحب رزیڈنٹ نے نواب کو بلا کے کہدیا تھا کہ اگر کسی جرم کا مجرم ہے تو بختاور سنگھ ہے۔ اُسکے اہل و عیال بیگناہ محض ہیں اور ان لوگوں کا قتل عام یا بیجا تشدد اور ظلم ہرگز نہونے پائے۔ بیشک کمپنی بادشاہ کو اپنی سلطنت میں کسی ڈاکو کے قتل کی اجازت دیسکتی ہے لیکن بیوفائی اور بیرحمی کے ساتھ کسی پورے خاندان کی قتل و خونریزی یا معصوم عورتوں اور بچوں کے تئیں تشدد جو وہ جفا بنانیکو ہرگز روا نہ رکھے گی۔ اور جبکہ کیفیت مظالم شاہی کی یورپ میں اہل یورپ کے کانوں تک پہنچے گی تو وہ کیا کہیں گے کہ آخر کمپنی کی گورنمنٹ ہندوستان میں بیٹھی کیا کر رہی ہے کہ انسانوں پر ایسے مظالم کا تماشا دیکھ رہی ہے اور چوں بھی نہیں کرتی۔

ہم لوگ اس مقام پر دیر تک نہ ٹھہر سکے کیونکہ یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ اگر کہیں بادشاہ کے یاد فرمانے کے وقت ہم لوگ وہاں موجود نہوے تو ضرور وہ دریافت فرمائیں گے کہ یہ لوگ کہاں گئے اور جب انکو یہ معلوم ہوگا کہ ہم لوگ اس ایک بدخواہ گورنمنٹ کے اور اُسکے اہل خاندان کی تسکین و تسلی کر رہے ہیں تو وہ اور زیادہ برہم ہو جائینگے۔ علاوہ اسکے خود ہم لوگوں کو اب اور بھی اس کمبخت جنرل کے بچانیکی فکر پڑ گئی تھی لہذا وہاں سے اٹھ آنا ہی مناسب معلوم ہوا۔

صاحب رزیڈنٹ نے جو کچھ اس بارے مین کیا تھا اُسے میں لکھ چکا ہوں۔ اگرچہ انھوں نے صرف بختاور سنگھ کے بال بچوں کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔ مگر اُنکا اصلی مقصد یہی تھا کہ بختاور سنگھ کی جان بخشی ہو جائے۔ کیونکہ انھوں نے نواب سے اچھی طرح پر دھمکا کے یہ کہدیا تھا کہ دیکھو نواب بختاور سنگھ کے بیگناہ خاندان پر اگر کچھ بھی تشدد کیا گیا تو میں اور کمپنی دونوں تمکو اُسکا ذمہ دار تصور

کرینگے" اور روشن الدولہ یا خاصہ تراش کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ صاحب رزیڈنٹ سے بگاڑ سکیں۔ اسلیے جب اُس روز شام کو جب جلسۂ شوری جمع ہوا تو ان دونوں نے ہم زبان ہوکر بہت اصرار کے ساتھ بادشاہ سے رحم اور عفو تقصیر کی استدعا کی۔ اور آخر کار زچ ہوکے بادشاہ نے فرمایا کہ "اچھا" اس کور نمک کی جان بخشی کیجائے مگر اُسکی جاگیر فوراً ضبط کرلیجائے اور وہ ایک کٹہرے میں ہمیشہ کے لیے محبوس کرکے لکھنؤ سے شہر بدر کردیا جائے" یہ حکم سزا صادر ہوگیا اور نواب کو اُسکی تعمیل سپرد ہوئی۔

اِس زمانے میں شمالی حصۂ ملک اودھ کا ایک رئیس لکھنؤ آیا ہوا تھا اور وہ دوسرے دن صبح کو لکھنؤ سے اپنے مستقر الحکومت جانیوالا تھا۔ اسلیے یہ صلاح قرار پائی کہ یہی رئیس اپنے ساتھ بختاور سنگھ کو بطور ایک دائم الحبس سزا یافتہ کے لیتا جائے۔ لیکن بادشاہ نے اتنی ہی سزا پر اکتفا نہ کی۔ اور فرمایا کہ "بختاور سنگھ کی تذلیل اس طرح پر ہونا چاہیئے کہ جسکی نظیر کبھی کسی راجہ کی نہوئی ہو۔ اُسکی پوشاک اور ہتھیار منگاؤ" چنانچہ فوراً اُسکی تعمیل کی گئی۔

ہندوؤنکا یہ خیال ہو کہ اگر کسی شخص کی پگڑی کی توہین کیجاتی ہو تو اُسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ گویا اُس پگڑی باندھنے والے کی ذات کی توہین کی گئی۔ چنانچہ اسی خیال کے بموجب ایک مہتر بلایا گیا اور وہ بادشاہ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ اس مہتر نے ہم سب لوگوں کے سامنے اُسکی پگڑی کو چھوکے ناپاک کرڈالا۔ تب جاکے بادشاہ کو اطمینان ہوا۔ مہتر نے اس خدمت کو بہت خوشی خوشی سرانجام دیا کیونکہ اُسکی چھوئی ہوئی چیز اُسکے سوا کوئی لے نہیں سکتا تھا چنانچہ یہ پگڑی اور پوشاک اسی کو مل گئی اور اُسکے زن و فرزند کے لیے یہ آبرو کا سامان ہمیشہ کے واسطے ہوگیا۔ پھر تلوار پیش ہوئی اور ایک لوہار بلایا گیا۔ اور اُسنے اُس تلوار کو پرزے پرزے کرڈالا۔ اب طپنچہ کی جوڑی کا نمبر آیا۔ اسپر لوہار ہتھوڑا مارنے ہی کو تھا کہ فوراً ہی اُسکے دل میں یہ اندیشہ گزرا کہ کہیں نال بھری تو نہیں ہو۔ وہ رک گیا اور جب اُسنے دیکھا تو دونوں پستول بھرے ہوئے ہیں۔ بادشاہ اُسکے رکنے ہی سے مطلب سمجھ گئے تھے۔ پوچھنے لگے کہ "کیا پستول بھرے ہوے ہیں" لوہار نے دست بستہ عرض کیا "جان بخشی ہو تو فدوی عرض کرے۔ خداوند نعمت۔ دونوں کی نالیں بھری ہوئی ہیں" اُسپر بادشاہ سلامت بول اُٹھے "یا حیدر! میں پہلے ہی سے کہ رہا تھا کہ یہ کور نمک اول درجے کا بد خواہ تھا" یہ کہکے وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوے اور بولے۔ "کہیئے صاحب لوگ۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ دیکھیے ظالم کے دونوں پستول بھرے نکلے۔ اب بتائیے کہ اس کارروائی کے سچے ہونے میں بھی کچھ شک ہی" اسپر ماسٹر صاحب نے عرض کیا کہ "خداوند نعمت۔ وہ تو حضور کی فوج کا جنرل تھا۔ اور اُسکا یہی فرض تھا کہ حضور کی ہمراہی میں جب رہے تو اپنے ساز و سامان سے لیس رہے۔ اور پستول بھرے رکھے مبادا کوئی وقت آپڑتا تو اُسوقت

کیا وہ منھ دیکھا کرتا۔" بادشاہ نے جواب دیا "واہ خاں! آپ نے تو خوب بات بنائی خدا جانتا ہے بہت کہی۔ اچھا ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں کہ اور لوگوں کی کیا رائے اس بارے میں ہے۔ کپتان صاحب کو بلاؤ۔ کہو فوراً حاضر ہوں۔"

اب یہ وقت پھر بہت نازک آپڑا تھا اور بیچارے بختاور سنگھ کی موت و زیست کا تصفیہ ترازو کی ڈنڈی پر رکھ دیا گیا۔ کہ ذرا سی ہوا سے جدھر چاہے جھک جائے۔

ہم لوگوں کو حکم ہو گیا کہ خبردار۔ کپتان صاحب کے آنے کے وقت کسی طرح پر اشارۃً کنایۃً کوئی بات اُن سے نہ کہی جائے۔ اگرچہ ہملوگوں کو اتنا خیال ضرور تھا کہ کپتان صاحب خود ہر طرح پر بختاور سنگھ کے بہی خواہ تھے تاہم اندیشہ تھا کہ اگر اُنکی زبان سے ایک حرف بھی خلاف نکل گیا تو پھر اُس بیچارے کی جان کا خدا ہی حافظ ہے۔ کپتان صاحب آئے سلام کرکے آگے بڑھے۔ بادشاہ سلامت بول اُٹھے کہ "دیکھو کپتان یہ بتاؤ کہ کیا راجہ بختاور سنگھ (جواب نہ راجہ باقی رہا ہے نہ سنگھ) کا یہ فرض منصبی تھا کہ وہ جب ہمارے ساتھ رہیں تو بھرے ہوئے پستول باندھے اب اُسوقت ہملوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ بیم و رجا کی کشاکش سے ہر شخص بُت بنا بیٹھا تھا اور کپتان صاحب کے جواب پر سب کے کان لگے ہوئے تھے۔ کیونکہ اسی جواب پر گویا اُس بیچارے کی جان معلق تھی۔ لیکن اُسوقت کی حالت نے کپتان کو اصل معاملہ کی حقیقت سمجھا دی تھی۔ اُنھوں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ باندھے سناٹے میں کھڑا ہے۔ بادشاہ بھی ساکت ہیں۔ پستول میز پر دھرے ہوئے ہیں۔ اور ہم لوگوں کے چہروں سے تشویش ظاہر تھی۔ ان تمام قرائن پر نظر کرکے اُنھوں نے بیساختہ جواب دیا کہ "خداوند نعمت! بیشک کمانڈر انچیف (سپہ سالار عساکر) یا جنرل افواج شاہی کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ ہر وقت ہر خطرے کے دفعیہ کے واسطے مستعد رہیں تاکہ اگر اتفاقاً کوئی موقع پڑ جائے تو فوراً وہ اعدائے شاہی کو موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ اگر وہ اپنے پستول بھرے نہ رکھیں گے تو اُنکے باندھنے کا حاصل ہی کیا ہوگا۔" جب بادشاہ نے یہ جواب سُنا تو کسیقدر خفیف ہوئے مگر سچی بات تھی سُنکے ٹال گئے اور خفت مٹانے کو بولے تو یہ بولے کہ "اچھا ان تمنچوں کو چھوڑ کے خالی کر ڈالو اور پھر اُنکو پرزے پرزے کرکے ہوا میں اُڑا دو۔"

اُس شب کو معمولی طور پر کھانا ہوا۔ اُسیطرح میوہ جات پر رائے زنی ہوائی اور اُسیطرح بیدریغ شراب بٹتی رہی۔ راگ رنگ میں مبتلا ہو کے ہر شخص مست الست اور دنیا کی فکروں سے آزاد و فارغ البال ہو گیا کسی کو اُن گرفتاران رنج و محن کا خیال نہ گزرا جو صحن میں قید یا جلا وطنی کے حکم سننے کا انتظار کر رہے تھے اور کھانے پینے کے وقت کسی نے اس معاملے کا ذرا ذکر مذکور بھی نہ کیا۔ بادشاہ سلامت بھی معمولی شگفتگی کے ساتھ ہشاش بشاش شراب نوش جان فرماتے اور سیر تماشے میں جی بہلاتے رہے۔ وہی ہنسی دلگی کی باتیں تھیں وہی تفریح زندہ دلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انکو اپنے کیے پر ذرہ برابر ندامت ہے نہ اُنکے دل میں اپنی غلطی پر کچھ

بھی افسوس و حسرت۔

دوسرے دن صبحکو خود صاحب رزیڈنٹ نے آکر بختاور سنگہ کے مصیبت زدہ خاندان کو دیکھا اُنکو اپنی ہمدردی کا یقین دلا دیا۔ اور اس بات سے مطمئن کیا کہ اب وہ خود اُنکے پشت پناہ ہونگے اور اُنپر کسی طرح کا جور و تعدی نہونے دینگے۔ یہ لوگ بڑے صاحب کو بڑی رقت کے ساتھ دعائیں دینے لگے۔ حقیقت یہ ہی کہ صاحب رزیڈنٹ کی تسکین و تسلی نے اُنکے زخم خوردہ دلونپر بہت اچھا مرہم رکھا اور اب اُنکو اتنا سہارا ہوگیا کہ کوئی ہارا بھی پرسان حال ہی۔

اُسی روز بختاور سنگہ مع اپنے اہل و عیال کے قیدیوں کیطرح اُس رئیس کے ساتھ کر دیے گئے جو شمالی حصہ اودھ کا رہنے والا تھا اور جسکا ذکر اوپر ہو چکا ہی۔ صرف بختاور سنگہ ایک بڑے جنگلی جانور کے کٹہرے میں بند تھا اور اُسپر کچھ اور بھی سختیاں ہوتی تھیں باقی اسکے دیگر اہل خاندان ہر قسم کے ظلم و تعدی سے نجات پاگئے تھے اور گونہ آرام سے تھے۔ صاحب رزیڈنٹ کی دست اندازی سے جو کچھ ہوتا تھا اسے ہر طبقہ کے ہندوستانی لوگ تائید غیبی سمجھتے تھے۔ چنانچہ امیر غریب۔ شاہزادے اور سپاہی یکساں طور پر کمپنی بہادر اور اسکے نائب یعنی رزیڈنٹ سے ڈرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کے دلوں میں کمپنی بہادر کے نام کی ہیبت و جلالت سمائی ہوئی تھی۔ اور جاہل سے جاہل ہندوستانی یہ خیال کرتا تھا کہ کمپنی بہادر کوئی زبردست خطرناک اور چالاک جانور ہی کہ بہت دور سے بیٹھا ہوا ہندوستان میں نیک و بد جو کچھ ہو رہا ہی اُسے دیکھ رہا ہی۔ نہیں عقدہ حل ہوتا کہ وہ کیا بلا ہی۔ کوئی دیو ہی کہ آدمی۔ فرشتہ ہی یا دیوتا ہی۔ بہرحال کچھ ہی کیوں نہو۔ اس قابل ضرور ہی کہ اس سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔

بیچارا بختاور سنگہ چلا گیا اور اُسکے متعلق جو ابتک ہمکو جو کچھ حال بھی پتہ معلوم ہوا کہ اُسکے بعض اعزا اُسکی کفالت بہت اچھی طرح سے کر رہے ہیں اور وہ رئیس جسکی حراست میں وہ دیا گیا تھا کچھ اسی میں اپنے واسطے بہتری سمجھتا ہی کہ اُسے آسایش سے رکھے۔ ظن غالب یہ ہی کہ امرائے ہندوستان کے عام دستور کے مطابق اُسنے اپنی دولت تھوڑی بہت کسی ایسے مقام پر محفوظ کر دی تھی جہاں وہ ضبطی و قرقی کی آفتوں سے بچی رہی۔ کیونکہ اسکا پتہ کسی کو ملا ہی نہوگا۔ یہ سچ ہی کہ روشن الدولہ نے بڑی ہوشیاری سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے جہاں جہاں اُسکی جائداد کا پتہ چلا اُسپر تصرف کیا اور اپنے نزدیک اُسے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا مگر بایں ہمہ جسوقت بختاور سنگہ کو مقربان شاہی یا ملازمان رزیڈنسی کو رشوت و نذرانہ دینے کے واسطے روپیے کی حاجت ہوتی تھی اُسے روپیہ کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتا تھا۔

بختاور سنگہ کی داستان مکمل کرنیکے واسطے میں اُسکے پورے واقعات اسی مقام پر لکھے دیتا

ہوں۔ جس سال بختاور سنگھ قید اور جلا وطن کیا گیا ہی اُسی سال ملک اودھ میں قحط عظیم پڑا۔ خصوصاً چاولوں کی پیداوار بہت کم ہوئی اور وہ غلہ بھی جو اس ملک کے عوام کی روزانہ خورش ہی بہت ہی کم پیدا ہوا۔ لہٰذا بیحد گرانی ہو گئی اور باہر سے کنگلوں نے شہر میں آکے لوٹ مار شروع کر دی۔ ہر طرف بد دلی پھیل گئی۔ جا بجا سرہنگی ہونے لگی۔ لوگوں نے ڈنکے کی چوٹ پُکار پُکار کے کہنا شروع کر دیا کہ بنیوں بقالوں نے بے وجہ غلے کا بھاؤ بڑھا دیا ہی۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اور امن عامہ میں بالکل خلل پڑ گیا۔ جب بادشاہ سلامت کی سواری نکلتی تو اُنکے ہاتھی کی ہودج میں غریبوں۔ فاقہ کشوں کی اتنی عرضیاں گرانی کی شکایت اور بنیوں کے مظالم کی ہر طرف سے برستی تھیں کہ ہودج بھر جاتا تھا۔ اور اگر کبھی گھوڑے پر نکلتے تھے تو قحط زدہ لوگ جھک جھک کے عرضیاں پیش کرتے اور اپنی تکالیف اور مصائب کی داستانیں سُناتے تھے۔ بادشاہ سلامت جب ہر طرف سے شکایتیں سنتے سنتے بہت تنگ آ گئے تو اُنھوں نے باہر نکلنا کم کر دیا۔

اب بختاور سنگھ کی جلاوطنی کو پورا سال گزر چکا تھا۔ لیکن ہنوز امن قائم نہیں ہوا تھا عرضیاں اب بھی آ رہی تھیں اور خاندانوں کی تباہی و بربادی۔ خلقت کی فاقہ کشی و جاں بلبی کے افسانے سنتے سنتے بادشاہ کے کان پک گئے تھے۔ آخر کار ایک روز سر دربار بادشاہ نے فرمایا کہ "حقیقت میں بڑا اندھیر مچا ہوا ہی۔ میں نے لکھنؤ میں کبھی نہیں دیکھا کہ اتنے دنوں بے امنی و بد دلی کا دورہ رہا ہو۔" نواب نے اسکے جواب میں کچھ کمی پیداوار کا ڈھکڑا شروع کیا۔ لیکن بادشاہ نے متغیر ہو کے فرمایا "روشن! کیا بُڑھی عورتوں کے ایسے ڈھکڑے بیان کر رہا ہی۔ میں سب باتوں سے واقف ہوں۔ ہو نہو۔ دال میں کچھ کالا ہی غلہ کی خرابی کے کیا معنے ہیں۔ سال گذشتہ میں تو بہت اچھی پیداوار ہوئی تھی۔ کیوں ماسٹر صاحب آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ ؟"

اسپر ماسٹر صاحب نے عرض کیا کہ "خداوند نعمت! میں تو یہ جانتا ہوں کہ بازار کا انتظام کچھ بگڑا ہوا ہی بس اُسکی نگرانی کامل ہونا چاہیئے۔ سارا غل شور فرو ہو جائیگا۔" بادشاہ نے فرمایا۔ "واقعی ماسٹر صاحب میں آپسے اتفاق رائے کرتا ہوں۔ اچھا ایک کام کیوں نہ کریں۔ آج شام کو ہم سب لوگ چلیں اور چل کے خود تحقیقات کریں۔ بھیس بدل کے چلنا چاہیئے۔ جیسے خلفاء بغداد بھیس بدلا کرتے تھے۔ میں خود بھی ساتھ چلونگا۔ میرا جانا بہت بکار آمد ہوگا اور خالی از لطف بھی نہوگا۔" چونکہ بادشاہ سلامت اسبات کو دل میں ٹھان چکے تھے اسوجہ سے یہ کسیکی قدرت نہ تھی کہ انکو باز رکھ سکتا۔ لہذا ہم سبکو بھیس بدل کے جانا لازم ہوا۔ اُس وقت کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ہمارے اسطرح جانے سے کوئی بڑا کام نکلے گا۔ خود بادشاہ سلامت معمولی یورپین لباس پہنکے چلنے پر تیار ہو گئے۔ روشن الدولہ نے بھی وہی وضع بنائی۔ دو اور

ملازم بھی اُسی حیثیت سے ساتھ ہوے اور اور صاحب لوگوں کو حکم ہوا کہ جُدا جُدا بازار میں بطور خود جائیں تاکہ کسی کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ بادشاہ کے ہمراہ ہیں۔ اور نہ کوئی شخص بادشاہ کو پہچان سکے۔ نواب اور کپتان نے ہر قسم کا انتظام اس غرض سے کرلیا تھا کہ کوئی اتفاقی سانحہ پیش نہ آنے پائے۔ بلکہ یہ بھی بندوبست کرلیا تھا کہ اگر کسی صورت سے کوئی واردات پیش آجاے تو اُسکا انسداد کردیا جائے کیونکہ اس بات کا خطرہ ضرور تھا کہ خود بادشاہ کے اہل خاندان کو اگر اسکی اطلاع ہوجائیگی کہ جہانپناہ اس طرح بیکس بیہی و دو گوشی اور بھیس بدلے ہوے بازار میں نکلے ہیں تو غالباً وہ کچھ فساد ضرور برپا کریں گے اور کچھ نہیں اگر ان لوگوں نے اتنا ہی کردیا کہ چند بدمعاشوں کو بھیجکے بادشاہ کے اوپر حملہ کرادیا تو اُنکا ہاتھ پکڑنے والا کون ہوگا۔ ان خطرات پر نظر کرکے کپتان اور نواب نے اپنے سپاہیوں کو مخفی حکم دیا کہ معمولی لکھنؤ لباس میں لیکن مسلح برابر ساتھ ساتھ رہیں۔ چونکہ عموماً لوگ بازار میں ہتھیار بند نکلتے ہی ہیں۔ اسوجہ سے ان سپاہیوں کو دیکھکے کسی کو مطلق شک وشبہہ بھی نہوگا"

یہ ہرگز خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اتنے آدمیوں کے ایک ساتھ جانے سے کسی کو کوئی شبہہ پیدا ہوگا۔ ہرگز نہیں کیونکہ شام کے وقت بازار میں آدمیونکی اسقدر ریل پیل ہوتی ہو کہ شانہ سے شانہ چھلتا ہو۔ اور بغیر دھکم دھکا دو قدم چلنا مشکل پڑجاتا ہو۔ اور اسکی وجہ زیادہ تر یہی ہو کہ راستے تنگ ہیں اور انمیں آدمیوں کی بھیڑ لگ جاتی ہو۔ خیر تو ایسی حالت میں بہت سے آدمیوں کی جماعت کا بغیر کسی شبہہ یا وسواس کے پیدا کیئے بے تکلف نکل جانا آسان ہو

ہم لوگ بازار میں پہونچے جسمیں ہر طرف چراغوں کے جلنے کے سبب دھواں چھایا ہوا تھا۔ اور کثیف و بدبودار کپڑے پہنے ہوے لوگوں کی آمد و رفت کے سبب سارا راستہ گندا ہو رہا تھا۔ ایک طرف سے کلے ٹھلے کے راجپوت اور پٹھان ڈھال تلوار سے اُبکی بنے ہوے۔ تیوریاں چڑھائے کہنیاں مارتے اور شانے سے شانہ رگڑتے چلے گئے۔ ایک طرف سے لمبی داڑھی والے متقی پرہیزگار مسلمان ہم لوگوں کی طرف اس نظر سے گھورتے نکل گئے کہ "بھلا یہ مقام صاحب لوگوں کے چلنے کے قابل ہو"۔ ایک طرف چھریرے بدن کے ہندو دوکاندار مسکرا مسکرا کے ہماری طرف دیکھتے اور اپنے سودے کی خریداری کی درخواستیں چکنے چپڑے الفاظ میں کر رہے تھے۔ بالآخر ہم لوگ ایک صراف کی دوکان کے قریب پہونچے۔ یہاں ذرا راستہ کشادہ تھا۔ اور ویسی بھیڑ بھی نہ تھی۔ صراف کے سامنے روپیوں پیسوں اور ریزگاریوں کے ڈھیر الگ الگ برتنوں میں لگے ہوے تھے۔ اور بیچ دوکان میں صراف صاحب چارزانو بیٹھے ہوے تھے۔ اور دوکان سے ملے ہوے قوی ہیکل سپاہی کھڑے ہوے صراف

اپنی حفاظت کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک خوشحال سوداگر کچھ اچھے کپڑے پہنے ہوے صراف کی دوکان پر آیا۔ بڑے تپاک سے علیک سلیک کی۔ اور بولا "ارے میاں۔ مادھو! کچھ سنا بھی! آج صبح ایک اور چاول والے کی کوٹھار لٹ گئی" مادھو نے جواب دیا "بڑا برا وقت آلگا ہی۔ بھائی بہت ہی برا وقت آلگا ہی" یہ کہکے وہ دیر تک افسوس کے ظاہر کرنے کو اپنی گردن ہلاتا رہا پھر ہملوگوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھکے اُسنے شاید یہ خیال کیا کہ ہملوگ اُس سے کچھ لینا چاہتے ہیں لہذا وہ ہماری طرف متوجہ ہوگیا۔ بادشاہ سلامت اس سوال جواب کو سُنکے چوکنا ہو چکے تھے۔ اور اب اُنکو منظور تھا کہ ذرا اور خیالات سنیں۔ چنانچہ وہ اس دوکان سے ذرا ہٹ کے ایک تمولی کی دوکان کے برابر کھڑے ہوگئے۔ اور ادہر ہی دیکھنے لگے ہملوگ بھی کچھ آگے بڑھکے ایک تلوار دیکھنے لگے ایک نووارد سوداگر نے پھر کہا کہ "اجی ایسا برا وقت آلگا ہی کہ نفع سے مال بیچنا مشکل پڑگیا ہی ہر گھڑی تو یہی دھڑکا لگا رہتا ہی کہ کہیں کوئی لوٹ نہ لے۔ ان دہڑکوں میں خرید و فروخت کا کیا ٹھیک" مادھو نے جواب دیا "ہاں جی! سچ تو کہتے ہو۔ اب تو بڑا دھڑکا لگا رہتا ہی۔ نہ معلوم اب کیا گڑبڑ ہوگئی ہی۔ ورنہ آخر پہلے یہ بات کبھی نہ تھی" پھر گردن ہلا کے اُسنے کہا کہ "اور اب خدا ہی ہی جو یہ حالت سنبھلے۔ کچھ امید نظر نہیں آتی" اسی عرصے میں ایک گاہک آگیا اور وہ اس سے مخاطب ہوگیا "کہئے حضور۔ اشرفی ہو ولایتی کا ہو پندرہ روپیہ۔ گیارہ آنے چار پائی کا بھاؤ ہی۔ چار آنے آٹھ پائی دستوری اور لوگ پورے پانچ آنے دستوری لیتے ہیں میں تو چار آنے آٹھ پائی لیتا ہوں" پھر وہ اُسی شخص کی طرف مڑا اور بولا کہ "ہاں۔ بابو صاحب! بڑا برا وقت ہی" اسکے جواب میں بابو نے کہا کہ "بھائی سچی بات تو یہ ہی کہ راجہ بختاور سنگھ کے زمانے میں یہ بات کبھی نہ تھی۔ جب سے وہ گئے بس تب ہی سے ساری گڑبڑ مچگئی ہی۔ بھلا اُنکے وقت میں کسیکی مجال تھی کہ اندھیر مچاتا۔ وہ بازار کا انتظام خوب کرتے تھے" اسپر بادشاہ نے بھی کان کھڑے کیے اُنھوں نے اب اور بھی کان لگا کے سننا شروع کردیا۔ اور اسی غرض سے ذرا آگے بڑھکے کچھ پھول کے کٹورے دیکھنے لگے۔ مادھو نے بابو کو یہ جواب دیا "سچ کہتے ہو۔ بابو جی! اُنکا انتظام بڑا چوکس تھا۔ بازار تو اُنکے بندوبست سے سنبھلا رہتا تھا۔ تمھارا کہنا بالکل سچ ہی۔ یہ سارا انتظام اُنھیں کے دم کے ساتھ گیا۔ افسوس اب تو بڑا برا وقت آلگا ہی"

بابو صاحب تو اتنا شوشہ چھوڑ کے چلتے پھرتے ہوے۔ اُنکو جو کچھ کہنا تھا کہہ گئے۔ مجھے اسوقت بھی اور اب بھی یہی خیال ہی کہ یہ شخص اسی غرض سے بازار بھیجا گیا تھا۔ اور غالباً بختاور سنگھ کے کسی عزیز یا دوست نے بادشاہ کے بازار جانیکی خبر سنکے یہ تدبیر کی ہوگی۔ کہ اسی ذریعے سے بادشاہ سلامت کو اس تباہی زدہ جنرل کی یاد آجائے چنانچہ اُسکا یہ منصوبہ پورا ہوگیا۔

کیونکہ اب بادشاہ جو قصر شاہی میں داخل ہوئے تو کسی فکر میں ڈوبے ہوئے۔ اُنکے دماغ میں اب ایک نیا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ اسی طرح جم گیا تھا جیسے اکثر لوگ جنکی طبیعتوں میں از خود ایجاد و اختراع کا مادہ نہیں ہوتا۔ اُنکے دماغوں میں دوسرونکی سجھائی ہوئی بات خوب جم جایا کرتی ہے۔ اب اُنکو بختاور سنگھ کا اور ان باتونکا جو بازار میں سنی تھیں تصور بندھ گیا۔ اور خوب بندھ گیا۔

چنانچہ۔ اس واقعے کے دو مہینے بعد راجہ بختاور سنگھ دربار میں اپنی خدمت سابقہ پر نظر آنے لگے۔ وہی خدمات و فرائض اُنکے سپرد ہوئے۔ وہی سرفرازی و نظر عنایت انپر ہو گئی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بیچ میں کوئی تفرقہ پڑا ہی نہ تھا۔ بختاور سنگھ کی سرفرازی کے بعد غلکی پیداوار بھی بافراط ہوئی۔ اور جس زمانہ میں میں نے لکھنؤ کو خیرباد کہا تھا اسوقت تک راجہ بختاور سنگھ بدستور "جنرل" تھے اور بادشاہ کی نظر عنایت کچھ اور زیادہ اُنپر ہو گئی تھی۔

باب نہم

حرم شاہی

اگرچہ حرم شاہی کے اندرونی مکانات اور وہانکے رہنے والیوں کے طرز ماند و بود کے دیکھنے کا ہمکو کوئی موقع کبھی نہیں ملا۔ پھر بھی وہاں کے حالات سنے سنائے اتنے معلوم ہیں کہ جو کافی سمجھے جا سکتے ہیں سننے کا ذریعہ یہ تھا کہ اول تو یورپین لیڈیاں اکثر اوقات حرم شاہی میں جایا کرتی تھیں اُنسے بہت کچھ حالات معلوم ہو جاتے تھے۔ باقی جزئی باتونکی اطلاع خواجہ سراؤنسے ہو جاتی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ تو بیگمات شاہی کی خدمتگزاری کے واسطے مخصوص ہی تھے صبح سے شام تک کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ اور ان لوگوں سے ہمکو اکثر ملنے اور بات چیت کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ پس اسطور پر اگرچہ بہت سی باتیں ہمسے مخفی بھی رہی ہونگی تاہم اکثر حالات کا نہایت صحیح علم بھی ہمکو ہو گیا۔ بہت کچھ وہاں کے حالات ہماری سمجھ میں بھی آ گئے۔ اور خلاصہ یہ کہ اگرچہ ہمنے ان مقامات کو براے العین مشاہدہ نہیں کیا لیکن دوسرے لوگوں کے ذریعے سے اسقدر واقفیت حاصل کر لی کہ محض عقل آرائی کرنا نہیں پڑتی ہے۔

حرم شاہی کے عجائبات و نوادر میں سب سے زیادہ جو چیز اہل یورپ کے کانوں کو غیر مانوس معلوم ہوگی وہ وہاں کے زنانہ سپاہیوں کی حالت ہوگی۔ میں نے خود ان مردنما سپاہیونکو اکثر زنانی ڈیوڑھی پر ٹہلتے طلایہ کرتے دیکھا ہے۔ مجھے خود ایک عرصے تک اُنکے عورت ہونیکی خبر نہ تھی۔ اور بہت دن بعد مجھپر اُن کی اصلی جنسیت کا بھید کھلا۔ میں ہمیشہ ان زنانہ سپاہیوں کو یہی سمجھتا رہا کہ پست قد جوان مرد ہیں جو ڈھیلے

ڈھیلے کرتے پہنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ انکی ترکیب جسمانی میں بجز قد کی پستی اور سینے کے اُبھار کے اور کوئی ما بہ الامتیاز نہ تھا۔ اور چونکہ مجھے ولایت میں سپاہیوں کو ڈھیلی وردی پہنے اور لقا کبوتر کی طرح پھولی بھالی دیکھنے کی عادت سی ہو گئی تھی اسوجہ سے جب میں نے اُنکو دیکھا تو کوئی اچنبھا نہ ہوا۔ نہ اُنکی اصل حقیقت دریافت کرنیکی ٹوہ ہوئی۔

یہ عورتیں اپنے لانبے لانبے بالونکا جوڑا باندھ لیا کرتی اور پھر اُسے سر پر رکھے پگڑی سے چھپا لیتی تھیں۔ باقی وردی وہی ہوتی تھی جو معمولاً ہندوستانی سپاہی پہنتے ہیں۔ مردوں ہی کی طرح وہ ہتھیار بھی اپنے جسمونپر سجائے ہوتی تھیں۔ ہاتھ میں سنگین چڑھی ہوئی بندوق۔ کمر میں پیٹی۔ شانے پر کارتوسونکا پرتلا بعینہ وہی سپاہیانہ وضع جو احاطۂ بنگال کی فوج کی ہوتی ہے۔

چونکہ ان عورتوں سے حرم شاہی کے پہرہ چوکی کا کام متعلق تھا اسوجہ سے میں نے خود اُن کی صفوں کو در دولت کے صحن میں پرے جمائے قواعد کرتے دیکھا تھا۔ ایک ہندوستانی افسر شاہی فوج کا آتا تھا اور قواعد سکھایا کرتا تھا۔ یہ عورتیں پوری طرح سے بندوق چھتیانے آگے بڑھنے پیچھے ہٹنے۔ ادہر اُدہر باقاعدہ گھومنے بندوق بھرنے۔ نشانہ لگانے سنگین چڑھانے کے کام اُسی ترتیب اور قواعد کے ساتھ کرتی تھیں جیسے بارکوں میں ہوتے ہیں۔ یہ تو میں ٹھیک نہیں کہ سکتا کہ وہ کبھی مرد سپاہیوں کے ساتھ میدان جنگ میں شریک ہو کے کام دیسکتی تھیں۔ غالباً نہیں دیسکتی تھیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اُن کے اپنی جماعت میں سارجنٹ اور کاربوریل وغیرہ تو ہوتے تھے۔ میرے یقین میں اُن کی جماعت میں افسری کا درجہ سارجنٹ سے بڑھنے نہ پاتا تھا۔

ان عورتوں میں سے اکثر منکوحہ ہوا کرتی تھیں۔ اور اسوجہ سے کبھی کبھی مہینہ دو مہینے کے واسطے ایسی عورتیں اپنی خدمت سے چند روزہ علیحدگی پر مجبور ہو جاتی تھیں لیکن جب تک ممکن ہوتا تھا وہ اپنا کام ضرور کیے جاتی تھیں۔ مجھے جس وقت تک یہ بھید نہیں کھلا تھا کہ یہ عورتیں سپاہی بنی ہیں میں نے کبھی اس بات پر غور بھی نہیں کیا کہ اُنکے قد و قامت اور اعضائے جسم کا تناسب مردونکا ایسا نہیں تھا۔ اور چونکہ میں نے انگلستان میں ایسے سارجنٹ بہت دیکھے تھے جنکے چہرے اور قد و قامت اُن عورتوں سے مشابہ تھے جنکی مدت وضع حمل قریب ہو جاتی تھی۔ اس لیے کوئی حیرت اُنکو دیکھکے نہیں ہوئی نہ یہ کوئی نئی بات معلوم ہوئی۔ بادشاہ سلامت اکثر ان عورتوں کو دیکھکے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ اور اُنکو انعام دلادیا کرتے تھے مجھکو یہ معلوم ہوا تھا کہ اس بارے میں قطعی احکام نافذ ہو گئے تھے کہ زمانہ وضع حمل کے قریب آجانے پر یہ عورتیں اپنی خدمت سے برائے چندے

[illegible] جو دیا کرتی تھیں۔ لیکن یہ احکام نہایت تہذیب کے ساتھ بہت ہی مہذب الفاظ میں قلمبند کیے گئے تھے اور اُنکے معہود ذہنی معانی ایک اور پیرایے میں بیان کر دیے گئے تھے۔

ان زنانہ سپاہیوں کی کُل دو کمپنیاں تھیں اور اُنکے ضعف اور قوت کا تصفیہ ناظرین خوب کر سکتے ہیں۔ میرے زمانہ قیام لکھنؤ میں صرف ایکبار یہ اتفاق پیش آیا تھا کہ بادشاہ نے ان عورتوں کو اپنی ماں کے مقابلے میں لڑنے بھڑنے کو بھیجا تھا۔ میں بیشتر لکھ چکا ہوں کہ نصیر الدین حیدر کے باپ غازی الدین حیدر سابق شاہ اودھ نے یہ ٹھان لی تھی کہ نصیر الدین حیدر اُنکے قائم مقام نہونے پائیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کوشش کی تھی کہ انکو اپنے قبضے اور اختیار میں کر لیں۔ تاکہ اگر ضرورت پڑے تو اس جھگڑے کے مٹانے کیواسطے انکی جان ہی لے ڈالیں اور کسی طرح تخت نشین نہونے دیں۔ لیکن اُسوقت نصیر الدین حیدر کی ماں بڑی جرأت و استقلال کے ساتھ اپنے بیٹے کی طرف سے لڑیں۔ اُنھوں نے اپنے سپاہیوں کو مسلح کر کے ذاتی مردانگی سے بہت اچھی مثال قائم کی اور اپنے ہمراہیوں میں بہت کچھ جوش بھی پیدا کر دیا چنانچہ بالآخر وہی فتحمند ہوئیں اور بادشاہ نے شکست کھائی۔ یعنے ایک سخت خونریزی ہوئی اور صاحب رزیڈنٹ نے درمیان میں پڑ کے کشت و خون موقوف کرایا۔ ان حالات پر نظر کر کے ہر شخص یہی خیال کریگا کہ نصیر الدین حیدر نے اپنے عہد سلطنت میں اپنی ماں کے اُن حقوق خدمت کو جو اُنھوں نے بیٹے کی بے بسی کے عالم میں کی تھیں اور جنکی بدولت اُنکو تخت شاہی نصیب ہوا تھا کبھی فراموش نہ کیا ہوگا۔ لیکن یہ خیال واقعات سے غلط ثابت ہو گیا۔ یعنے جو کار روائی غازی الدین حیدر نے نصیر الدین حیدر کے واسطے کرنا چاہی تھی بعینہ وہی کار روائی نصیر الدین حیدر نے اپنے بیٹے کے ساتھ کرنا چاہی اور ایکبار پھر نخیبہ بیگم صاحبہ (نصیر الدین حیدر کی ماں) نے اپنے پوتے کی حفاظت میں وہی جوہر شجاعت دکھائے جو نصیر الدین حیدر کے واسطے اُنکے باپ کے مقابلے میں دکھائے تھے۔ اُنھوں نے پوتے کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور بادشاہ کو حوالہ کر دینے سے قطعی انکار کیا۔ نصیر الدین حیدر نے بہت کچھ غیظ و غضب دکھایا۔ مگر بیگم صاحبہ ایسی [illegible] ڈر جاتیں۔ بادشاہ نے اُنکو حکم دیا کہ جس محل میں وہ رہتی ہیں اُسے خالی کر دیں اور دوسرے محل میں جا کے رہیں۔ انکو بادشاہ کیطرف سے شک و شبہہ تو پیدا ہی ہو چکا تھا۔ فوراً وسواس پیدا ہوا کہ ہو نہو اس کار روائی میں کچھ فی ہے۔ اُنھوں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ تب بادشاہ نے اپنی زنانہ فوج کو اُنکے اخراج کا حکم دیا۔ لیکن بیگم کے ساتھیوں نے مقابلہ کر کے اس فوج کو ہٹا دیا۔ اُسوقت کی لڑائی میں چند گولیاں میرے مکان کے اوپر اوپر سے نکل گئی تھیں بلکہ دو چار کھڑکیوں میں بھی آ کے لگی تھیں۔ جب میں نے اصل حقیقت دریافت کی اور سب حالات معلوم ہوے تو میں نے یہی قصد کر لیا کہ یہ مکان چھوڑ دینا

چاہیئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ کی یہ کیفیت ہو رہی تھی کہ اگر چند آدمی قتل ہو جاتے یا کسی معمولی ہنگامے مین دو چار بندوقیں چل جاتیں تو ہم لوگ دست باچہ ہو جاتے تھے۔ خیر۔ تو ماں بیٹے کی اس لڑائی میں بیگم صاحبہ کے پندرہ سولہ آدمیوں کی جانیں گئیں۔ اور آخر کار اس معاملے کا یوں خاتمہ ہو گیا کہ صاحب رزیڈنٹ نے مداخلت کی اور بادشاہ نے یہ اقرار کیا کہ "بیگم صاحبہ یا اپنے لڑکے سے آیندہ کچھ تعرض نہ کرونگا اگر بیگم صاحبہ اُس مکان میں اُٹھ کے چلی جائینگی جسمیں میں چاہتا ہوں"۔ اسپر صاحب رزیڈنٹ نے اس لڑکے کی جان کا ذمہ اُٹھایا اور بیگم صاحبہ مکان سے اُٹھ گئیں۔ کیونکہ بیگم صاحبہ کو ایک انگریز کی زبان پر بہ نسبت بادشاہ اور اُنکے جمیع وزرا کے قول وقسم کے زیادہ اعتبار تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف یورپ ہی میں انگلستان کی وہ عظمت وجلالت اور اُسکی بات کی وہ معجز نما تاثیر ظاہر نہیں ہوتی جو ایک ایک انگریز کے نام میں مضمر ہے۔

بیگم صاحبہ کی اس تمام دوادوش اور مردانہ عزایم واستقلال پر بھی یہ لڑکا بادشاہ کا جانشین نہو سکا۔ کیونکہ نصیر الدین حیدر نے بذریعۂ اشتہار اس لڑکے کے حرامی ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور اسی مضمون کے سرکاری اشتہارات لکھوا کے لکھنؤ کے پھاٹکوں پر چسپاں کرا دیے گئے تھے۔ اور اُس کارروائی پر انگریزی گورنمنٹ ہند نے تجویز کیا کہ ایسی صورت میں کہ اس لڑکے کے ماتھے پر یہ کلنک کا ٹیکا لگا ہوا ہو اُسکو تخت وتاج شاہی پانے کا کوئی حق نہیں پھر جب خاصہ تراش کے چلے جانے کے تھوڑے دن بعد نصیر الدین حیدر کو زہر دیا گیا تو بیگم صاحبہ نے از سر نو اس فتنے کو برپا کیا اور اسقدر زور دکھایا کہ اپنے سپاہیوں کو بھیجکے رزیڈنسی کا محاصرہ کر لیا۔ اور اسی نوعمر دعویدار سلطنت کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن اس تمام کارروائی سے رزیڈنٹ صاحب مطلق ہراسان نہوے اور اگرچہ خود اُنکی جان معرض خطر میں پڑ گئی تھی لیکن اُنھوں نے کچھ پروانہ کی اور اس لڑکے کو وارث تاج وتخت تسلیم کرنے سے قطعی انکار ہی کرتے رہے۔ انھوں نے فوراً چھاونی سے فوج طلب کی اور جب فوج آگئی تو حکم دیدیا کہ زیر کیا جائے۔ ایک ہی دو گراب کی باڑھ چلنے سے بلوائیوں کا مجمع منتشر اور پراگندہ ہو گیا۔ اور نصیر الدین حیدر کے ایک معمر چچا جنکے ساتھ بادشاہ ہمیشہ بہت بُرا برتاؤ کیا کرتے تھے سریر آرائے سلطنت ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ضعیفہ بیگم اور یہ نوعمر لڑکا ابھی تک لکھنؤ میں بقید حیات ہیں اس میں شک نہیں کہ انکی نیت بخیر تھی اور دوبارہ اپنی دھینگا دھینگی سے بزور شمشیر کامیاب ہو چکی تھیں۔ اگر بیگم صاحبہ کسی اور زمانے میں پیدا ہوئی ہوتیں اور گرد وپیش کے حالات ذرا تبدیل شدہ ہوتے تو یقینی اُنکے کارہائے نمایاں دنیا کی تاریخ میں بہت روشن حرفوں میں نظر آتے پھر بھی

اُنکی شجاعت اور پامردی پر صد آفریں کہنا چاہیئے۔ اور اسیطرح انگریزی رزیڈنٹ کرنل لو صاحب بھی مستحق تحسین و آفریں ہیں کہ اگر وہ استقلال اور عزیمت سے کام نہ لیتے تو معاملات بہت جلد دگرگوں ہوجاتے اور انجام بخیر نہوتا۔ کیونکہ اس میں کچھ شک و شبہہ نہیں کہ اُس ولدالحرام کی محرومی تخت و تاج سے اُتنے نتایج بد پیدا نہیں ہوے جتنے اُس حالت میں پیدا ہوتے جبکہ وہ فرمانروائے ملک ہوجاتا۔

لاحول ولا قوۃ۔ میں بھی کہاں سے کہاں جا پہونچا۔ زنانہ سپاہیوں کے بیان نے میرے قلم کو خوب لغزش دی کہ ایک اور ہی دُکھڑا چھڑ گیا۔

لکھنؤ کے حرم شاہی میں عورتوں کا ایک اور گروہ بھی قابل تذکرہ ہی۔ یہ کہاریوں کا گروہ ہی۔ ان کہاریوں کے ذمے یہ خدمت تھی کہ حرم شاہی کے اندر جب بادشاہ سلامت یا کوئی بیگم ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانے لگیں تو انکی پالکی یا اور جو بند سواری ہو اُسے اپنے کاندھونپر اُٹھا لیچلیں۔ ان کہاریوں کے قواعد بھی سپاہیانہ انداز سے ہوا کرتی تھی اور اُسی جماعت میں افسر ہر قسم کے یعنے متعہد و غیر متعہد ہوا کرتے تھے۔ نصیرالدین حیدر کے زمانے میں ان کہاریوں کی جمعدار یا افسر ایک مردانہ صورت قوی ہیکل کہاری تھی۔ یہ کہاری بادشاہ کی بڑی مُنہ لگی تھی اور بادشاہ سلامت اُس سے اکثر کھلّی کیا کرتے تھے۔ اور وہ اسطرح بادشاہ سے زبان لڑاتی اور شوخی و شنگی سے ترکی بہ ترکی جواب دیتی تھی کہ دیکھنے والے دنگ رہجاتے تھے۔ میں اُس بولی ٹھولی کو حوالہ قلم نہیں کرسکتا جو اس طرار عورت سے اور بادشاہ سے ہوتی تھی کیونکہ اُسکو سنکے ہر ایک مہذب آدمی کان میں اُنگلی دے لیگا۔ میں نے ولایت میں ایک معتبر صاحب سے جو اُس زمانہ میں لکھنؤ میں موجود تھے یہ بھی سنا ہی کہ اسی کہاری نے بادشاہ کے بعض اہل خاندان سے سازش کرکے بادشاہ کو زہر دیا تھا۔

بیگمات شاہی کی خدمت گزاری کے واسطے بہتیری پیش خدمتیں۔ مامائیں۔ اصیلیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ انہیں سے کچھ تو قدیمی خانہ زادیں ہوتی تھیں۔ اور کچھ غریب والدین سے بوجہ حُسن صورت یا سلیقہ و خدمتگزاری خرید لیجاتی تھیں۔ ان عورتوں کے سلیقہ اور حسن خدمت کا معیار صرف اچھا گانا اچھی داستان کہنا۔ یا اچھی طرح پاچپی کرنا ہوتا تھا۔

اسمیں شک نہیں کہ جسطرح پُرانے زمانے میں قسطنطنیہ کے ایوان شاہی کی روایتیں سنی گئی ہیں۔ اُسی طرح اودھ میں بھی بدوضع اور معتوب بیگمات شاہی بہت ہی چپ چپاتی دنیا سے دور دفان کردیجاتی تھیں اور یہ کام انھیں پیش خدمتوں یا خواجہ سراؤں کے ہاتھوں سر انجام پاتے تھے۔ ان لوگوں کے حالات مسز میر حسن علی[1] زیادہ بیان کرسکتی ہیں اور میں اُنھیں کی تقریر نقل کیے دیتا ہوں۔ اثنا میں خود

---

[1] دیکھو اُنکی کتاب مسلمانان ہند کی بابت بعض حالات۔ مسز میر حسن علی ایک انگریز بی بی تھیں۔ جنھوں نے لکھنؤ کے

بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ حالات صرف حرم شاہی تک محدود نہیں بلکہ لکھنؤ کے اکثر ذی مرتبہ خاندانوں کی حالت ایسی ہی کچھ ہے

وہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ان لونڈیونکو بیگمات کی ذاتی خدمتگزاری کی وجہ سے ہر وقت حاضر باش اور تعمیل ارشاد پر طیار رہنا پڑتا ہے لیکن اُنکے ساتھ سلوک بہت اچھا ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کا سامان آرام و آسایش اُن کے واسطے مہیا کیا جاتا ہے۔ باری بندھی ہوتی ہے اور معینہ اوقات پر ہر ایک اپنی باری سے اپنا کام کرتی اور خوش سلیقگی کے ساتھ اپنے مالک کے خدمات بجا لاتی ہے۔ اُنکی بیویاں انپر اُسیطرح مہر و محبت کی نظر رکھتی ہیں جیسے اور پیش خدمتوں اور خواصوں پر۔ اور اس غلامی کی حالت میں بھی انپر کسی طرح کی سختی و درشتی نہیں روا رکھی جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھیں لونڈیونکی کثرت یا قلت سے ہر گھر کی شان اور منزلت سمجھی جاتی ہے کیونکہ مسلمان سوسائٹی کی موجودہ حالت میں لونڈیاں امارت کے لوازم اور ریاست کی شان سمجھی جاتی ہیں۔ جو بیویاں نیک دل اور نیک مزاج ہوتی ہیں وہ اپنی لونڈیوں کی شادی بھی جب وہ سن تمیز کو پہونچ جاتی ہیں اُنکے مناسب حال لڑکے تلاش کرکے کر دیتی ہیں اور جب اُنسے اولاد ہوتی ہے تو اس اولاد کو بہت ہوشیاری و خبرداری کے ساتھ پالتی پرورش کرتی ہیں اور اکثر اوقات اُن کی دلجوئی کے واسطے بچونکے وظایف مقرر کر دیتی ہیں یا خود انھیں طوق غلامی سے گلو خلاص کر دیتی ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ جن لونڈیوں کے ساتھ مسلمان لوگ یہ یگانگت کے سلوک نہیں کرتے وہ یقیناً خود ہی بدراہ اور نکمے ہوتے ہونگے"۔ یہ کیفیت لونڈیونکی اچھی حالت کی تحریر کی ہے اب ذرا اُنکی بُری حالت کی ایک حکایت بھی سن لینا چاہیے۔ بیگم صاحبہ نے تو یہ حکایت اُسی معمولی سادگی کے ساتھ بیان کی ہے جو زنانہ مصنفین کا خاصہ ہے۔ لیکن اگر کوئی مرد اس صفائی و سادگی سے یہی داستان نقل کرتا تو نرم دل عورتوں پر رقت طاری ہو جاتی۔

وہ لکھتی ہیں کہ "میں نے سنا ہے کہ ایک معزز بیگم صاحبہ نے ایک نہایت حسین و خوبصورت لڑکی کو بچپنے سے پالا پرورش کیا تھا جب وہ جوان ہوئی تو صاحب خانہ کی منظور نظر ہو گئی۔ اگرچہ بیگم صاحبہ کو خطرے خیال ہی میں نہ لاتی تھی اور اُن تمام احسانات و مراعات کے عوض میں جو بچپنے سے بیگم صاحبہ نے اُسپر کیے تھے اُسنے بیگم صاحبہ کی چھاتی پر کودوں دلنا شروع کر دی۔ اگرچہ مجھے ٹھیک یہ نہیں معلوم کہ اس لونڈی نے بیگم صاحبہ کے ساتھ کس قسم کی محسن کشی اور ناسپاسگزاری کی مگر میں نے سنا ہے کہ بیگمصاحبہ نے ایک نمونہ عبرت قائم کرنے اور اپنی شان برقرار رکھنے کے خیال سے آخرکار لونڈی پر عتاب نازل فرمایا۔ کیونکہ ایسے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶۔ ایک نواب جو ولایت گئے تھے شادی کر لی اور اُنکے ہمراہ ہندوستان آئیں یہاں وہ بارہ برس تک رہیں اور اپنے شوہر کو تعدد ازدواج سے بچائے رہیں بوجہ ناسازی طبیعت وہ انگلستان واپس گئیں لیکن پھر وہاں سے نہ آئیں۔

گھر مین جہان صدہا لونڈیاں۔ پیش خدمتیں۔ مامائیں۔ اصیلیں۔ ملازم تھیں یہ بات ضروری تھی کہ اُسکو کوئی ایسی تعزیر دیجاتی جس سے دوسروں پر رعب جم جاتا اور ہر ایک اپنے مرتبے کو پہچان کر حد سے بڑھنے کی جرأت نہ کرسکتی۔ لہذا انھوں نے چاندی کی ایک موٹی زنجیر بنوائی اور یہ حکم دیدیا کہ دن مین چند گھنٹوں کیواسطے اسی زنجیر سے باندھکر پلنگ پر ڈال دیجایا کرے۔ تاکہ سب لوگ دیکھیں اور عبرت پکڑین پلنگ پر پڑا رہنا تو ہرگز کوئی سزا نہ تھی کیونکہ یہ تو خدا سے چاہتی تھی۔ مگر زنجیر میں جکڑے ہوے بیدست و پائی کے ساتھ سزا یافتہ اور مجرم کی صورت سے پڑا ہونا اور ہمچشموں کے واسطے طعن و تشنیع کا موقع پیدا ہونا البتہ یہ ایسی ترکیب تھی جس سے بہت جلد اُسکا نشہ اترگیا"۔

میم صاحبہ نے پھر بھی تصویر کا نہایت روشن رخ ناظرین کو دکھایا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی کا پہلو انکی نظر سے گزرا ہی نہیں۔ ایسی حالت میں کہ لونڈی نہ اسقدر بچپنے سے گھر میں پالی گئی ہو نہ کچھ ایسی خوبصورت اور طرحدار ہو کہ صاحب خانہ کا دل تیر نگاہ سے دوسار کرے بلکہ برخلاف اسکے کسیقدر کریہ منظر اور بدصورت ہو ہرگز صاحب خانہ کو اسکی پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ اُس پر کس قسم کی اور کس حد تک سزائیں سختی کیجاتی ہے۔ اور ایسی فرشتہ خصلت بیویاں بھی بہت شاذ ہیں کہ جو عتاب و عقاب مین اتنی نرم دلی صرف کرین کہ باندھیں بھی تو چاندی کی زنجیر سے۔ کچھ شک نہیں کہ بعض اوقات رشک و حسد کا جب شعلہ بھڑکتا ہے تو ظلم و تعدی کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور اُسوقت اگرچہ کسی میں حسن صورت بھی اُس درجے کا موجود ہو جسکا ذکر میم صاحبہ نے اپنی داستان میں بیان کیا ہے لیکن اُسکی سفارش پر بھی رحم نہیں آتا۔ پھر جو بیویاں قدرتی طور سے تیز مزاج اور تند خو ہوتی ہیں انکو تو ادنیٰ سے اشتعال طبع پر سخت سے سخت ظلم کرنے میں کچھ باک نہیں ہوتا۔ اور ان حالتوں میں جو کچھ سختیاں اور کلفتیں لونڈیوں کو جھیلنا پڑتی ہیں وہ ناگفتہ بہ ہیں مثلاً ابھی آٹھ ہی برس کا زمانہ ہوا کہ سارے کلکتے میں ایک مسلمان رئیسہ کے مظالم کی داستانوں سے عجب طرح کا جوش نفرت و حقارت پیدا ہو گیا تھا اور ہر طرف سے صدائے نفریں بلند ہو گئی تھی جسکی اصلیت یہ تھی کہ ان بیوی صاحبہ کی ایک لونڈی نے اُنکی مرضی کے موافق گل[1] سے اُنکا حقہ اچھی طرح نہیں بھرا تھا۔ اُنھوں نے بار بار سمجھایا مگر وہ اپنی حرکت سے باز نہ آئی بالآخر بیوی صاحبہ کو غصہ چڑھ آیا اُنھوں نے اور لونڈیوں باندیوں کی مدد سے اس معتوب لونڈی کو زمین پر پچھاڑ کے تمام جسم پر جلتے جلتے گلوں کی اتنی بارش کی کہ سارا بدن داغدار ہو گیا۔ جس سے اُس غریب کی یہ نوبت ہو گئی کہ

---

[1] بہار و بنگال میں کوئلے کو پیسکر اور چاول کی پیچھ ملاکر ٹکیاں بنالیتے ہیں اور تمباکو پر اُسی کی آگ رکھتے ہیں ان ٹکیوں کو گل کہتے ہیں۔

خود اُسکی ساتھ والیوں کو اُسپر ترس آنے لگا۔ اور انجام یہ ہوا کہ اسی صدمہ سے بعد چندے وہ دنیا سے چل بسی۔ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو ہوئی۔ مقدمے کی تحقیقات ہوئی۔ اور بیوی صاحبہ کو قید دوام بعبور دریائے شور کی سزا دیگئی۔ اگرچہ دوران تحقیقات میں بیوی صاحبہ پردہ نشیں بنی رہیں۔ لیکن حکم سزا صادر ہونیکے بعد اُنکو بے نقاب ہونا پڑا اور اُسوقت جو نامہ نگاران اخبارات موجود تھے وہ اُنکا حسن وجمال دیکھکے دنگ رہگئے کہ کسطرح لفظوں میں اس صورت کی تصویر اُتاریں حسن ہی ایسا عالم فریب تھا۔

بیشک میں خود اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ باوجودیکہ میں ایک عرصے تک امرائے لکھنؤ سے ملا جلا رہا مگر میں نے اپنے پورے زمانہ قیام لکھنؤ میں کبھی لونڈیوں کے ساتھ ایسے ظلم وبدعت کی کوئی داستان نہیں سنی۔ البتہ لکھنؤ میں سونٹے مارنے یا اور کسی طرح کی ذلت دینے کی سزا لونڈی غلام دونوں کے واسطے رائج تھی۔ لیکن اُن مظالم کی کہیں چھاؤں بھی نہ تھی۔ جو (اگر مسٹر اسٹو کے بیانات صحیح ہیں تو) امریکہ میں رائج تھے۔

خواہ اسوجہ سے کہ مجھے بالذات خواجہ سراؤں سے بہت نفرت تھی یا اسوجہ سے کہ میں نے اُنکی بابت جو روایتیں حکایتیں سنی تھیں اُنسے میرے دل میں کچھ تعصب پیدا ہوگیا تھا بہرحال کسی وجہ سے مجھے اُسوقت کہ جب میں لکھنؤ میں تھا اور اب بھی اسبات کا پورا یقین ہو کہ حرم شاہی میں اکثر مظالم کے بانی مبانی یہی کمبخت خواجہ سرا ہوتے تھے۔ انھیں کے ہاتھوں عورتیں سزا پاتی تھیں اور یہی لوگ اس طرح بہانے دلکے پھپھولے توڑتے اور حوصلہ نکالتے تھے۔ کیونکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو اس جلادی کی خدمت میں کچھ بڑا مزا ملتا ہو۔

لونڈیوں کیطرح خواجہ سرا بھی اکثر مسلمان امرائے لکھنؤ کے محلات میں ہوتے تھے۔ اور حرم سرائے شاہی میں تو کم از کم ڈیڑھ سو خواجہ سرا تھے۔ ان سب کا افسر بادشاہ بیگم صاحبہ (جو دہلی کی شہزادی تھیں) کی ڈیوڑھی پر متعین رہتا تھا اور ملک اودھ میں یہ شخص بھی بڑے پایہ کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ ان خواجہ سراؤں کی اصل یہ ہو کہ بعض لوگ اُنکو بچپنے ہی میں چرا لاتے ہیں اور اُنکو امرائے دولت کے ہاتھوں بیچ ڈالتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے خداوندان نعمت کے مزاج میں بڑا درخور پیدا کر لیتے ہیں اور مشیر ومعتمد علیہ ہو جاتے ہیں۔ مسز حسن علی لکھتی ہیں کہ "ان لوگوں کو خاص حقوق حاصل ہوتے ہیں اور بہ نسبت دیگر ملازمین کے اُنکے ساتھ مخصوص طور کی مراعات کیجاتی ہیں۔ اور ان لوگوں کو ہر وقت اور ہر حالت میں زنانخانے میں داخل ہونیکی عام اجازت ہوتی ہو۔ حرم سرائے شاہی میں بیگمات کے کھلانے کی خدمت

یہ لوگ عورتوں سے بھی زیادہ اچھی طرح انجام دیتے ہیں"۔

سلطنت اودھ میں اکثر خواجہ سرا خدمات جلیلہ پر ممتاز رہے ہیں۔ اور اُنھوں نے محاصل ملک کی تحصیل وصول اور اہم امورات سلطنت کے انصرام اور پیچیدہ مراسلات و معاملات کا باحسن وجوہ سرانجام کیا ہی چنانچہ بشپ ہبر صاحب انھیں خواجہ سراؤں میں سے ایک کی نسبت لکھتے ہیں کہ ایکبار بادشاہ وقت اُسکے مکان پر تشریف لیگئے تو اُسنے دس لاکھ روپے کا ایک تخت بنوایا اور بادشاہ کو اُسپر بٹھایا اور پھر وہی تخت پیشکش کر دیا۔

شرع محمدی کی رو سے غلام بالکلیہ آقا کی ملک ہی۔ اور جو مال و متاع وہ فراہم کرے وہ بھی آقا ہی کی ملک ہی۔ اسی اصول پر خواجہ سرا لوگ اپنی زندگی میں جو کچھ دولت جمع کرتے ہیں وہ اُن کے مرنے پر اُنکے خداوندان نعمت کو مل جاتی ہی۔ چنانچہ یہی قصہ ہی کہ خواجہ سراؤں اور لونڈی غلاموں پر بے انتہا زر پاشی ہوتی ہی اور اُنکے گھروں میں نفائس جواہرات اور ملبوسات گرانبہا کے ڈھیر لگا دیے جاتے ہیں کیونکہ آقاے ولی نعمت یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ تو ایک امانت رکھائی جاتی ہی۔ کہ جو ایک مدت کے واسطے ایک شخص کے پاس رہیگی۔ اُسکے بعد اُسکا کوئی والی وارث تو بجز ہمارے ہے نہیں ہمیں کو پھر واپس مل جائیگی۔ اسکو تو یہ بھی قانونی اختیار نہیں کہ کسی کو ہبہ کر سکے۔ میں نے سنا ہی کہ ایک مرتبہ یہ اتفاق پیش آیا کہ ایک امیر کبیر خواجہ سرا نے نظامت یا چکلہ داری کی حالت میں بہت بڑی املاک پیدا کی اور مرتے وقت کچھ لوگوں کے نام ساری جائداد کا وصیت نامہ بھی کر دیا۔ جب وہ مر گیا تو ان ورثا نے بے تامل سارے اثاثے پر قبض و تصرف شروع کر دیا۔ لیکن جیسے ہی اسکا پرچہ بادشاہ کے حضور میں گزرا وہاں سے فوراً حکم ہوا کہ یہ سب تو نزول سرکار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ بجز بادشاہ کے اور کسی کو اس جائداد پر کوئی حق ہی نہیں پہونچتا فوجیں بھیجی گئیں کہ جاکے زبردستی قبضہ کریں۔ لیکن ورثا [illegible] نے اُسنے پورا مقابلہ کیا اور بڑی بہادری سے لڑے۔ آخرکار بڑی جدال و قتال کے بعد یہ نوبت پہونچی کہ بادشاہی قبضہ جائداد پر ہوا۔ پھر تھوڑی سختی کرنے سے وہ سب دفینے اور خزانے بھی معلوم ہوگئے جو [illegible] دنیا سے بچ رہے تھے۔ اور اس ساری کارروائی میں قانون کی متابعت حرفاً حرفاً کی گئی [illegible] وارثوں کو ایک حبہ نہ دیا گیا اور جو کچھ نقد و جنس تھا سب داخل خزانہ سلطنت ہو گیا۔

ملہ جو دینے والے ہوتے ہیں وہ سیر چشمی۔ سخاوت۔ دریادلی کے جوش میں دیتے ہیں۔ اُنکو زر پرستی کی کمینہ منطق ملحوظ نہیں ہوتی۔ مترجم

فی الحقیقت باشندگان اودھ اس قسم کے مناقشات و مشاجرات کے ایسے خوگر ہو گئے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات مین جدال و قتال کر بیٹھنا گویا مرغوب طبع ہو گیا ہی۔ خیر۔ اس سے اتنا تو فائدہ ہوتا ہوگا کہ ہتھیاروں میں زنگ نہ لگنے پاتا ہوگا۔

مین نے حرم سلطانی کے بیرونی لوازم اور سامان یعنے لونڈیوں۔ غلاموں۔ اور خواجہ سراون کے حالات بیان کرنے مین بہت وقت صرف کیا اب پردہ اُٹھا کر ذرا اندر کی بھی سیر کرنا چاہیے۔ امید تو ہی کہ بہت سی لیڈیاں میرے ساتھ چلیں گی۔

محلات شاہی کے زنانہ مکانات بلحاظ تعمیر مردانے مکانات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں نہ اُنکے طرز میں بہت بڑا فرق ہی۔ معمولی طور پر ہندوستانی محلسرا قریب قریب اس قطع کی ہوتی ہی کہ ایک مربع عمارت ہوتی ہی جسکے چارون طرف مربع یا مستطیل دالان ہوتے ہیں۔ آگے غلام گردش ہوتی ہی۔ غلام گردش کے سامنے چبوترہ۔ چبوترے کے نیچے صحن۔ اگر مکان دو منزلہ ہوتا ہی تو باہر کیطرف اوپر کے درجوں میں برآمدے نکالدیے جاتے ہیں۔ اور چارون طرف چھتو پر عمارتیں بنادی جاتی ہیں جن مین کشادہ کمرے ہوتے ہین۔ نیچے کے مکانات عموماً صحن سے دو تین زینے اوپر بلند ہوتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے دالان ہوتے ہین جنکے پہلوؤں مین کوٹھریاں صحنچیاں ہوتی ہیں۔ کوٹھریوں میں کواڑ لگے ہوتے ہیں اور اُنھیں میں اثاث البیت۔ کپڑے۔ زیور۔ اور قیمتی اشیا جو روزمرہ کے کام نہیں آتیں رکھی جاتی ہیں۔ اگرچہ یورپ میں لوگ تعجب کرینگے مگر ان دالانون میں کواڑ نہیں ہوتے صرف دروں میں پردے پڑے ہوتے ہیں یا اوٹیں رکھدیجاتی ہیں۔ اور یہی وجہ تسمیہ ہے ہندستانی عورات کے پردہ نشین کہلانے کی۔ یعنے یہ لوگ عام نگاہوں سے پوشیدہ اور خلوت گزین رہتی ہیں۔ اور بجز قریب رشتہ دارون کے کوئی نامحرم اُنھیں دیکھ بھی نہیں سکتا۔ چنانچہ جب یہ عورتیں کسی سواری میں باہر نکلتی بھی ہیں تب بھی پردے کے اندر رہتی ہیں اور ایسا سنگین پردہ ہوتا ہی کہ اندر سے کوئی شے باہر کی نظر نہیں آسکتی۔ یہ پردہ صرف مردوں سے کیا جاتا ہی۔ عورتیں چاہے کسی قوم و ملت کی ہوں بے روک ٹوک خلط ملط کرسکتی ہیں۔ ان پردہ نشینون کو جب کبھی کمپنی کی کسی عدالت میں بحیثیت فریق مقدمہ یا گواہ بنکے آنے کا اتفاق ہوتا ہی تب بھی عدالت کے کمرے میں اپنی پالکی کے اندر بیٹھے وہ آتی ہیں۔ البتہ ایسی صورت میں اُنکا کوئی ملازم خاص یا قریبی عزیز آکے شناخت اور تصدیق کردیتا ہی اور وہ پردے کی آڑ سے جو کچھ کہنا ہوتا ہی کہتی ہیں جج یا مجسٹریٹ۔ ملزم یا مستغیث کوئی اُنھیں دیکھ نہیں سکتا ہر سوال کا جواب پردے کے اندر سے آتا ہی۔ آواز باہر نکلتی ہی مگر جس منھ سے آواز نکلتی ہی وہ نظروں سے پوشیدہ

ہی رہتا ہی۔ اگرچہ ادلے شہادت کا یہ طریقہ ایسا ہی جس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن اس معاملے میں گورنمنٹ ہند ہرگز قابل الزام نہیں کیونکہ بلحاظ مراسم و معاشرت اہل ہند پر وہ ایک لازمی قانون ہی جسکی خلاف ورزی ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ ملکی خصوصیات میں دست اندازی کسی نہج سے قرین مصلحت نہیں۔

گرمی کے موسم میں حرم کی عورتیں اکثر صحن میں نشست رکھتی ہیں۔ اور وہیں صحبت جمتی ہی۔ صحن میں ایک شبنمی تان دیجاتی ہی اور اُسکے نیچے فرش بچھا ہوتا ہی۔ محل کی خاتون بیچ میں تخت یا مسند پر بیٹھتی ہی اور جو کوئی اُس سے ملنے آتی ہی وہیں سلام کو حاضر ہوتی ہی۔ یہ خاتون صرف اپنے سے معمر اور سن رسیدہ یا زیادہ ذی مرتبہ عورت کی آمد پر یا کسی مرد رشتہ دار کو آتے دیکھکے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہی۔ کیونکہ مردذات کی افسری کی اصلی شان و شوکت صرف بلاد مشرقی ہی میں نظر آتی ہی۔ اور انھیں ممالک میں وہ افسر اور حاکم وقت سب کچھ معلوم ہوتا ہی۔ عورتیں بھی اُسے طبقۂ اعلیٰ کی مخلوق سمجھتی ہیں اور اُسکی باتوں کو اس طرح کان دھر کے سنتی ہیں جیسے ولایت میں لڑکے اپنی گردن جھکا کے اپنے ماں باپ کے احکام سنتے ہیں۔ اُنکے ہر قول و فعل کو واجب العمل اور قابل تقلید جانتے ہیں اور اُن کے تمام خیالات اور باتوں کو عقل و نقل سے درست اور لغزش و خطا سے پاک سمجھتے ہیں۔ غالبًا میری اس تحریر کو پڑھ کے ایک انگریزی عورت بے تامل کہہ اُٹھیگی کہ "یہ بالکل غیر ممکن ہی" اور "یہ عورتیں مرد کو فریب دیتی ہونگی۔ اور بظاہر اطاعت و انقیاد دکھانیکو ساری کارروائیاں کرتی ہوں گی" لیکن میں اُن سے صرف اسی قدر کہونگا کہ ذرا تھوڑی دیر کے واسطے تم یہ فرض کرلو کہ تمنے ایسے لوگوں میں پیدا ہوکے پرورش اور تعلیم پائی ہو کہ جنکے ہاں لڑکی پیدا ہوتی ہی تو سب لوگ منہ تھوتھا لیتے اور بدقسمتی سمجھتے ہیں اور لڑکا پیدا ہوتا ہی تو ہر شخص کی باچھیں کھلجاتی ہیں۔ مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوتا اور خوش نصیبی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور پھر اس بات پر غور کرو کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ صحیح ہو سکتا ہے یا نہیں۔ بیشک وہ اس کی صحت کو تسلیم کرے گی اگرچہ اس حالت کو قابل افسوس سمجھیگی۔

یہ عورتیں جو ہمارے نزدیک نہایت قناعت سے بسر کرنے والی۔ خوش مزاجی سے زندگی کے دن کاٹنے والے قیدیوں سے زیادہ نہیں ہوتیں فطرت اور آفرینش کے تمام دلربا مناظر سے بالکل نابینا ہوتی ہیں۔ اُن کو کبھی دریاؤں اور کہساروں کی چھاؤں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اُن کی نگاہیں باغ و بوستاں اور لہلہاتے مرغزاروں کی سیر سے کبھی آشنا نہیں ہوتیں وہ کھلے میدانوں کی تازی ہوا ہرے بھرے کھیتوں کی نظر فریب بہار کی لذت نہیں جانتیں۔

ایک یوربین[1] لیڈی کا بیان ہو کہ اُس نے انھیں سے اکثر کی زبان سے بیساختہ یہ جملے نکلتے سنے ہیں کہ "کیوں جی۔ یہ کیسے پیارے پھول ہیں۔ میں کہتی ہوں جس جگہ ان پھولوں کے چمن کے چمن کھلے ہونگے وہاں کیسی کچھ بہار ہوتی ہوگی"۔ انھیں لیڈی صاحبہ کا یہ بھی بیان ہو کہ اکثروں نے اُنسے بڑی حیرت و استعجاب سے یہ سوال کیے کہ "کیوں صاحب یہ تو بتائیے یہ پھول اُگتے کیونکر ہیں اور جب درخت میں ہوتے ہیں تو کیسے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

جب محل کی خاتون اپنی ملاقاتیوں سے دالان کے اندر ملتی ہو تو بیچ کے در میں ایک ستون سے ملا کے اُسکا گاؤ رکھ دیا جاتا ہو۔ اور اُسکے نیچے مسند بچھا دیا جاتا ہو۔ اُسی پر وہ بیٹھتی ہو۔ اس مسند پر اسکے سوا اور کوئی نہیں بیٹھ سکتا مسند عموماً مخمل یا ریشمی کپڑے کا ہوتا ہو۔ جسپر زردوزی کام ہوتا ہو یا کمخواب زربفت کا۔ اور اُسکے نیچے ایک نفیس قالین بچھا دیا جاتا ہو۔ جو قریب دو گز مربع کے ہوتا ہو۔ اسی مسند اور قالین کی حیثیت سے صاحب خانہ کے مرتبہ و شان کا اندازہ کیا جاتا ہو۔ چنانچہ حرم شاہی میں عموماً مسند زربفت کی ہوتی تھی اور اُسکے گرد بھاری کلابتونی جھالر ٹنکی ہوتی تھی۔ مسند پر دو چھوٹی تکنیاں بھی دونوں پہلوؤں میں رکھ دیجاتی ہیں تاکہ زانو توڑ کے بیٹھنے میں یہ تکنیاں زانو کے نیچے رہیں۔

اگر کوئی صاحب خانہ اپنے کسی مہمان عورت کو اپنی مسند پر بٹھا لیتی ہو تو اس سے یہی سمجھا جاتا ہو کہ یا تو یہ عورت مرتبے میں اُس کے مساوی ہو یا یہ کہ میزبان نے غایت درجہ اخلاق و تواضع کا برتاؤ کیا ہو۔ اور اگر مہمان میزبان سے مرتبے میں بہت بلند ہوتی ہو تو میزبان بالکل گاؤ سے علحدہ ہو کے مہمان کو اُسپر بٹھا دیتی ہو۔ اور آپ گوشۂ مسند پر بیٹھ جاتی ہو۔ کیونکہ درانحالیکہ قالین تک کسی کو جگہ دیدینا اُسکے واسطے باعث اعزاز و افتخار ہو تو مسند چھوڑ دینا تو بہت ہی بڑے اعزاز و تکریم کی علامت ہونا چاہیے۔

اگرچہ ہندوستانی زنانخانوں میں شیشہ آلات کا رواج عام نہیں ہو لیکن حرم شاہی میں بڑے بڑے جھاڑ فانوس بکثرت تھے۔ یہ ایجاد صرف نصیر الدین حیدر نے کی تھی ورنہ اُنکے والد غازی الدین حیدر نے اگرچہ اپنے مکانات کی سجاوٹ کا بہت کچھ سامان کیا تھا اور انکو ان چیزونکا شوق بھی بہت تھا لیکن اُنھوں نے جھاڑ کنول صرف امام باڑے اور اپنے رہنے کے مکانات ہی تک مخصوص رکھے تھے۔

---

[1] مسز میر حسن علی کی کتاب جلد اول صفحہ ۳۳۳

بادشاہ کے جتنے محل تھے سب کی ڈیوڑھیاں الگ الگ تھیں۔ اور ہر ایک محل میں ملاقات کے کمرے (خلوت خانہ) دالان اور مسندیں علیحدہ علیحدہ تھیں۔ باوجودیکہ ان محلات میں اکثر ایسے تھے جنکو بادشاہ سلامت کی زیارت مہینے میں ایکبار بھی نصیب نہوتی تھی لیکن پھر بھی بادشاہ کی محل تو ضرور ہی تھیں اور مجھے بہت تحقیق معلوم ہوا ہی کہ اگرچہ اُنکو اس بات کا یقین بھی ہوجاتا تھا کہ اُنکی بعض خواصوں پر بادشاہ کی نظر ہی اور بادشاہ اُنسے اختلاط کرتے ہیں لیکن اُنکو اسپر مطلق اعتنا نہوتی تھی۔ چاہے خواص کتنی ہی منھ لگی ہوجائے اور بیگم صاحبہ کتنی ہی نگاہ سے گر جائیں پھر بھی جب تک حرم میں دونوں رہتی تھیں، خواص خواص ہی سمجھی جاتی تھی اور بیگم بیگم ہی۔ اور اس بارے میں خود بادشاہ سلامت نے بھی کبھی دست اندازی نہیں کی نہ تبدیل مراتب کا کچھ خیال کیا۔

اعلیٰ درجے کی بیگمات شاہی کے لباس دیکھنے کا کبھی مجھے [illegible] موقع ملا۔ صرف اُنھیں عورتوں کا لباس نہیں جو روزانہ خاصے کیوقت حاضر باش رہتی تھیں۔ اگرچہ یہ عورتیں بھی نہایت حسین اور طرحدار ہوتی تھیں۔ شباب میں بھری ہوئی اور اعلیٰ درجے کی پوشاکوں سے ملبس بنی ہوئی اور اُنکی بابت یہ حکم تھا کہ کوئی نظر بھر کے انکی طرف نہ دیکھے کیونکہ بادشاہ کے نزدیک وہ بھی پردہ نشینوں ہی میں شمار کیجاتی تھیں اور اُنکی طرف ٹکٹکی لگانا اور برابر دیکھے جانا داخل گستاخی و بدتمیزی تھا۔ مگر پھر بھی ہم لوگ اُنکو دیکھ سکتے تھے۔ اور دیکھتے ہی تھے بلکہ ہمکو خاص بیگمات کے پہناوے دیکھنے کا بھی اتفاق اکثر ہوا۔ کیونکہ بادشاہ سلامت کا یہ معمولی مذاق تھا کہ اکثر اوقات جب حمام سے برآمد ہوتے تو اس زمانے میں جن بیگم صاحبہ پر نظرِ عنایت ہوتی اُن سے لباس تبدیل کر لیتے۔ اپنا ملبوس اُنھیں پہناتے ہیں اور انکی پوشاک آپ پہنتے۔ اور وہی پوشاک پہنے ہوئے باہر ہملوگوں کے سامنے نکل آتے بعض دفعہ یہ بھی اتفاق ہوا کہ رات کے وقت وہ اکثر اُس گاچ کے پردے کے اندر چلے جاتے جو کھانے کے کمرے کے ایک سرے پر پڑا ہوا تھا۔ جسکا ذکر میں کر چکا ہوں اور وہاں سے بیگم بنے ہوئے برآمد ہوتے۔

ممکن ہی کہ جو لباس وہ پہنکے آتے ہوں اُسکا ساز و سامان کچھ مختلف اور اُسکے پہننے کا انداز بھی اور ہوتا ہو لیکن کپڑے سب وہی ہوتے تھے اور جب بادشاہ پہنتے تھے تو بالکل بیگم ہی معلوم ہوتے تھے۔ اس لباس میں پائجامہ ساٹن کمخواب یا کسی اور نفیس ریشمی کپڑے کا ہوتا۔ کمر کو نہیں پھنسا پھنسا لیکن نیچے پہونچکے خوب پھیلا ہوا۔ بڑے بڑے پائچے ڈھیر کے ڈھیر کبھی آگے زمین پر

پڑے ہوئے کبھی اُنمیں گرہ لگی ہوئی - کبھی ٹانگوں کے پیچھے دور تک فرش کو زیب دیتے ہوئے کبھی کمر میں کھونسے ہوئے اور اُنپر روپہلی سنہری پٹیاں لگی ہوئی - سامنے کی طرف زرتار ازاربند لٹکتا - اُسکے پھندنے زانو پر پڑے ہوئے - جگہ جگہ پر کمربندوں میں جواہرات اور موتی ٹنکے ہوئے ان پائجاموں کا کمر پر چست اور پنڈلی سے کسا کونوں میں بالکل پھنسا پھنسا ہوتا اور آگے تبدریج پھیلتے جانا عجب قہر ڈھاتا تھا سینے پر محرم یا سینہ بند اکثر کسی نازک ہلکے کپڑے کی ہوتی تھی - جیسے جالی - کامچ یا باریک ململ کی محرم سے سینے کا اُبھار پوری طرح سے نظر آتا تھا - کیونکہ جسقدر زیادہ باریک کپڑے کی بنائی جاتی تھی اتنی ہی نفاست مذاق ظاہر ہوتی تھی - یہی پوشش عام ہندوستانی عورات کی ہے - اسکی سلائی اور قطع برید اور سجاوٹ میں بڑی دستکاری صرف کیجاتی ہے اُسکے گرد گردن سے لیکر نیچے تک اور کٹوریوں میں بیل بوٹ سلمے ستارے کا نہایت نازک کام بنا ہوتا تھا - محرم پر ایک کرتی کمر تک ہوتی تھی - یہ اکثر جالی کی ہوتی تھی - اگرچہ کرتی اوپر سے پہنی جاتی تھی لیکن اس سے محرم کا جوبن - زیورات کی آب و تاب دمنیغہ اور پیٹی کا حسن ہرگز چھپ نہ سکتا تھا - سب چیزیں ہو بہو نظر آتی تھیں اور اُنپر کرتی کا زرق برق مصالحہ اور بھی روپ دکھاتا تھا - اس پوشاک پر ایک ہلکا سا دوپٹہ بھی اوڑھا جاتا تھا - دوپٹے اکثر سنہری روپہلی بادلہ کے ہوتے تھے ململ میں انگریزی پلنگ کی چادر کے برابر عرض میں اُس سے کم - ڈھاکے کی ململ کے بھی دوپٹے بنتے ہیں لیکن اُنپر بہت بھاری کامدانی کڑھی ہوتی ہے - اور پھر نہایت بھاری بھاری آنچل پلو بھی اُنپر چڑھائے جاتے ہیں - یہ دوپٹہ سر پر پیچھے کی طرف پڑا ہوتا ہے - اور دونوں شانوں پر اُنکے آنچل لپیٹے جاتے ہیں - اُسکے اوڑھنے کی وضع ایسی پیاری ہوتی ہے کہ بدصورت سے بدصورت عورت بھی اوڑھ لیتی ہے تو پری معلوم ہوتی ہے - چہ جائیکہ جو عورت خود ہی پریجمال ہو - اُسکے حسن میں تو اور چار چاند لگ جاتے ہیں - کھڑے ہونیکی حالت میں اُسکے اوڑھنے کی یہ ادا ہوتی ہے کہ ایک طرف آنچل لیکے اوپر کا جسم چھپاتا ہے اور پھر دوسری آنچل دوہرا کے شانے پر ڈالدیا جاتا ہے لیکن بیٹھنے کے وقت دونوں پلے زمین پر یا گود میں سمیٹ کے رکھ لیتے ہیں - کبھی کبھی اُسی حالت میں دوپٹہ شانوں سے اُتر بھی جاتا ہے - لیکن گھر کی بڑی بوڑھیاں اس ادا کو ہمیشہ ناپسند کرتی ہیں - بلکہ اسے بدوضع اور بازاری عورتوں کی وضع سمجھتی ہیں اور منع کرتی ہیں چنانچہ یہ وضع عام طور سے مرغوب و پسندیدہ نہیں ہے -

اب ذرا اپنے متخیلہ میں ایک ایسی عورت کا نقشہ جمائیے - جسکا بوٹا سا قد ہو - کھلتا ہوا

گیہواں رنگ ہے۔ ہاتھ کی ہتیلیاں۔ اُنگلیوں کے پورا اور ناخن سب مہندی کے رنگ سے گلنار ہیں۔ نوکدار جوتہ پہنے ہوئے ہے۔ آنکھیں ایک تو یونہی شرمیلی نشیلی ہیں اُسپر سرمگین ہوکے اور بھی نرگس جادو ننگی ہیں۔ ابرو کے بال اس احتیاط سے برابر جمائے گئے ہیں کہیں اونچا نیچا معلوم نہیں ہوتا۔ پورے قوس کی شکل بنی ہوئی کڑی کمان کی طرح تنی ہوئی۔ چکنی چکنی بلند پیشانی اور کتابی چہرے پر کالے بالوں کی لٹیں چنبیلی کے عطر میں مہکتی ہوئی کچھ تو سامنے پڑی ہیں اور باقی جو موباف کے پیچوں میں آگئی ہیں وہ چوٹی بنکے پشت پر لہرا رہی ہیں۔ کانوں کے کنارے چھوٹی چھوٹی مرصع بالیاں طرح طرح کی لٹک رہی ہیں ناک میں بڑی سی نتھ ہے۔ جس میں دو چمکدار موتیوں کے بیچ میں ایک یاقوت پڑا ہے۔ خیال کرو کہ اس شکل وصورت کی عورت اس سج دھج اور بناؤ سنگار کے ساتھ نہایت زیب ناز وکرشمہ کے انداز سے اوپر کا جسم باریک دوپٹے سے نیم وا اور نیچے کا جسم ایک زرق برق رنگین جامے سے پنہاں کیے ہوئے تمھارے سامنے کھڑی ہے اب تمھاری تخئیل کامل ہے تو یقیناً دربار اودھ کی ایک بیگم کا نقشہ تمھاری نظروں کے سامنے پھر جائیگا۔

لکھنؤ میں جلوس کے ساتھ بیگمات کی سواریاں آئے دن نہیں نکلا کرتی تھیں۔ ہاں البتہ جب کسی متبرک مقام کی زیارت کرنا یا کسی بیگم کو اولاد کی تمنا میں کسی ایسی مسجد میں جاکے منت ماننا ہوتی تھی جو شہر سے فاصلے پر ہوتی تھی تو اسوقت سواری کا تزک و احتشام قابل دید ہوتا تھا۔ بیگمات شاہی کے جلوس میں کچھ باہمہ گر مابہ الامتیاز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ سب کا جلوس یکساں ہوتا تھا۔ البتہ بادشاہ بیگم کے واسطے نوبت ونقارہ ماہی مراتب۔ چتر زرنگار اور سایہ بان جسے آفتابہ کہتے تھے مخصوص تھا۔

اچھا اب ذرا بادشاہ بیگم صاحبہ کی سواری کا تزک و احتشام دیکھنا چاہیے کہ وہ درگاہ جاتی تھیں تو کس شان سے جاتی تھیں۔ اُنکی سواری کے آگے سب سے پہلے بادشاہی باڈی گارڈ کے کچھ سوار جنکی نیلی رنگ کی وردیوں پر روپہلا کام زردوزی بنا ہوا تھا۔ جھنڈیاں ہوا میں اُڑاتے بینڈ باجہ بجاتے نکلتے تھے۔ اُنکے بعد دو پلٹنیں پیدلوں کی یہ بھی جھنڈی اور باجے کے ساتھ۔ اُنکے بعد بلم برداروں کی ایک کمپنی جنکی وردیاں سفید اور بلم بھی چاندی کے ہوتے تھے اور جو پیدل پلٹنوں کی ارغوانی رنگ کی وردیوں کے مقابلے میں بہت ہی خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ انکے بعد کچھ لوگ سفید لباس پہنے۔ نقرئی جھنڈیاں ہاتھوں میں لیے نکلتے تھے انکی

جھنڈیاں تکونی (مثلث) ہوتی تھیں اور انپر سلطنت اودھ کا شاہی معرکہ کڑھا ہوتا تھا۔ ان جھنڈیوں بردارونکے بعد ہی ایک بند سواری نکلتی تھی جسمیں بادشاہ بیگم صاحبہ ہوتی تھیں۔ یہ سواری ایک بڑے صندوق کے قطع کی ہوتی تھی۔ جسپر چاندی منڈھی ہوتی تھی اور اوپر سے ایک مغرق پوشش بھی پڑی ہوئی تھی۔ اور بیس کہار اُسکو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوتے تھے۔ جو چہارم حصہ میل کے فاصلے پر بدلتے رہتے تھے۔ یہ کہار سفید چست لباس پہنے ہوتے تھے۔ اور اوپر سے ڈھیلی ڈھیلی قبائیں گلنار رنگ اور زرکار چوبی کام کی۔ اُنکی سُرخ سُرخ پگڑیوں میں سنہری روپہلی مچھلیاں ٹنکی ہوتی تھیں اور ان مچھلیوں میں طلائی زنجیریں اور پھندنے پڑے ہوتے تھے جو شانے تک لٹکتے تھے۔ کہاروں کے پیچھے مہریاں ہوتی تھیں۔ جن کی خدمت اسی قدر تھی کہ کہاروں سے ڈولا لیکر درگاہ کے اندر پہونچادیں۔ انکے پیچھے ایک جم غفیر طلائی اور نقرئی عصا برداروں چوبداروں کا ہوتا تھا۔ یہ لوگ بیگم صاحبہ کے نام اور خطاب کا کڑکا بولتے چلتے تھے اور یہی لوگ فقیر فقرا کو سواری کے قریب آنے سے روکتے رہتے تھے۔ کیونکہ لکھنؤ میں فقیروں کا فرقہ ایسا نہیں ہو کہ باسانی ہٹایا جا سکے خصوصًا ایسے موقعوں پر جبکہ عام دستور یہ ہو کہ انکی طرف برابر روپیہ اشرفی پھینکتے جاتے ہیں اور ایک لٹس مچتی ہو۔ عصا برداروں کے بعد خواجہ سراؤں کا افسر اعلیٰ (نواب ناظر) جسکے اقتدارات و مراتب کا میں ذکر کر چکا ہوں اپنے ہاتھی پر سوار ہمراہ ہوتا تھا۔ ایسے موقعے پر اُسکی پوشاک نہایت مغرق زرتار و جواہر نگار ہوتی تھی اُس کے سر پر ایک نفیس جگمگاتا شملہ کاندھے پر اعلےٰ درجہ کا کشمیری دوشالہ ہوتا تھا اور بالکل ایک گڈے کی قطع ہوتی تھی۔

اب بیگم صاحبہ کی خواصوں اور پیش خدمتوں کی سواریاں نکلتی تھیں۔ ان میں کچھ پالکیوں پر سوار ہوتی تھیں کچھ جھنڈولوں پر اور کچھ رتھوں پر۔ ان سب کے ساتھ سپاہی۔ برق انداز۔ بلم بردار عصا بردار اور سوار بیحد و شمار ہوتے تھے۔ محل کی ان بیگموں خانموں کی تعداد کبھی ڈیڑھ سو سے کم نہوتی بلکہ دو سو تک ہوتی تھی۔ بعض لوگ پوچھ بیٹھیں گے کہ آخر ان لوگوں کا وہاں کیا کام تھا؟ اُسکا جواب یہ ہو کہ اُن کے متعلق بہتیری خدمات تھیں۔ بعضوں کو داستان گوئی میں کمال حاصل تھا۔ اور سب طرح کی دلچسپ کہانیاں اور داستانیں بیان کرتی تھیں۔ بعضی باجے میں مشاق تھیں کہ جو ہر روز یہی خدمت انجام دیا کرتی تھیں مغلانیاں تھیں جو سلائی کرتی تھیں۔ اگرچہ ہندوستان میں عورتوں کے کپڑے بھی مرد ہی سیتے ہیں لیکن حرم شاہی میں یہ عورتیں ہی کرتی تھیں۔ بعضی مشاطگی کی خدمت پر معمور تھیں اور بیگم صاحبہ کے بناؤ سنگار میں ہاتھ بٹاتی تھیں

اور بہتیری قرآں خواں ہوتی تھیں۔ اور بہتیری خواصیں ایسی ہوتی تھیں کہ جو درحقیقت لونڈیاں ہوتی تھیں۔ مگر انسے اوپر دری کے کام لیے جاتے تھے۔ یہ پیش خدمتیں اگرچہ کیسے ہی ادنیٰ درجے کے کام کرتی ہوں پھر بھی نامحرموں سے پوشیدہ اور بالکل پردے میں رہتے تھیں۔

اس شان وشکوہ۔ انبوہ کثیر اور بے حد شور وغل کے ساتھ بادشاہ بیگم صاحبہ کی سواری ایک متبرک مقام کی زیارت کیواسطے نکلا کرتی تھی۔ اور ناظرین! آپ یقین مانیں کہ خود بیگم صاحبہ کو اپنی اس ٹھاٹھ باٹھ کی کچھ کم پروانہ ہوتی تھی۔ اور انکی علوی شان کا جو آوازہ بلند ہوتا تھا وہ اُن کے دل کو خوش کر دینے کو کافی ہوتا تھا۔ لیکن ہمکو اپنے دماغوں سے انکی صورت بھلا دینا چاہیے۔ کیونکہ باوجود اس جاہ وحشم کے یہ بیچاری واجب الرحم تھی۔ درانحالیکہ اُن کی وقعت ایک بال وپر شکستہ مرغ زریں کی ایسی تھی۔ کیونکہ ہمارے نزدیک تو انگلستان کے کسی دوکاندار کی عورت جسکا شوہر ایمانداری سے کچھ کماتا ہو اور جسکے پاس اپنا ذاتی مکان رہنے کو ہو اودھ کی بادشاہ بیگم سے کہیں زیادہ خوشحال اور زیادہ معزز ہے۔

باب دہم

چھوٹے بڑے جانوروں کی لڑائیاں

دربار اودھ کے معمولی کھیل تماشوں میں سکھلائے ہوئے پرندوں اور درندوں کی لڑائی کا چرچا بہت تھا۔ اور اسی غرض سے ہر قسم کے جانور پالے اور سکھائے سدھائے جاتے تھے انمیں سب سے زیادہ تیتر کی لڑائی حیرت انگیز ہوتی تھی۔ جہاں اس جانور کو بڑھاوے دیے گئے اور وہ جٹ گیا اور پنجوں اور چونچ سے حملہ کرنے اور روکنے لگا۔ پھر اس قدر پامردی اور جرأت کے ساتھ لڑتا تھا کہ دیکھنے والے حیران و ششدر رہجاتے تھے۔ خود بادشاہ سلامت کو بھی تیتر کی لڑائی بہت پسند تھی۔ یہ لڑائیاں عموماً یوں ہوا کرتی تھیں کہ کھانے کے بعد میز بالکل صاف کردیجاتی تھی اور جانور تشنہ پانی سے تیار ہوکے "حضوری میں باریاب" ہوتے تھے بادشاہ سلامت حسب دستور میز کے ایک جانب وسط میں اپنی زرنگار کرسی پہ جلوہ افروز ہوتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ "ہاں لڑائی شروع کرو" حکم ہوتے ہی دو مرغ لاکے میز پہ سامنے کھڑے کردیے جاتے تھے یہ دونوں آتے ہی آنے پہلے تو ہماری سب کی طرف غور سے دیکھتے اور اپنی اداؤں سے یہ ظاہر کرتے تھے کہ "آخر۔ اس جلسے میں ہمارا کیا کام۔ ہمکو یہاں کیوں لائے ہیں" اب ایک مرغ نے گردن اُٹھائے۔ "گگڑوں کوں" آواز لگائی اور فوراً دوسرے نے صدائے بازگشت سنائی۔ دو ایکبار یہی سوال جواب ہوے۔ لیکن ابھی دونوں میں سے کسی کے تیور نہیں بدلے ہیں۔ آخرکار لوگوں نے ایک مرغی بھی دونوں مرغونکے بیچ میں ٹھیک بادشاہ سلامت کے روبرو لاکے بٹھادی۔ مرغی کے آتے ہی دونوں مرغ اپنی اپنی جگہ سے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے چلے کہ ذرا ان نیکبخت سے راہ و رسم پیدا کریں۔ اسوقت ان مرغوں کی رفتار کی وہی شان ہوتی تھی جیسے کوئی ترک مسجد یا زنانخانہ میں اکڑتا ہوا جاتا ہو۔

جب مرغی کی طرف دونوں بڑھتے ہیں اُسی وقت سے اُنکے تیور بگڑنا شروع ہوجاتے ہیں ایک کے پر پھول گئے۔ دوسرے کی گردن بلند ہوگئی۔ ایک نے ہانک لگائی۔ دوسرے نے ذرا زیادہ زور سے اُسکا جواب دیا بیچاری مرغی بجائے خود حیران و پریشان کھڑی سیر دیکھ رہی ہے۔ آخرکار گتھم گتھا ہوگیا۔ یہ موقع غنیمت سمجھ کے وہ بیچاری تو دبے پاؤں کھسک گئی اور یہ دونوں جٹ گئے۔ اب بازو اُٹھ گیے۔ کیس بھی بلند ہوگئے۔ پر پھول گئے۔ اور یہ جو پنجوں پنجوں کی

رد و بدل بھی شروع ہوگئی۔ اسکے بعد جیسی لات چلتی اور جس طرح کی چونچ بازی ہوتی ہی وہ بڑی دلچسپ قابل دید ہوتی ہی۔ دونوں کی نگاہیں لڑی ہوئی۔ ایک ایک ادا پر آنکھیں گڑی ہوئی ہیں۔ گردنیں بلند ہیں۔ غیظ و غضب یا جوش انتقام سے پر پھولے ہوے ہیں۔ ٹانگیں بار بار اُٹھتی اور لات رسید کرکے پھر زمین پر آجاتی ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہی کہ دونونکی جانونپر بنی ہوئی ہی اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہی۔ دھوکے دھڑی کے ساتھ ایک تھوڑا کھسک جاتا ہی اور اپنے کو مفرور ثابت کرنے کیواسطے ذرا ٹھٹک کے رہجاتا ہی۔ پھر بڑھ کے جٹ جاتا ہی۔ اور اس بیتابی و جوش سے حملہ کرتا ہی کہ جیسے دلمیں یہی ٹھنی ہوئی ہی کہ بس حریف کے خون میں چونچ ڈبوکے دم لے اور فتحمندی کا سہرا باندھ کے میدان سے نکلے۔

ادھر تو یہ پہلوان اسطرح جی توڑ کے اور جان پر کھیل کے لڑ رہے ہیں اُدھر منبر کے ارد گرد جتنے آدمی کھڑے ہیں سبکی نظریں انھیں پر جمی ہوئی ہیں سبکی ہمتیں اسی پر مصروف ہیں کہ دیکھیں کون جیتتا کسکے ہاتھ بالا رہتا ہی۔ یہ لوگ موقع موقع سے دونوں کو داد دیتے جاتے ہیں کبھی اسکی تعریف کرکے جی بڑھا دیا۔ کبھی اُسکو بڑھاوے دیکے اور گرما دیا۔ اور تو اور خود بادشاہ سلامت بھی بیحد جوش میں ہوتے تھے۔

آخرکار۔ ایک مرتبہ دونوں جانور ایک ہی وقت میں اُڑتے ہیں اور منبر سے چند انچھ کی بلندی پر معلق ہوا میں گتھ جاتے ہیں۔ ایک کے پنجے دوسرے کی رانوں۔ پٹھوں میں دھنسے ہوے۔ دوسرے کی چونچ اُسکی آنکھ میں گڑی ہوئی۔ اب پر نچ نچ کے اُڑنے اور زخموں سے خون کے فوارے چلنے لگے۔ دونوں کے بدن لہولہان ہوگئے اور یہ بخوبی آشکارا ہوگیا کہ یہ خالی جنگ زرگری نہ تھی کہ جو صرف نمایش کے طور پر تفریحاً کیگئی تھی۔ اب فتحمند اکڑا تنا کھڑا ہوا ہی۔ بار بار نعرہ بلند کرتا ہی۔ اور تماشائی لوگ واہ واہ" شاباش" کی آوازوں سے مکان سر پر اٹھائے لیتے ہیں۔ لیکن ابھی بازی تمام نہیں ہوئی ہی۔ حریف پھر بڑھ رہا ہی۔ اگرچہ بہت کچھ خون بدن سے نکل گیا ہی۔ پٹھے گھائل ہوچکے ہیں۔ زبانیں پھٹ پھٹ گئی ہیں۔ لیکن اُسکی چوٹ باقی ہی۔ تیور رہ میں نہیں ہی۔ ایکبار اور وہ اُسی طرح دم خم کے ساتھ مصروف جنگ ہوگا۔ اور بے خوف و خطر اور بالکل خوشی خاطر کے ساتھ اپنی گھات ڈھونڈھیگا۔ کیونکہ ابھی مارنے مرنے کا حوصلہ اُسکے دلسے نکلا نہیں ہی۔

ایکبار پھر دونوں اچھلے اور ہوا پر بلند ہوے۔ پھر اُسی طرح پنجے رانوں اور پٹھوں میں

دشمنے اور چونچوں نے آنکھوں پر حملے کرنا شروع کر دیے۔ پہلے جو فتحمند ہوا تھا۔ اب اُسے شکست ہوئی۔ وہ پیچھے ہٹا۔ دیکھا تو ایک آنکھ حلقے سے باہر لٹک آئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ بڑی ہی بے رحمی کی سیر ہوتی تھی۔ لیکن یہ لوگ جو میز کے گرد تماشائی ہوتے تھے اُسکے دیکھنے کی بالکل عادی ہوجاتے تھے۔ اور اسپر کچھ التفات ہی نہ کرتے تھے۔ پھر کمرے میں شور بلند ہوا۔ اور قہقہوں سے چھت اڑنے لگی اور پھر اسی بیچارے کو بڑھاوے دیے جانے لگے جسکی آنکھ جا چکی ہے۔ لیکن اُسکو کسی ترغیب اور جوش کی حاجت ہی نہیں۔ وہ خود انتقام لینے کے لیے جان پر کھیلے ہوئے ہے۔ چنانچہ گھڑی بھر بعد پھر جنگ و پیکار کا بازار گرم ہوتا ہے۔ اور پہلے سے بھی زیادہ جوش اور تیزی و تندی کے ساتھ گرم ہوتا ہے۔ حتی کہ دونوں میں سے ایک بالکل بیجان یا بسمل و نیم جان ہو کے میز پر گر پڑتا ہے تب جا کے لڑائی ختم ہوتی ہے۔ فتحمند صاحب کو دیکھیے کہ اُنکو بھی یہ فتح و ظفر سستے داموں نہیں ملتی ہے۔ وہ بھی یا تو ایک آنکھ کھو کے یا ایک ٹانگ سے ہاتھ دھو کے اور صرف جان صحیح سلامت لے کے میدان سے نکلتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ لوگ اُسے چمکارتے۔ شاباشی دیتے پیٹھ ٹھونکتے لیجاتے ہیں اور آخر کار بعد چندے اُسکی بھی جان جاتی ہے۔

اب میز صاف ہوگئی۔ بادۂ گلرنگ کے دور پیاپے چلنے لگے۔ بادشاہ سلامت عالم سرخوشی میں ہیں۔ لوگوں سے تاکید فرما رہے ہیں کہ "اجی ناس لو" سب لوگ بظاہر تعمیل کر رہے ہیں۔ بادشاہ کی پشت پر پیچوان لگا ہوا ہے۔ زنانہ خواصیں اُسکی آگ تیز کر رہی ہیں۔ بادشاہ خوش خوش دھوئیں کے لچھے اُڑا رہے ہیں۔ اور مرغوں کی حرکات پر رائے زنی ہو رہی ہے کس صفائی سے ایک نے دوسرے کی آنکھ نکال لی۔ اور اُسنے کیسی پھرتی سے لات ماری۔ اسپر ہنسی اُڑ رہی ہے۔ یہ باتیں ہی ایسی مضحکہ انگیز ہیں۔ آخر سرور و سرخوشی کی حالت میں بادشاہ سلامت بول اُٹھے کہ "بھئی۔ ابھی تو اور تماشہ ہونا چاہیے۔" یہ سنتے ہی اہالی موالی بیتاب ہو کے پوچھنے لگے کہ "خداوند! کسکی باری ہے۔ مرغ۔ بٹیر۔ تیتر۔ کون جوڑ منگایا جائے؟" بادشاہ نے کچھ ارشاد فرمایا اور پھر بازی شروع ہو گئی۔ اب کی بار کچھ اور زیادہ شور و غل اور طوفان بے تمیزی بلند ہوا۔ کیونکہ اب شراب سب کو مست و بیخود کر چکی ہے۔ حتے کہ بادشاہ سلامت نشہ میں بالکل دھت ہوگئے۔ ایسے کہ حکم دیتے ہیں تو صاف جملے بھی منہ سے نہیں نکلتے۔ اسی طور پر یہ جلسہ برخاست ہوا۔

اب ہم بارہ سنگھوں کا حال لکھتے ہیں۔ یہ جانور کوہ ہمالیہ کے دامن سے پکڑ کے بکثرت لکھنؤ میں لائے جاتے ہیں۔ یہاں اُنکو قواعد جنگی کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اگرچہ جانور کا قد چھوٹا ہے اور اُسکے جسم کی

ساخت میں نزاکت اور پھرتیلا پن بہت ہوتا ہے۔ بارہ سنگھوں کی لڑائی کسی شاہی باغ یا احاطے میں (جو اسی غرض سے محاط کیا جاتا ہے) ہوا کرتی تھی۔ اور بادشاہ سلامت برآمدے میں بیٹھ کے اس لڑائی کا تماشہ ملاحظہ فرماتے تھے اور انکے ارد گرد رفیق رفقا اور مصاحبین جمع ہوتے تھے جس چستی اور چالاکی سے یہ بڑے سینگوں والے جانور ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے قابل دید ہوتی تھی۔ وہ پو قدمی چال۔ وہ شاخدار سینگوں کا ہوا میں بل کھانا۔ وہ انکا دبے پاؤں گھات سے چلنا۔ اور ایک عجیب ادا کے ساتھ پینترے بدلنا۔ اور یہ چاہنا کہ ہم ہی موقع سے ہو رہیں کچھ عجیب دلکش سماں ہوتا تھا جسکا لطف بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ واقعی یہ نظارہ بہت خوش آیند ہوتا تھا اگرچہ قابل تاسف بھی ہوتا تھا کہ یہ ساری سبک خرامی اور ہنر آزمائی محض بے ضرورت بیوجہ ہو رہی ہے۔

رفتہ رفتہ دونوں اپنے سینگ سامنے کرکے سینگوں سے تلوار اور سپر دونوں کے کام لیتے تھے۔ سینگ سے سینگ ملائے دونوں کبھی دو قدم آگے بڑھتے۔ کبھی ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ اسی طور سے وہ ٹکریں لڑتے ہیں۔ حتی کہ بعد خرابی بصرہ بہت کچھ ٹکر بازی اور پینترے بدلول اور ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کی کارروائی کرکے دونوں کے سینگ گتھ جاتے ہیں اور اب وہ وقت آتا ہے کہ دونوں کے رگ رگ ریشہ ریشہ پر پورا زور پڑ رہا ہے اور دونوں نہایت مستعدی اور جوش کے ساتھ اپنی پوری قوت صرف کر رہے ہیں۔ جسکا انجام ایک نہ ایک کے حق میں موت ہوتا ہے۔ دونوں کے پچھلے پاؤں بالکل جڑے ہوئے ہیں۔ سر جھکے ہیں اور اگلے پانوں اسطرح آگے بڑھکے زمیں پر جمے ہیں گویا زمیں میں گاڑ دیے گئے ہیں۔ دونوں بڑے زور لگا رہے ہیں۔ اور پورے بدن کی طاقت ایک ایک ٹکر یا ٹکر کے جواب میں صرف کر رہے ہیں۔ ایکبار ایک کی ٹکر ذرا اچھی پڑی اور اسنے اپنے حریف کو چند قدم پیچھے ڈھکیل دیا۔ دوسری بار اسنے اپنا بدلہ اس سے لے لیا۔ لیکن ابھی تک انکے بدن کے سب رگ پٹھے تنے ہوئے ہیں۔ ہر عضو بدن حصول فتحمندی میں اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لے رہا ہے اور اس حالت پر بھی جو پانوں اٹھتا ہے وہ بڑی سہولت اور خوبصورتی کے ساتھ زمین پر رکھ دیا جاتا ہے اور جو حرکت ہوتی ہے شایستگی اور تناسب اعضا کے خلاف نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو کچھ زور آزمائی ہو رہی ہے وہ صرف سینگوں کے ذریعے سے ہو رہی ہے۔

آخرکار۔ ایک کا زور کمی کرنے لگتا ہے۔ اسکی آنکھوں کے گول گول دیدے خوف وہراس

کی وجہ سے خوں چکاں ہو جاتے ہیں۔ اب پانوں جو اُٹھتے اور پھر زمین پر آتے ہیں تو ان میں تھرتھری بھی دکھائی دیتی ہی۔ کیونکہ زبردست حریف اُسے برابر ریلتا۔ ڈھکیلتا چلا آتا ہی اور اب اُسے یہ اُمید باقی نہیں رہی ہی کہ پھر اپنی جگہ پر قائم ہو سکے گا۔ یہ آثار کمزوری دیکھکے حریف کا دل اور بڑھ جاتا ہی اور وہ اور بھی تیزی و تندی کے ساتھ اُسے ریلتا ہی۔ کیونکہ ایک کے دل سے جو اُمید نکلتی ہی وہ دوسرے کے سینے میں اور بھی حوصلہ پیدا کرتی اور اُمید بندھاتی ہی اور وہ بڑے زوروں میں ہو جاتا ہی۔

یہ حالت دیکھکے برآمدے میں بڑا جوش سب کو ہوتا ہی۔ بادشاہ سلامت اور اُنکے مصاحبین بیتاب ہو ہو جاتے ہیں۔ اور لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اور گردنیں اُٹھا اُٹھا کے دیکھنے لگتے ہیں کہ انجام کیا ہوتا ہی۔ خود بادشاہ سلامت سب سے زیادہ مشتاق ہوتے ہیں کہ دیکھیں کون بازی لیجاتا ہی۔ بار بار وہ پکار اُٹھتے ہیں کہ "دیکھنا۔ دیکھنا۔ اب وہ چلا۔ بالکل چلا۔ سکالا پالا مارے لیے جاتا ہی" اسمیں شک ہی کیا ہی۔ کیونکہ کالا بارہ سنگھا برابر سرگرمی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا آ رہا ہی۔ اُسکا سر اب کچھ اور زیادہ جھک گیا ہی۔ ہر رگ پٹھا تنا ہوا ہی اور جوڑ جوڑ مارے جوش کے پھڑک رہا ہی۔ اور حریف بیچارے کا یہ حال ہی کہ وہ اپنے دیدے بڑی بیتابی اور بے چینی سے گھما رہا ہی۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت و ہراس ٹپک رہی ہی۔ خوف کے مارے اُسکے بدن میں رعشہ پڑ گیا ہی۔ نازک ٹانگیں تھرتھرا رہی ہیں اور جوڑ جوڑ بے قابو ہو رہا ہی۔ آخرکار وہ احاطے کے سرے پر پہونچ گیا۔ اُس کی پچھلی ٹانگیں احاطے کے ٹٹر سے لگ گئیں۔ اب پیچھے ہٹنے کی جگہ ذرا باقی نہیں ہی۔ لیکن ابھی تک حریف نے اُس کی جان نہیں چھوڑی ہی۔ وہ اُسی طرح اُسے ریل رہا ہی۔

اس وقت تماشائیوں میں سے کوئی شخص (جو بیتابی کے ساتھ ہاتھ ملتا ہوتا ہی) بول اُٹھتا ہی کہ "بس۔ بس۔ لڑائی ہو چکی"۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہی کہ بیچارا شکستہ دل بارہ سنگھا ایک طرف سے بانسوں کے ٹٹر اور دوسری طرف سے فتحمند حریف کے شکنجے میں پھنس گیا ہی تو اُس کے مُنہ سے بے اختیار یہی جملہ نکل جاتا ہی کہ "بس! لڑائی ہو چکی"۔ اور بادشاہ سلامت اور اُن کے مصاحبین اسپر بہت ظرافت صرف فرماتے ہیں۔

یہ آواز مغلوب اور کمزور جانور (جو ابھی تک مصروف زور آزمائی ہوتا ہی) کے کان میں بھی پڑتی ہو اور حتی المقدور وہ اپنے گول گول دیدے اُچھالکے اوپر کی طرف دیکھنے لگتا ہی کہ یہ آواز کدھر سے آئی۔ کیونکہ اُسے اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ایسے نازک وقت میں اُدھر سے کوئی

تک بھی پہونچ سکتی ہی۔ اُس کے بدن کی ساری طاقت جو اب تک اُسے سنبھالے ہوئے تھی اب جواب دینے لگتی ہی۔ حریف تو ابھی تک سر جھکائے اور تازہ دم ریل پیل کر رہا ہی۔ لیکن اُسکی ٹانگیں بالکل ڈگمگانے لگتی ہیں۔ اب وہ اپنا بدن سکوڑ کر حریف کے سامنے سے منہ پھیر لیتا ہی۔ گویا یہ ظاہر کرتا ہی کہ اب مقابلے کی تاب نہیں۔ تھوڑی بھر میں سینگ جگر بند سے نکل جاتے ہیں۔ اور فتحمند کے سینگوں کی تیز نوکیں اُس کے بدن کو گھائل کرنے لگتی ہیں۔ بیچارے کی گردن گھوم جاتی ہی۔ سر سے خون کے فوارے جاری ہو جاتے ہیں اور جب وہ ایک پاؤں توڑ کے کھڑا ہو جاتا ہی تو اُس کے منہ سے نہایت درد و الم ظاہر کرنے والی آواز نکلتی ہی اور بڑے بڑے آنسو آنکھوں سے نکل کے منہ پر ڈھلکنے لگتے ہیں۔

جان بڑی پیاری ہوتی ہی۔ وہ بیچارا بڑی چستی اور مستعدی کے ساتھ اپنے کو حریف کی گرفت سے جدا کرتا ہی۔ حتی کہ اس جھپیٹے میں اکثر فتحمند حریف کا منہ بھی پھر جاتا ہی۔ اور پھر بڑی کمان کے تیر کی طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کے ایک دم میں کہیں کا کہیں پہونچ جاتا ہی۔ لیکن احاطے کی وجہ سے مجبور ہو کے ٹٹروں کے برابر برابر چکر لگانے لگتا ہی کہ شاید کوئی مفر کی صورت نکل آئے۔

برآمدے میں اب بھی بہت جوش ہی۔ ابھی کچھ اور تماشہ باقی ہی اور بادشاہ سلامت "شاباش شاباش" کی آوازوں سے بیچارے مفرور و مفتوح کا جی رکھ لیتے ہیں۔

جب بارہ سنگھا اپنی جان بچا کے بھاگتا ہی تو بڑے زور سے بے تکان بھاگتا ہی۔ اُس کے سرعت رفتار اس غضب کی ہوتی ہی کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ وہ چاروں طرف حسرت سے نظر کرتا ہی کہ کوئی تو اس آڑے وقت مدد کو آئے۔ اور کسی طرف تو نجات اور گریز کی راہ نکلے۔ مگر سب طرف سے مایوسی منہ دکھاتی ہی اور جس وقت وہ ٹٹر کا چکر کاٹتا اور تیزی سے بھاگتا ہی اور اُس کی کھال پر خون نشاں زخم دکھائی دیتے ہیں۔ عین اُسوقت اُسکا حریف اپنے حواس پریشان دوبارہ حملہ کرنے کے واسطے جمع کرتا ہی اور از سر نو جھپٹ پڑنے کے واسطے تازہ دم ہو جاتا ہی۔ پھر سر جھک جاتا ہی اور اتنا جھک جاتا ہی کہ پاؤں سے جا لگتا ہی۔ پھر سینگ (جن کی نوکیں خون آلود ہوتی ہیں) مفرور حریف کے سامنے ہوتے ہیں اور اپنی گھات پا جاتا ہی تو پھر بڑی تندی کے ساتھ اُس پر جھپٹ پڑتا ہی۔ پھر اُس نے اپنے حریف کو ایک گدا رسید کیا۔ پھر اُسکے سینگ دور تک حریف کے بدن میں پیوست ہو گئے۔ حتی آپہنچا۔ المختصر حریف بیجان یا نیم جان ہو کے زمین پر گر پڑا۔ اور فتحمند اُسکی نعش کو اپنے سینگوں سے جھنجھوڑ کے اپنا سر اٹھاتا اور ظفر یابی پر اکڑتا ہی۔

لاحول ولاقوۃ میں نے بھی کیا فضول بکواس کی ہی۔ بھلا جس مقام پر بڑے خونخوار

شیروں۔ اڑیل گینڈوں اور کوہ پیکر ہاتھیوں کی لڑائیوں کا بیان کرنا چاہیے وہاں بیچارے بارہ سنگھوں کی لڑائی کس شمار قطار میں ہے۔ اگرچہ وہ کتنے ہی خوبصورت اور نازک اندام کیوں نہوں۔ ان درندوں کی لڑائی کے سامنے بیچارے مینڈھے۔ تیتر۔ بٹیر۔ اور مرغوں کی لڑائیاں تو بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ ہاں۔ دو شیروں یا چیتوں کا ایک دوسرے کو پھاڑنا۔ یا دو گینڈوں کا اپنے قرنی نما سینگوں سے یلغار کرنا۔ یا دو ہاتھیوں کا ایک دوسرے کی جان لینے پر طرف قوت کرنا بیشک ایسے امور ہیں جنکے بیان میں ناظرین کو افسانہ ہائے شادی و غم کا مزا مل سکتا ہے کیونکہ انکے تذکرے کے سامنے اور کسی جانور کی لڑائی کا نام بھی نہ لینا چاہیے۔

جب چیتے لڑائے جاتے تھے اور کئی روز کی بھوک اور پیاس کے تاؤ میں دو چیتے احاطے میں (جو نہایت مستحکم طور سے محاط کیا جاتا تھا) چھوڑے جاتے تھے اسوقت ایسا سناٹا اور سکوت ہر طرف ہوتا تھا کہ اگر زمین پر سوئی بھی گرے تو آواز سنائی دے۔ گویا انتظار اور اشتیاق خود مجسم ہو کے اُس مقام پر آجاتا اور نتیجہ کے دیکھنے اور سننے کے واسطے ہر شخص چشم براہ اور گوش بر آواز ہوتا تھا۔

بادشاہ کے ہاں ایک چیتا گگرا نامی تھا۔ بڑا گراں ڈیل۔ اور لکھنؤ میں کئی لڑائیاں جیتے ہوے۔ میں نے اس سے بڑا چیتا کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اُسکی کھال پر دھاریاں نہایت خوشنما تھیں۔ اور جب آزادی کے ساتھ وہ چلتا تھا تو اسکی ٹانگوں اور لانبی لانبی پیٹھ پر چکنی چمکیلی کھال بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ جو لوگ اس فن میں طاق تھے اُنکو خیال تھا کہ گگرا کے مقابلے پر لڑنے والا کوئی چیتا مل ہی نہیں سکتا۔ کہ ایک بار یہ خبر ملی کہ ایک بڑا تنومند اور زور آور چیتا ترائی میں پکڑا گیا ہے۔ واضح ہو کہ ترائی وہی لق و دق جنگل ہے جو اودھ اور نیپال کے درمیان حائل اور کوہ ہمالیہ کے دامن میں ہے۔ سب کی رائے یہی ہوئی کہ اگر یہ جانور آجائے تو گگرا سے خوب جوڑ ہو۔

جب یہ نووارد شیر جس کا نام ترائی والا رکھا گیا۔ لکھنؤ میں آگیا تو اُسکی پرداخت بڑی خبرگیری اور نگرانی کے ساتھ کی گئی اور یہ طے ہوا کہ جس زمانے میں کمانڈر انچیف افواج انگلشیہ لکھنؤ میں بادشاہ سے ملنے آئیں اُس وقت یہ جوڑ لڑایا جائے۔ چنانچہ اسکے واسطے بہت کچھ غیر معمولی تکلفات اور ساز و سامان کیے گئے۔ اور جس رمنے میں یہ لڑائی ہونیوالی تھی وہاں پھول پتیوں اور رنگارنگ آرائشوں سے بڑی سجاوٹ کی گئی۔ باشندگان ہند کا مذاق آرائش و زیبائش میں تو

ضرب المثل ہے۔ بس سمجھ لینا چاہیے کہ اس سجاوٹ میں خوب خوب جوہر دکھائے گئے تھے۔ جس برآمدے میں بادشاہ سلامت مع مصاحبین اور کمانڈر انچیف مع اسٹاف بیٹھنے والے تھے وہ نہایت مغرق وزرتار پردوں اور خوشرنگ جھنڈیوں۔ بیرقوں سے خوب سجا گیا۔ چتر سلطانی جو سنہری اور قرمزی رنگ کے بادلے سے منڈھا ہوا تھا تخت شاہی پر سایہ افگن تھا۔ اور اُسکے دونوں پہلوؤں میں نہایت گرانبہا اور ممتاز قسم کی کرسیاں صاحب کمانڈر انچیف اور صاحب رزیڈنٹ کے واسطے بچھائی گئی تھیں بادشاہ سلامت اپنا تاج شاہی زیب سر کیے ہوئے تھے۔ یہ تاج بالکل نیا بنا ہوا تھا۔ اور اُسمیں بکثرت جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اُسکے طرے میں نہایت سفید براق پر ہما لگا ہوا تھا۔ جو نیچے کی طرف ذرا جھکا ہوا رہتا تھا۔ اور بادشاہ سلامت جب چاہتے تھے بڑی شان سے سر اُٹھاتے تھے۔ آپکے چہرے کی گندمی رنگت (جسمیں غضب کی صباحت اور ملاحت تھی) جواہرات کی تابش اور ہما کے نازک پر کی جنبش سے اور بھی خوش آیند اور نظر فریب معلوم ہوتی تھی۔ اس موقع پر وہ مشرقی لباس جو نہایت زرق برق چینی کمخواب کا تھا پہنے ہوئے تھے۔ اس کپڑے میں اگرچہ ریشم بھی تھا مگر بالکل سیم وزر سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اُسکی آب وتاب اس غضب کی تھی کہ ہر جنبش پر جواہرات کے نہایت اچھے تراشے ہوئے نگینوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ صاحب کمانڈر انچیف اپنی جرنیلی وردی پہنے ہوئے تھے۔ اور صاحب رزیڈنٹ بالکل سادے لباس میں تھے۔ یہ سارا سماں ایسا تھا جو کبھی

لہ یہ کمانڈر انچیف لارڈ کومبرمیر تھے۔ جنہوں نے ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ اُنکی تواضع ومدارات شاہانہ شان وشکوہ سے کی گئی تھی۔ چنانچہ اُنکے ایک افسر ہمراہی کا بیان ہے کہ

"جس وقت ہم لوگ ایوان شاہی میں داخل ہوئے۔ ہم لوگ بادشاہ اور اُن کے مصاحبین کے ساتھ ناشتہ کھانے میز پر بیٹھے۔ بادشاہ نہایت اعلی درجے کا ملبوس شاہی سبز مخمل کا پہنے ہوئے تھے اور شاہی پٹکا کمر میں باندھے ہوئے تھے اُنکی پگڑی میں جواہرات ہی جواہرات نظر آتے تھے اور جسم پر ہیرے۔ زمرد اور موتیوں کے کنٹھے۔ مالے۔ بازوبند۔ نورتن اور اسکے اپنی تاب وتابش دکھلا رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کے ہم لوگ قصر سلطانی میں داخل ہوئے۔ اگرچہ اس کی صنعت میں تناسب کو دخل نہ تھا لیکن آراستگی اور سجاوٹ نے اُسے دلھن بنا رکھا تھا۔ خاصکر تخت شاہی بہت خوب سجا بنا ہوا تھا۔ جسمیں زردوزی کا کام تھا اور بالکل موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ اسی مقام پر بادشاہ نے صاحب کمانڈر انچیف کو اپنی تصویر عنایت کی۔ جسمیں ہیرے جڑے ہوئے تھے اور ایک موتیوں اور زمرد کی لڑی میں ٹنکی ہوئی تھی"

(مؤلف)

فراموش نہیں ہوسکتا اور چاہے ہزاروں واقعات دل سے محو ہو جائیں لیکن یہ ضرور یاد رہیگا گگرا اور ترائی والے کی کٹہرے صحن میں آمنے سامنے ایسے موقع سے رکھے گئے کہ ہم لوگ جو برآمدے میں تھے بخوبی دیکھ سکیں۔ چنانچہ جب یہ دونوں جانور نہایت جوش اور تیزی اور تندی سے اپنے کٹہروں میں دیواروں سے ملے ہوئے گھومتے تھے تو ہم انکی چمکیلی پیٹھوں کو دیکھ سکتے تھے۔ اس درمیان میں جب کوئی شخص کٹہروں کے پاس سے ہوکے نکلتا تھا تو جانور بڑے زور سے ہونکتے اور دانتوں کو پیسکے غراتے تھے۔

دیر تک دونوں کٹہرے یوں ہی رکھے رہے۔ محض اس خیال سے کہ دونوں ایک دوسرے سے صورت آشنا ہو جائیں۔ کیونکہ اگرچہ چیتا خونخوار بہت ہوتا ہی لیکن بالخلقت ڈرپوک اور بزدل بھی ہوتا ہی اور اُسکی سرشت میں داخل ہی کہ اگر یکایک کسی خطرے میں پڑجاتا ہی تو جان چُرانے اور منہ موڑنے لگتا ہی۔

میں نے خود اپنی آنکھ سے دو چیتوں کو اس حال میں دیکھا ہی کہ دونوں بخوبی تیار کر لیے گئے تھے۔ بھوک اور پیاس کے مارے ہوئے تھے۔ اور اسی تاؤ میں تھے کہ احاطے میں داخل کیے گئے البتہ دونوں ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ جب اُنکا سامنا ہوگیا تو دونوں کو یہی فکر پڑی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے کٹہروں میں پہونچ جائیں۔ اور جب کٹہروں میں نہ پہونچ سکے تو دونوں الگ الگ کونوں میں دبکنے اور پیٹ کے بل لیٹنے اور ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ لیکن مقابلہ یا میدان داری پر ایک بھی متوجہ نہ ہوا۔

یہ تو ظاہر ہی کہ گگرا اور ترائی والا دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی کی خبر بہت جلد ہوگئی۔ کیونکہ جب وہ اپنے کٹہروں میں ٹہل رہے تھے اُس وقت بھی ٹہلتے ٹہلتے یکایک وہ کھڑے ہو جاتے اور اپنے حریف کیطرف بالکل شیروں کی طرح غرانے اور دانت نکالنے لگتے تھے۔

صاحب کمانڈر انچیف اور صاحب رزیڈنٹ دونوں نے ان جانوروں کو پیشتر ہی ملاحظہ فرمالیا تھا۔ اور اب جو کمانڈر انچیف صاحب اُنپر غور سے نگاہ کرنے لگے۔ تو بادشاہ سلامت بول اُٹھے ”کہیے صاحب۔ آپ کس پر بازی بدتے ہیں؟“۔ اس پر اُنھوں نے جواب دیا کہ ”حضور۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں“۔ بات یہ تھی کہ کمپنی کسی قدر بادشاہ سے کشیدہ اور برانگیختہ تھی۔ کیونکہ اُنکے ملک میں بڑی ابتری و بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے کمانڈر انچیف صاحب کو اُن سے بازی بدنے میں تکلف تھا۔ بادشاہ نے رزیڈنٹ صاحب کی طرف مخاطب ہوکے کہا کہ ”بھئی۔ گگرا

پر سنو اشرفیاں!" رزیڈنٹ صاحب نے جواب دیا کہ "اچھا حضور یہی رہی۔ میرے نزدیک تو ترائی والا جیتتا نظر آتا ہے۔" بادشاہ بڑے خوش ہوئے اور لگے ہاتھ ملنے۔ کیونکہ اب اُنکو بازی کا مزا ملنے لگا تھا۔ پھر وہ وزیر اعظم سے اُردو زبان میں مخاطب ہوئے کہ "کہو جی تم ترائی والے پر بازی لگاتے ہو؟" اسپر اُنھوں نے کہا کہ "جہاں پناہ۔ رزیڈنٹ صاحب کی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے میں ضرور بازی لگاؤں گا۔" بادشاہ بولے کہ "اچھا تو گلرا پر سنو اشرفیاں ہوئیں۔" واضح ہو کہ یہ حضرت وزیر اعظم تو برائے نام ہی تھے البتہ مالدار بڑے تھے۔ کیونکہ اصلی وزیر اعظم کا منصب اسی خاصہ تراش کو حاصل تھا جو اسوقت بھی حلقۂ نیازمندان باختصاص میں مودب استادہ تھا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ "اچھا تو سنو اشرفیوں کی شرط رہی۔" وزیر اعظم نے شرط منظور کر لی اور اپنی کمر کے کشمیری شال کے پٹکے سے ایک نہایت نفیس پاکٹ بک نکال کے اس شرط کے مضمون کو اسپر ٹانک لیا۔ یہ کچھ اس غرض سے نہ تھا کہ اگر بادشاہ بھول جائیں تو اُنکو یاد دلایا جائے بلکہ صرف اسلیے تھا کہ اگر کسی وقت بادشاہ فرمائیں کہ "نہیں تمنے گلرا پہ شرط لگائی تھی" تو وہ اُسوقت یہ تحریر پیش کر کے اور دبی زبان یہ کہکے بادشاہ کو شک و شبہہ اور تذبذب میں ڈال دے کہ "کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جہاں پناہ صحیح ارشاد فرماتے ہوں اور میں ہی غلط کہتا ہوں؟" اور اگر بادشاہ اسپر زیادہ اصرار کریں کہ "نہیں جی تمنے ترائی والے پہ بازی لگائی تھی۔ تو وہ فوراً اشرفیاں حاضر کر دے اور ہنسی خوشی اپنی ہار منظور کر کے رقم ادا کر دے۔ اور پھر اسکی کسر یوں نکال لے کہ اس کے بعد ہی جو کھری اسامی اُسکے پھندے میں پھنس جائے اُسکے سر سارا وبال اُتار کے اپنی رقم سیدھی کر لے۔

اشارہ ہوا۔ چیتوں کے کٹہرے کھولے اور بانس کے ٹٹر اُٹھا دیے گئے۔ ترائی والا ایک ہی زقند بھر کے اپنے کٹہرے سے باہر نکل آیا۔ اور اپنا جبڑا پھیلا کے اِدھر اُدھر اپنی دم ہلانے لگا۔ اُسی شان سے گلرا بھی نکل کے میدان میں آکھڑا ہوا۔ لیکن اُسکے انداز میں سلامت روی زیادہ تھی۔ ابھی دونوں پچاس فٹ کے فاصلے سے تھے۔ دونوں کے منہ کھلے۔ دُمیں ہلتی۔ اور دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ بالآخر گلرا چند قدم آگے بڑھا۔ اور اُسکا حریف اپنے پاؤں توڑ کے صحن میں جہاں کا تہاں کھڑا۔ اور دشمن کی طرف ٹکٹکی لگائے تنا رہگیا گویا ہر گھڑی جست مارنے اور زقند بھرنے پر طیار تھا۔ گلرا بھی اُسکو بغور دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ ہوشیاری کے ساتھ قدم بڑھاتا اور سامنا چھوڑ کے اور ذرا کترا کے چلا اور قریب پہونچگیا اب ترائی والا بھی اُٹھ کھڑا

ہوا اور وہ بھی دوسری طرف سے کتراتا کنیاتا چلا۔ دونوں قریب پہونچ گئے۔ اس وقت برآمدے میں جتنے تماشائی تھے سب دم بخود تھے۔ اور ہر شخص کی نگاہ انھیں دونوں پر لگی ہوئی تھی۔ جانوروں کی غیر معمولی طور پر طویل القامت ہونے کی وجہ سے ہر تماشائی پورے طور پر سیر دیکھ سکتا تھا کیونکہ یہ دونوں پہلوان بڑے عظیم الجثہ قوی ہیکل اور خوبصورت تھے۔ ترائی والے کا رنگ گگرا کی بہ نسبت کسیقدر کھلا ہوا تھا۔ یعنے سیاہ سیاہ دھاریوں میں زردی ذرا ہلکی تھی۔ اور دونوں جانور نہایت خوبصورت۔ دلیر اور بے پناہ تھی۔ آخرکار آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے گگرا نے ایک جست کی کیونکہ پچھلی فتحمندیوں کی وجہ سے غالباً اُسے اپنی قوت پر زیادہ اعتماد تھا۔ اُسنے جست کی مگر اس شان سے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ارادہ کرکے کی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی برقی قوت تھی جسنے اُسے اچھال دیا ہے اور یہ جست اسقدر اچانک ایسی پھرتی کے ساتھ اور اتنی تندی سے تھی کہ جس سے صاف پایا جاتا تھا کہ بالارادہ نہ تھی۔ ترائی والا بھی اس موقع پر غافل نہ تھا۔ جس عجلت کے ساتھ اُسکا حریف ہوا پر بلند ہوا تھا بعینہ اُسی چالاکی کے ساتھ وہ بھی ٹھٹک کر الگ کھڑا ہوگیا۔ دونوں کے حرکات ایسی پھرتی سے ہوے کہ آن واحد میں ادہر اُسنے جست کی اُدہر اُسنے گگرا پیچ و تاب کھاکے زمین پر آیا۔ اور قبل اسکے کہ وہ دم راست کرے یا اُسکو اپنے زمین پر آرہنے کا احساس ہو دفعتہ ترائی والا اُسپر آ پڑا اور اُسکے پنجے اسکی گردن پر زور سے پڑے اور منھ اسکے گلے کے قریب پہونچگیا۔ یہ بھی دم کے دم میں ہوگیا۔ ابھی ہملوگ اچھی طرح یہ دیکھ بھی نہ چکے تھے کہ پھر گگرا کی گھات چلگئی۔ یعنی معاً گگرا نے بڑے زور سے اور اپنی پوری قوت صرف کرکے ایک جست کی اور اسکے پنجوں اور جبڑے سے اپنی گردن اور گلے کو چھڑا کر صاف الگ جا کھڑا ہوگیا۔ بلکہ اس زد میں گیا کہ اپنے ساتھ تھوڑی دور تک ترائی والے کو بھی گھسیٹ لیگیا لیکن اُسکی گردن اور شانہ پر خون کے نشان ہوید تھے۔ اب حریف کی گرفت سے اپنے کو گلوخلاص کرکے اُسنے فوراً ایک سخت حملہ ترائی والے پر کیا۔ اسوقت بادشاہ سلامت نے وزیر اعظم کیجانب خطاب کرکے فرمایا "شاباش۔ گگرا شاباش۔ اب میں اسپر دو سو اشرفیاں لگاتا ہوں۔" اسپر روشن الدولہ نے عرض کیا کہ "قبلہ عالم کی یہی مرضی ہے تو وہی سو اشرفیاں سہی۔" پھر اُسنے اپنی پاکٹ بک نکالکے اُسپر یہ شرط بھی ٹانک لی۔ ہم لوگ اُسوقت لڑائی کیطرف ایسے ہمہ تن مصروف تھے کہ کسی نے ان باتوں پر توجہ نہیں کی۔ جب گگرا نے اپنے کو حریف کی گرفت سے گلوخلاص کیا ہے اسکے بعد صرف لمحہ دو لمحہ کے واسطے دونوں جانور اپنے منھ کھولے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ اُسوقت دونوں کے منھ پورے طور پر کھلے تھے اور اُنکی سیاہ سیاہ دھاریوں کی چمک

کھالوں کی جنبش سے بہت پیاری معلوم ہوتی تھی۔ دونوں کی بھیانک اور خوں فشاں آنکھیں باہم لڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ غصے میں کھڑے دم ہلا رہے تھے۔ دفعتہً گگرا نے اپنے حریف پر ایک زور شور کا حملہ کیا۔

اس مرتبہ اُسکا حریف اُس سے بہت ہی قریب تھا اسلیے اُسکو پہلا سا موقع پلٹ پڑنیکا نہ مل سکا اور اُس نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اب دونوں جانور بیچ میدان میں کھڑے تھے۔ دونوں کے پنجے جلد ہی جلدی چل رہے تھے اور دونوں منہ پھیلا کے حریف کی گردن پکڑنے پر بڑھ رہے تھے۔ اُنکی ہر ہر حرکت پر ہم لوگوں کی نظریں لڑی تھیں اور ہم لوگ بخوبی دیکھ رہے تھے کہ کس نے کیونکر حملہ کیا اور کس نے کیونکر حملے کا جواب دیا۔ جب وہ دونوں بالکل قریب ہو گئے اور پنجوں اور منہ سے حملہ کرنے اور ڈھکیلنے لگے تب معلوم ہوا کہ دونوں جانوروں کو بدرجہ مساوی اپنے حریف کو جبڑوں کے زخمی کر ڈالنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ اور دونوں اپنی اپنی پر ہنر زور آزمائی کے ساتھ ایک دوسرے کے منہ سے پکڑے اور گردنوں میں پنجے دھنسائے سخت کشش و کوشش کے ساتھ کشتی لڑ رہے تھے اور اپنی پچھلی ٹانگیں جمائے کھڑے ہوئے تھے۔ بلاشبہ یہ نہایت دلچسپ زور آزمائی تھی۔ اگرچہ لیڈیاں اس کیفیت کو پڑھکے ہمزبان ہو کے بول اُٹھیں گی کہ یہ ساری سیر بڑی ظالمانہ۔ وحشیانہ اور نہایت سفاکی کی سیر تھی۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ اس لڑائی میں بھی بہت سے عالی خیالات مضمر تھے اور کچھ شک نہیں کہ جنگل میں ایسی لڑائی اکثر ہوا کرتی ہی۔

اسی حیثیت سے یہ دونوں جانور قریب قریب چھ فیٹ بلند آپسمیں چمٹے ہوئے اپنے پچھلے پاؤں پر زور دیے لڑ رہے تھے اور اُنکے گول گول چہرے اور شرربار آنکھیں نہایت خوبصورتی سے اُنکے طویل جسم کے اوپر دکھلائی دیتی تھیں جسقدر مضبوط گرفت کے ساتھ پنجے گردنوں اور پہلوؤں میں دھنستے تھے اُسے دیکھ کے حیرت ہوتی تھی۔ دونوں نہ اپنی جگہ سے ہٹتے تھے نہ اپنے پنجے چلاتے تھے بلکہ ایک آن کھڑے زور لگا رہے تھے اور گویا اسی زور آزمائی پر موت و زندگی کا فیصلہ منحصر تھا۔ دونوں کے جسموں سے خون کے فوارے جاری تھے اور اُنکی ہار جیت کا تصفیہ اب اُنکی جسمانی قوتوں پر آٹھ تھا۔ ان واقعات کی تحریر میں بہ نسبت اصل واقعے کے زیادہ تاخیر ہوتی ہی۔ جسوقت یہ دونوں جانور اسطرح کھڑے تھے اُسوقت برآمدے میں جتنے تھے سب بالکل دم بخود اور آئینۂ حیرت بنے ہوئے تھے اور ایسے سکوت و خاموشی کے عالم میں غور و تامل کے ساتھ تماشہ دیکھ رہے تھے کہ گویا کسیکے بدن میں جان ہی نہیں ہی۔ لیکن یہ سب کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گگرا نے جو زیادہ چالاک

اور خونخوار اور پُرغضب تھا بڑی زور سے اپنے حریف کو زمین پر دے پٹکا۔ دونوں نے منڈکڑی کھائی اور جب سنبھلے تو یکایک یہ نظر آیا کہ ترائی والے کی پیٹھ زمین سے لگ گئی ہے اور گگرا اُسپر چڑھا بیٹھا ہے۔ اُسوقت بادشاہ نے بہت خوش ہو کر باوازِ بلند فرمایا کہ ”شاباش۔ گگرا شاباش!“ اور انگریزی میں کئی آوازیں ایک ہو کے نکلیں کہ ”گگرا بازی لیگیا“۔ لیکن گگرا کی یہ جیت عارضی اور برائے نام تھی۔ گگرا کے پچھلے پاؤں کے پنجے ترائی والے کے پیٹ میں گھسے ہوئے تھے اور ترائی والے نے جو اپنے حریف کو منھ سے مضبوط پکڑے ہوئے تھا زور سے ایک طمانچہ اگلے دست سے گگرا کے چہرے پر رسید کیا اور اُسکے پنجے گگرا کی آنکھوں میں دھنس گئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکی ایک آنکھ حدقۂ چشم سے باہر نکل پڑی۔ اس درد کی وجہ سے گگرا نے زور سے چیخ ماری اور اپنے حریف کو چھوڑ دیا۔ اور خود بھی اُسکی گرفت سے جدا ہونے کی بیحد کوشش کی مگر حریف کے آگے اُسکی ایک نہ چلی۔ اُسوقت ترائی والے نے نہایت چستی سے گگرا کے گلے میں اپنے دانت پیوست کر دیے لیکن گگرا زور کر کے اُسے میدان میں چند قدم گھسیٹ لے گیا۔ اور اگرچہ اُسنے اپنے تئیں اُسکے پنجے سے چھڑانے کی بڑی کوشش کی مگر بالکل رائگاں گئی۔ اُسوقت یکایک نہایت تیزی سے ترائی والا نیچے سے اُٹھا اور اُچھلکے گگرا پر چڑھ بیٹھا۔ اب گویا لڑائی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ گگرا اپنے دشمن کے نیچے پڑا تھا۔ اور بالکل بے قابو ہو گیا تھا۔ اُسکے تمام جسم سے برابر خون بہ رہا تھا اور اب اُسمیں یہ سکت نہ تھی کہ پھر کچھ زور لگائے۔ ترائی والے نے اپنے پنجے سے حریف کا جبڑا ہٹا کے اور اُسکا منھ پھیر کے اپنے دانت اُسکے حلق میں پورے طور پر دھنسا دیے۔ اُسوقت گگرا بالکل بے بسی کے عالم میں بہت کچھ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور اپنے طمانچوں سے ترائی والے کی کھال نوچے ڈالتا تھا کیونکہ اس سے زیادہ اب وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ اُسکے منہ کی گرفت چھوٹ چکی تھی حریف کے پنجے میں سب طرف سے پھنسا پڑا تھا اور بدن سے خون نکلا جا رہا تھا۔ اب لوگوں نے انگریزی اور ہندوستانی زبان میں غل مچانا شروع کیا کہ ”گگرا ہار گیا“۔ بادشاہ نے بھی فرمایا کہ ”بیشک۔ ہار گیا“۔ اور ملازمین کو حکم دیا کہ گگرا کے کٹہرے کی کھڑکی کھولو اور ترائی والے کو ہٹا دو۔ چنانچہ سُرخ سُرخ گرم سلاخیں کٹہرے کے باہر سے ڈالکر فاتح جانور کا جسم داغا گیا قبل اسکے کہ وہ خود علیحدہ ہو۔ اس سارے تماشے میں یہ حرکت نہایت ظالمانہ تھی۔ لیکن گگرا کی جان کے واسطے کوئی دوسری تدبیر اس کے سوا ممکن بھی نہ تھی۔ وہ بیچارا بالکل ہزیمت خوردہ اور دل شکستہ تھا فوراً کٹہرے کے اندر گھس گیا۔ اُسکی ہزیمت کے نشان میدان میں تھے یعنے اُسکا خون زمین پر پڑا تھا جو اُس کی یاد دلا رہا تھا۔ اور وہ اپنی پچھلی ٹانگوں میں دم دبائے تھا۔ لیکن اسی بھاگنے

میں بھی اُسکی آن بان قائم رہی۔ وہ بھاگا تو گھوڑے کیطرح سیدھا ہوکے زور سے نہیں بھاگا بلکہ آہستہ آہستہ دبے پاؤں بلی کی چال۔ اگرچہ تعاقب سے باز رکھنے کی غرض سے جلتی ہوئی سرخ سرخ سلاخیں ترائی والے کے سامنے کردی گئی تھیں تاہم وہ اپنے ہزیمت خوردہ حریف کو گھور رہا تھا اور قبل اس کے کہ لگڑا اپنے کٹہرے میں داخل ہو اُس نے ان سلاخوں پر ایکبار اور جست کی کہ حریف پر پھر حملہ کرے۔ لیکن حریف تک نہ پہونچ سکا۔ جلدی سے لگڑا اپنے کٹہرے میں جا کے ایک کونے میں دم دبا کے پڑ رہا۔ اور ترائی والا آخر وقت تک برابر تیز نظروں سے اُسکو دیکھتا اور غراتا رہا اُسنے ذرا دیر کے لیے بھی اُدھر سے نظر نہ ہٹائی۔ پھر دو تین مرتبہ پھریری لیکے اور اپنے پنجے چاٹ کے وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور مستانہ چال سے اپنے کٹہرے کی طرف چلا۔ جو کھلا ہوا سامنے رکھا تھا۔ اُسکے زخمی شانوں سے بڑے بڑے قطرے خون کے ٹپک رہے تھے اور وہ ایسی شان سے جاتا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی ہمت و جانبازی سے بازی لے گیا۔

باب یازدہم

بڑے بھاری بھرکم جانوروں کی جوڑ

اتبک میں نے چڑیوں۔ بارہ سنگھوں اور چیتوں کی معمولی لڑائی کا حال تحریر کیا ہی۔ اب میں اُنسے بھی زیادہ گران ڈیل۔ تنومند اور غضبناک جانوروں کی لڑائی کی کیفیت لکھتا ہوں منجملہ اُنکے اونٹوں کی لڑائی ہی جس سے بڑھکے وحشیانہ جنگ تصور میں نہیں آسکتی۔ لکھنؤ میں اونٹ باہم لڑائی کے واسطے سکھائے جاتے ہیں لیکن قدرت نے اس جانور کو بکار آمد اور صلح جو پیدا کیا ہی اور جنگجوئی کی کوئی شان اُسمیں نہیں ہی۔ چنانچہ جب حضرت انسان کو اپنے حظ نفس کے واسطے اُنکو جنگجو بنانے کی غرض سے جد و جہد۔ بلیغ کرنا پڑتی ہی تو اس تبدیلی فطرت کی سعی لاحاصل عجب مضحکہ انگیز ہوتی ہی۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پیرو کے کوہ آتش فشاں کیطرح اونٹ اپنے گلے سے حریف پر جھاگ کی بوچھار کردیتا ہی۔ مگر میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہی کہ جو اونٹ لڑائی کے واسطے سکھائے جاتے ہیں پیٹ بھر کے جھاگ اُڑاتے ہیں اور یہ سیر نہایت خوفناک ہوتی ہی۔ کیونکہ ایک اونٹ کا اپنے دانتوں میں دوسرے کا لانبا لانبا ہونٹھ سفاکی سے دبا کر کھینچنا۔ کسی نہج سے خوشنما نہیں معلوم ہوتا۔ ان لڑائیوں کا یہ انجام ہوتا ہی کہ یا تو چہرہ پھاڑے سے منہ اور بھی بے قوارہ ہو جاتا ہی۔ یا آنکھ پر آئی گئی ہو جاتی ہی۔ مگر خیریت

یہ ہوتی ہو کہ لانبا بے ڈول بدن ہر ایک قسم کے صدمے سے محفوظ رہتا ہی۔

گینڈا ابھی بالخلقت ایک صلح پسند جانور ہے۔ بشپ ہیبر صاحب لکھتے ہیں کہ "معز غازی الدین حیدر کے عہد میں گینڈا گاڑی میں جوتا جاتا تھا اور اسکی پشت پر ہودہ بھی کھینچا جاتا تھا"۔ مگر میں نے گینڈے کو اس حیثیت سے کبھی نہیں دیکھا۔ اگرچہ یہ جانور فطرتاً صلح جو ہی لیکن اونٹ کے مقابلے میں پھر بھی لڑائی کے واسطے زیادہ موزوں ہی۔ اسکا قرولی ایسا سینگ۔ اسکی فولاد سے زیادہ مضبوط کھال۔ اسکا بھاری بھرکم جسم اور اسکے قوی دست و بازو۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جنکے بل پر وہ بڑے سے بڑے جانوروں کا مقابل ہوجاتا ہی اور اُن کے لیے بھی ہیبتناک ہوتا ہی۔ اور جب وہ جوش میں آجاتا ہی اُسوقت اگر اسے ہپّپا پوٹمس[1] یا ہاتھی کے مقابلے میں چھوڑ دیں تو بیشک وہ اُن سے بھی لڑ سکتا ہی۔

شاہ اودھ کے وحش خانے کی عظمت اس امر سے صاف ظاہر ہے کہ میرے زمانہ ملازمت میں وہاں پندرہ بیس گینڈے تھے۔ اور وہ چاندگنج کے ایک رمنے میں چھوٹے اور تھوڑی دور تک پھیرا لگاتے رہتے تھے۔ اکثر تو اسی چاندگنج میں اور کبھی کبھی مبارک منزل میں دریا کے کنارے موذی جانوروں کی لڑائی ہوا کرتی تھی کیونکہ اس مقام پر اس غرض خاص سے بڑے بڑے میدان محاط کرلیے گئے تھے۔ میدان کے ایک طرف ایک برآمدہ دو منزلہ اسطور پر بنایا جاتا تھا کہ جیسے کلکتہ میں تھیٹر اور لندن میں کمتر کوٹھیوں کے سامنے گاڑیاں کھڑی ہونے کے واسطے برآمدے نکلے ہوتے ہیں۔ اور اسکے بالا پر سے بادشاہ سلامت اور سب لوگ تماشہ دیکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی یہ لڑائیاں کھلے ہوئے سبزہ زار میں بھی ہوا کرتی تھیں جنکے گرد بڑے بڑے مضبوط ستون قائم کرکے انپر مچان یا پاڑ باندھ لیتے تھے اور اسکی قطع برآمدے کی ایسی قائم کردیتے تھے اور وہیں بیٹھ کے لوگ تماشہ دیکھتے تھے۔ گینڈوں کی لڑائی یوں ہوتی تھی کہ ہاتھیوں کیطرح مخصوص موسم میں دو گینڈوں کو مقوی اور مستی چیزیں کھلا پلا کے تیار کرتے تھے اور یا تو احاطہ کے اندر ایک ایک سمت مقابل سے چھوڑ دیتے تھے یا سبزہ زار میں آمنے سامنے کرکے ہنکا دیتے تھے۔ اور نہایت ہوشیار و چالاک سوار ہاتھوں میں نیزے لیے دونوں کو کھدیڑ کھدیڑ کرکے دونوں طرف سے ایک دوسرے کے مقابل لاکھڑا کردیتے تھے۔ جسوقت دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اسیوقت انہیں حملہ کرنے کی آمادگی پیدا ہوجاتی تھی کیونکہ بو سونگھنے سے انہیں فوراً معلوم ہوجاتا تھا کہ حریف مقابل نر ہے یا مادہ۔ پھر وہ اپنی گردن نیچی کرکے جھپٹ پڑتے ہیں اور سور کیطرح اپنی پیشانی جو خاردار بھی ہوتی ہو۔ باہم بھڑا دیتے ہیں۔ اُنکی ٹانگوں اور پیٹھ

---

[1] دریائی گھوڑا۔ یہ بدشکل اور موٹا تازہ جانور ہی اور آگے دو دانت دو فٹ کے قریب نکلے ہوتے ہیں۔

کی کھال ایسی دبیز ہوتی ہی کہ قرولی نما سینگ سے کوئی خراش تک بھی اُسپر نہیں پڑتی۔ البتہ اس تیز سینگ سے اُن کے نازک پیٹ یا ٹانگوں کے بیچ کی کھال پر کاری زخم لگ جاتے ہیں چنانچہ اُسی کی حفاظت کی غرض سے وہ جھپٹتے وقت سر جھکا لیتے تھے کیونکہ اُسمیں دونوں مقاصد نکل سکتے ہیں یعنے اپنی حفاظت بھی ہوتی ہی اور اس کا بھی موقع مِلسکتا ہے کہ حریف کی ٹانگوں کی بیچ کی کھال پر سینگ پہونچ جائے اور چیر پھاڑ ہو سکے اور اگر کبھی ایسا موقع ملجاتا ہی تو ایک ذرا سے اشارے میں سینگ سے کھال پھٹ جاتی ہی۔ چونکہ ہر حریف کو ایسے موقعے کی تلاش رہتی ہے اسوجہ سے اکثر یہی ہوتا ہے کہ پہلے اُن کے سر اور پیشانی باہم ٹکرا جاتے ہیں اُسوقت خوب ٹکر بازی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو ریلتا ڈھکیلتا ہی۔ سر کو نیچا کر کے دھکم دھکا کرتا ہی اور دونوں اس زور سے غرانے اور سینگ سے سینگ ٹکراتے اور اس قدر چالاکی اور قوت صرف کرتے ہیں کہ دیکھنے والو کو حیرت ہوتی ہی کہ ایسے بھاری بھر کم جانور یہ کچھ کر سکتے ہیں۔ بالآخر دونوں سینگ سے سینگ تھوتھنی سے تھوتھنی اور سر سے سر ملا کے گتھ جاتے ہیں اور سر اس وجہ سے ملائے رہتے ہیں کہ ایک دوسرے کو ٹانگوں کے بیچ میں یا پیٹ میں سینگ دھنسانے کا موقع نہ دے۔ اُسوقت سخت زور آزمائی کے ساتھ باہم دھکم دھکا و مسلسل ریل پیل شروع ہو جاتی ہی اور ہر ایک اپنے بدن کا سارا بوجھ دوسرے پر ڈالتا ہی اور اُسی کے ساتھ پورے جسم کا زور جو قدرت نے عطا کیا ہی دوسرے پر صرف کرتا ہی۔ اور اسی طرح ہر ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا چلا جاتا ہی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ کمزور اپنی جگہ چھوڑنے لگتا ہی اور پہلے تو وہ آہستہ آہستہ قدم بقدم کھسکتا اور پھر بڑے زور سے بھاگنے لگتا ہے اور یہ حالت دیکھکے زور آور حریف اور بھی تیزی و تندی دکھاتے اور گرما گرمی سے پیاپے حملے کرنے لگتا ہی۔ حتی کہ بیچارا کمزور تاب مقاومت نہ لاکر زور سے اپنا سینگ اور سر الگ کر لینے کو پیچھے ہٹتا ہی۔ بس یہی وقت لڑائی کے تصفیہ اور زور آزمائی کے خاتمے کا ہوتا ہے میں نے اُسکو مختلف طریقوں سے ختم اور فیصل ہوتے دیکھا ہی۔ یعنے اگر رمنہ محاط ہوتا ہے تو کمزور کو زیادہ بھاگنے کا موقع نہیں رہتا اور اُسکا حریف غالب یقیناً اسکو بہت اچھی طرح زخموں سے چور کر ڈالتا یا مار ڈالتا ہی اور اُسکے بعد فاتح کو سوار لوگ برچھیوں اور گرم سلاخوں سے الگ کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر کھلا میدان ہوتا ہی تو کمزور اگر چالاک ہی تو جی توڑ کے جھپے بھاگتا چلا جاتا ہی اور بعض اوقات بھاگ نکلتا ہی اور اُسکو کوئی گزند نہیں پہونچتا۔ البتہ زور آور اُسکا سخت تعاقب کرتا ہی حتی کہ دونوں گینڈے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں ایسی حالت میں زمین کی نوعیت اور دونوں کی ہوشیاری و چالاکی پر نتیجہ منحصر رہتا ہی۔ کیونکہ تعاقب کنندہ نے پکڑ پایا تو مفرور کی جان کا خدا ہی حافظ و نگہبان ہوتا ہی

بیچارے کے سینے میں ایک فٹ گہرا زخم ہو جاتا ہی اور اُسکے صدمے سے اُسکی جانبری دشوار ہوتی ہی۔ البتہ ایک مرتبہ اور صرف ایک مرتبہ میں نے اُسکے خلاف کیفیت دیکھی یعنے لڑتے لڑتے کمزور گینڈا پہلے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا چلا جا رہا تھا بعد کو زور سے پیچھے کیطرف بھاگا اور اپنے حریف سے الگ ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ میدان سب طرف سے کھُلا تھا۔ دفعتہً حریف غالب مغلوب کی اس حرکت سے متحیر سا ہو کے گردن اوپر اٹھا کے دیکھنے لگا اور مغلوب اگرچہ اب تک جان لیکے بھاگ نکلنے پر تُلا ہوا تھا لیکن موقع پا کے فوراً رُک گیا اور گردن نیچی کر کے حریف غالب کی دونوں رانوں کے بیچ میں اُسنے اپنا سر ڈالدیا اور اپنے سینگ سے اُسکا سینہ شق کر ڈالا چنانچہ حریف غالب کے جسم سے خون کے بہنے اور اُسکی دردناک چیخنے سے خلاف امید اُس مغلوب کی فتح و نصرت بجائے شکست کے تسلیم کی گئی جو ابھی ذرا پیشتر بالکل زمین چھوڑ رہا تھا۔ بلکہ امید تھی کہ اب زخمی گینڈا بھاگ نکلا۔ اُسکے بدن سے خون نکلا جا رہا تھا اور زخم کے منہ سے انتڑیاں تک نکلی پڑتی تھیں۔ حریف نے اسکو موقع پلٹ پڑنے اور چند قدم بھاگنے کا دیا۔ لیکن جیسے ہی زخمی گینڈا چلا کہ اُسکے حریف نے جھپٹ کر اپنا سینگ اُس غریب کی پچھلی ٹانگوں کے اندر ڈالدیا اور زخموں سے اُسے بالکل ہی بیکار کر ڈالا حتے کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ بعد کو سواروں نے برچھیوں سے فاتح کو بھگا دیا۔ میں نے اُسکی تحقیقات نہیں کی کہ پھر زخمی گینڈا مر گیا یا زندہ رہا۔ اُس زمانے میں غالباً کسی سے کچھ سنا ضرور ہوگا مگر اب وہ بھی یاد نہیں۔ ممکن ہی کہ ان زخموں سے وہ اچھا ہو گیا ہو یہ کچھ بعید نہیں ہی۔ کیونکہ وہ ہندوستانی جوان جانوروں کی خدمت اور پرورش پرداخت کرتے ہیں ان معاملات اور معالجات میں بڑے ہوشیار سلیقہ شعار ہوتے ہیں۔

گینڈے اور ہاتھی کی لڑائی ایسی دلچسپ نہیں ہوتی جیسی گینڈے اور چیتے کی لڑائی گینڈے اور ہاتھی کی لڑائی باوجودیکہ دونوں مست ہی کیوں نہوں کچھ آسان امر نہیں ہی۔ اگر کبھی دونوں کو لڑنے کا اتفاق پیش آتا ہی اور دونوں حملہ آوری پر آمادہ و مستعد ہو جاتے ہیں تو بیشک بہت سخت زور آزمائی جانبین سے ہوتی ہی۔ ہاتھی اپنی سونڈ اُٹھائے۔ منہ لٹکائے۔ ایکطرف سے اور گینڈا اپنا سر جھکائے دوسری طرف سے مقابلے کو جھپٹتا ہی۔ ہاتھی کے دونوں دانت گینڈے کے دونوں پہلوؤں میں گڑ جاتے ہیں لیکن زیادہ نقصان نہیں پہونچاتے۔ پھر ہاتھی۔ اپنی چوڑی پیشانی سے گینڈے کو پیچھے ریلتا ہی۔ اگر کبھی شاذ طور پر ہاتھی کے دانت گینڈے کی کھال میں پیوست ہو گئے تو یہ دھنسنا بے پناہ ہوتا ہی۔ پھر اُس غریب کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اکثر

یہ دیکھا گیا ہی کہ گینڈا اپنا تیز سینگ ہاتھی کی اگلی رانون کے درمیان میں ڈال کے اُسکی کھال چیر ڈالتا ہی۔ اور ہاتھی اگرچہ اپنی سونڈ سے موقع بچاتا رہتا ہی۔ لیکن بچتا نہیں۔ البتہ اُس کی سونڈ کی وجہ سے گینڈا مجبور ہو جاتا ہی کہ اپنا سینگ اُسکے جسم میں دور تک نہیں پہونچا سکتا۔ اور یہی وجہ ہوتی ہی کہ ہاتھی کو جو زخم لگتا ہی وہ کچھ مہلک نہیں ہوتا۔

گینڈے اور تیندوے کی لڑائی البتہ بڑی جاندار اور گرماگرم ہوا کرتی ہی۔ بڑے جانور کا اپنی مضبوط اور مستقل سامان حفاظت سے اپنا بچاؤ کرنا۔ چھوٹے جانور کا دبے پاؤں اور بلی کی چال چلکے پھر جھپٹنا اور حملہ کرنا۔ ایک کی جھکی ہوئی پیشانی اور تیز سینگ۔ دوسرے کے نکیلے دانت۔ ایک کے پاس بل کھائے ہوئے سینگ کا حفاظت کی غرض سے ہونا۔ دوسرے کے پاس گول گول سر اُسمیں چمکتی ہوئی آنکھیں اور آنکھوں میں خارا شگاف تار نظر۔ اور پھر مزید براں خاردار پنجہ۔ یہ چیزیں ایسی تھیں جنپر سبکی نگاہیں جمی رہتیں اور بڑی دلچسپی سے جمی رہتیں۔ گینڈے کی پیٹھ ہر قسم کے حملے سے محفوظ رہتی ہی۔ جب تیندوا اُسپر زقند بھر کے اپنے پنجے سے طمانچہ مارتا ہے تو اُسکے بدن پر ذرا خراش تک نہیں آتی۔ اگرچہ تیندوا اُسے چت لٹا کے اُسکی پیٹ کی کھال اپنی پنجوں سے پارہ پارہ کرکے مار ہی ڈالتا ہی۔ میں نے ایسے نتائج کا حال تو ضرور سنا ہی لیکن آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا کیونکہ یہ شاذ ہی ورنہ فیصدی ننانوے لڑائیوں میں گینڈا ہی غالب رہتا اور ظفرمند نکلتا ہی۔ اور اسکی صورت یہ ہوتی ہی کہ تیندوا اُسپر بار بار جھپٹتا اور طمانچے چلاتا ہی لیکن اُسکے زرہ پوش بدن پر اُس کا کچھ بس نہیں چلتا اور کوئی حربہ اس آہنی قلعے میں اثر نہیں کرتا۔ جب وہ حملہ کرتے کرتے تھک جاتا ہی تو گینڈا کسی طور پر موقع پاکے اپنا جھکا ہوا تیز باڑھ دار سینگ اُسکی کھال کے اندر کر دیتا ہی تیندوا چونکہ حملہ کرنے کی جانب سے بے پروا اور لڑائی سے دست بردار ہو چکتا ہی۔ لہذا جسوقت گینڈا اُسپر حملہ کرنے لگتا ہی وہ آسانی سے بھاگ نکلتا ہی۔

دنیا میں کوئی جانور ایسا نہیں ہی جو گینڈے کیطرح استقلال و پامردی اور اطمینان و سنجیدگی کیساتھ حریف کے حملوں اور ضربوں کی برداشت کر سکتا ہو جب اُسے ایک شیر کے ساتھ کسی چھوٹے سے احاطے میں چھوڑ دیتے ہیں اُسوقت بھی وہ کسی جگہ سے بے چین اور پریشان نظر نہیں آتا وہ کہیں سے بدحواس اور مضطر نہیں ہوتا بلکہ بڑی طمانیت و دلجمعی کے ساتھ ہر بلا سے سامنا کرنے اور ہر مصیبت کے جھیلنے کو کھڑا ہو جاتا ہی۔ سچ یہ ہی کہ اُسکی مضبوط زرہ کی ایسی مستحکم کھال قدرتی طور پر اُسکی حفاظت کی سپر ہوتی ہی۔ اُسکے چہرے کی ساخت بھی اس قسم کی ہی کہ اُسپر بھی کوئی حملہ اثر نہیں کر سکتا۔ تھوتھنی سے

لیکر ماتھے تک اُسکا چہرہ بیٹھا سا ہوتا ہی اور آنکھیں بڑی بڑی اُٹھی ہوئی ہڈیوں کے حلقے میں ایسی اندر کو گھسی ہوئی ہوتی ہیں کہ اُنپر کوئی حربہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ اُسکا چھوٹا خمدار سینگ بھی بجاے خود ایک آلہ حفاظت خود اختیاری کا ہی اور دوسرے جانوروںکے (درانحالیکہ گینڈے کی جسمانی طاقت پر نظر کیجاتی ہی) حق میں ایک خطرناک حربہ با اینہمہ جسوقت یہ اپنے سے زیادہ قوی الجثہ و غضبناک جانوروں کے (جیسے ہاتھی یا شیر) مقابلے میں کھڑا ہوتا ہی تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہی۔ میں نے گینڈے کا مقابلہ کبھی شیر ببر سے ہوتے نہیں دیکھا۔ کیونکہ شاہ اودھ کے ہاں صرف تین چار شیر ببر تھے۔ اور وہ خاص مواقع کے واسطے لگا رکھے گئے تھے۔ لیکن مجھے اسمیں ذرا شبہہ نہیں کہ شیر اور گینڈے کی لڑائی بالکل تیندوے اور گینڈے کی ایسی ہوتی ہوگی۔ کیونکہ دو شیر اسی طرح لڑتے ہیں جیسے دو چیتے یا تیندوے لکھنؤ میں کوئی شیر ایسا نہ تھا جو وہانکے سب سے بڑے تیندوے سے ہمسری کر سکتا بیشک ہمالیہ کے شمال و غرب میں اور بالعموم ایشیا میں جیسے دو ایک شیر ملجاتے ہیں ویسے افریقہ میں نہیں ملتے لیکن مجھے اس بارے میں بہت شک و شبہہ ہی کہ بنگال کا تیندوا شیر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہی۔ جیسے بڑے تیندوے میں نے لکھنؤ میں دیکھے اُنکے مقابلے کا کوئی شیر بھی لندن یا پیرس میں میری نظر سے نہیں گزرا۔

منجملہ ڈیڑھ سو لڑائی کے ہاتھیونکے جو شاہ اودھ کی سرکار میں تھے ایک ہاتھی صرف ایک دانت کا ایسا زور آور اور کوہ پیکر تھا کہ تنہا اُسنے سو مرتبہ لڑائی میں فتح حاصل کی تھی۔ اس ہاتھی کا نام ملیر تھا اور بادشاہ سلامت اُسے بیحد عزیز رکھتے تھے۔ اسکا ایک دانت بہت سی مختلف لڑائیوں میں بتدریج بالکل ٹوٹ گیا تھا کیونکہ ہاتھی اپنے دانتوں سے اس زور سے لڑتے ہیں کہ کبھی دانت کا ایک ٹکڑا اور کبھی مسلم دانت اس زور آزمائی کے نذر ہو جایا کرتا ہی۔ چنانچہ ملیر کا دانت بھی تھوڑا تھوڑا کرکے ٹوٹا تھا۔ ملیر جب جوش میں ہوتا تھا (جسے مستی سے تعبیر کرتے ہیں) تو اُسوقت وہ بیحد خطرناک ہو جاتا تھا۔

جس زمانے میں صاحب کمانڈر انچیف افواج انگلشیہ تشریف فرماے لکھنؤ ہوے تھے بادشاہ نے یہ تجویز کیا کہ ملیر کے مقابلے کیواسطے کوئی ہاتھی پیش کیا جائے اور ایک بار اور ملیر کی لڑائی ہو۔ اتفاق کی بات کہ اُس زمانے میں ملیر بھی مست تھا اور ایک اور سیاہ رنگ کا بڑا زبردست ہاتھی بھی مست ہو گیا تھا۔ ان دونوںکا جوڑ بدا گیا۔ اور لڑائی طے ہو گئی مستی کی حالت میں دونوں ہاتھی ایک دوسرے کو دیکھتے ہی آمادۂ جنگ ہو جاتے ہیں انھیں کسی ترغیب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر ہاتھی کی گردن پر اُسکا مہاوت بیٹھا ہوتا ہی اور سواے مہاوت کے

کسی اور کی مجال نہیں ہوتی کہ مستی کی حالت میں اُسکے پاس پھٹک سکے اور اس حالتِ بے اختیاری و غضبناکی میں بھی وہ بچوں کی طرح پوری طور پر مہاوت کے قابو میں ہوتا ہی۔ ہاتھیوں کی لڑائی کے واسطے کچھ زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف ایک مضبوط رسی ہاتھی کی گردن سے لیکر اُسکی دم میں باندھ دیتے ہیں۔ اور لڑائی کے وقت مہاوت اسی رسی کو تھامے ہوے ہاتھی کی گردن پر جا بیٹھا رہتا ہی۔ یہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہی کہ لڑائی کے وقت بیچارے مہاوت کی جان کیسی سخت خطرے میں پڑ جاتی ہی۔ مگر وہ اپنے ہاتھی اور نیز خود اپنی نمود اور ناموری کا ایسا دلدادہ ہوتا ہی کہ اُسکی دلی تمنا یہی ہوتی ہی کہ اسی کا ہاتھی لڑائی کے واسطے انتخاب کیا جاے اور وہ کسی طرح اس جوکھم سے نہ منھ چھپاتا ہی نہ جان چراتا۔ کیونکہ اسمیں جو کچھ نمود ہوتی ہی مہاوت اور ہاتھی دونوں کی ہوتی ہی۔ اگر اتفاقاً مہاوت اپنے ہاتھی پر سے گر پڑتا ہی تو حریف ہاتھی موقع پاتے ہی اُسکی جان ہی لے ڈالتا ہی۔ اسلیے وہ نہایت ہوشیاری سے رسی پر گھومتا پھرتا ہی۔ اور اس مضبوطی سے رسی پکڑتا ہی جیسے کسی جہاز شکستہ کے تختے کو ڈوبتا ہوا آدمی۔

جس زمانے میں صاحب کمانڈر انچیف کی خاطر یہ تماشہ دکھلایا گیا تھا تو ہم سب مع بادشاہ سلامت اور اُنکے درباریوں کے دریاے گومتی کے کنارے ایک کوٹھی میں جاکے بیٹھے تھے۔ ایک جانب دریاے گومتی کے پایان باندھکے برآمدہ نکالا گیا تھا اور دوسرے کنارے پر رمنہ تھا یہ طے ہوا تھا کہ لڑائی وہیں ہو اور ہم لوگ برآمدے سے سیر کریں۔ گومتی کا پاٹ اس مقام پر فلیٹ اسٹریٹ (لندن) کے برابر چوڑا تھا اور چونکہ برآمدہ سطح آب پر نکلا ہوا تھا لہذا ہم لوگ بہت ہی قریب سے لڑائی کا تماشہ دیکھ سکتے تھے دوسری جانب رمنے میں جہاں تک آنکھ کام کرتی تھی برابر سبزہ زار نظر آتا تھا۔ اور کوئی چیز حجاب نہ تھی۔

بادشاہ کے اشارہ فرمانے پر دونوں طرف سے ہاتھی (جن پر مہاوت سوار تھے) چھوڑے گئے

ایک ونما ظیر اپنے حریف کے مقابلے میں زیادہ گراں ڈیل نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اُسکے دانت بہت زبردست تھے جسوقت ہاتھیوں کی نظر دوچار ہوئی اپنی اپنی سونڈ اور دُم اٹھاکے بے تحاشا ایک دوسرے پر حملہ کرنیکے واسطے دوڑے۔ بالعموم ہاتھیوں کی لڑائی اسی عنوان سے شروع ہوتی ہی۔ وہ اپنی سونڈ سیدھی اُٹھا لیتا ہی تاکہ اسپر کچھ گزند نہ پہونچے اور حالت غیظ و غضب میں اُسکی دُم بھی اسی طرح اٹھی ہوتی ہی اور اسکی چنگھاڑ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہوتی ہی۔

ملہر اور اُسکے حریف میں پہلے بڑے زور سے ٹکر بازی ہوئی مستک سے مستک اس زور سے لڑتی تھی کہ ٹکروں کے دھماکے کی آواز آدھے میل کے فاصلہ پر اچھی طرح سنائی دیتی تھی پہلی ٹکر بازی ہو چکی

تو دونوں ہاتھیوں نے منھ سے منھ اور دانت سے دانت ملا کے زمین پر قدم مضبوط جما دیے صرف سونڈیں جو اوپر کو سیدھی اُٹھی ہوئی تھیں الگ رہیں اور دھکم دھکا ریل پیل شروع ہوئی۔ یہ ریلا پیل مسلسل ہوتی تھی اُنکے سر ایک لمحہ بھر کے واسطے بھی جدا نہیں ہوتے تھے البتہ اُنکی پیٹھیں زور کرتے کرتے کبھی خم ہو جاتی تھیں اور کبھی تن جاتی تھیں جس سے اُنکی زور آزمائی اور ہمہ تن مصروفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ دونوں کے مہاوت گردنوں پر بیٹھے ہوئے اپنی ہوشیاری اور کمال دکھا رہے تھے۔ آنکسوں کے ہولے زور زور سے لگاتے اور چلا چلا کے اپنے اپنے ہاتھی کو جرأت اور جوش دلا رہے تھے۔ یہ تماشہ دیکھکے ہر تماشائی سناٹے کے عالم میں ہو جاتا تھا اور اُس کا خون رگوں میں جوش مارنے لگتا تھا۔ یہ عجب سماں پیش نظر تھا کہ ایسے کوہ پیکر جانور کیسا جی توڑ کے ایک دوسرے کو ریل رہے ہیں اور ہوشیار و تجربہ کار مہاوت کس قدر شد و مد سے اپنے ہاتھیوں کو لڑنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

ایسی لڑائی کا معمول ہے کہ زور آور جانور ہمیشہ بازی لیجاتا ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی اتفاق پیش آجاتا ہے کہ زور آور اپنے ہی جھونک میں نیچے آرہتا ہے اور کمزور فتح پا جاتا ہے۔ مگر ایسے اتفاقات شاذ ہیں۔ اور بہ نسبت اور جانوروں کے ہاتھیوں کی لڑائی میں اور بھی کم ایسا اتفاق ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ پوچھے کہ آخر اس دھکم دھکا ریلا پیلی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ تو اُسکا سہل جواب یہ ہے کہ جب زور آور کمزور کو دھکے دیکر گرا دیتا ہے تو اکثر اوقات کمزور کی جان ہی پہ بنجاتی ہے۔ لیکن یہ اکثر اُسوقت ہوتا ہے جب بہت تیزی و تندی صرف کیجاتی ہے اور عجلت کے ساتھ پیاپے حملے ہوتے ہیں اور کمزور کو بتعجیل تمام پیچھے بھاگنے کا کوئی موقع نہیں ملسکتا۔ پس دل سے امید اور بدن سے طاقت دونوں ایک ہی وقت رخصت ہوتے ہیں اور وہ بیچارہ گھبرا گھبرا کے ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش میں پڑتا ہے پس جدھر پھرتا ہے اُدھر ہی سے حریف اُسے دھکے دیکے دباتا ہے۔ آخرکار وہ چوندھیا جاتا اور بیطرح گر پڑتا ہے۔ اور بیرحم حریف اُسکے پہلو میں اپنے دانت دھنسا کر اُسکی جان لے ڈالتا ہے۔ لیکن اگر کمزور کسیطرح پھرتی سے مڑکے اپنی جان لیکے بھاگ جاتا ہے تو بازی زور آور کے ہاتھ رہتی ہے اور حتی المقدور وہ مغلوب کا تعاقب کرتا ہے اور اگر مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو مستک سے خوب ٹکریں مارتا اور دانتوں سے بالکل زخمی کر دیتا ہے۔ یہ جملہ معترضہ تھا اب ملیر کی داستان سنو۔

ملیرا اور اُسکا حریف برابر زور آزمائی میں مصروف اور اپنی اپنی جگہوں پہ پامردی و استقلال کے ساتھ جمے ہوئے تھے۔ اور بادشاہ سلامت صاحب کمانڈر انچیف۔ صاحب رزیڈنٹ اور ہم سب

نہایت غور و تامل سے دم بخود اس زور آزمائی کا تماشہ برآمدے پر سے دیکھ رہے تھے۔ برآمدے پر سکوت و محویت بلکہ بیخودی کا عالم طاری تھا۔ رفتہ رفتہ ہمنے دیکھا کہ اک دنتا ملیر اپنے حریف پر قابو پانے لگا۔ اسکا اگلا پانوں نہ معلوم آگے بڑھنے کو یا پیچھے بھاگنے کو زمین سے اُٹھ گیا۔ لیکن ابھی وہ بڑی مصروفیت سے زور آزمائی کر رہا ہی۔ ایک لمحہ کے بعد فوراً کھل گیا کہ یہ پانوں آگے بڑھنے کو نہیں اُٹھا تھا بلکہ بھاگنے کی غرض سے کیونکہ ابھی یہ پانوں زمین پر رکھا نہیں گیا تھا کہ دوسرا اگلا پانوں بھی زمین پر سے اُٹھا مگر پھر زمین پر آگیا۔ ملیر کے مہاوت کی نظر اس حرکت پر پڑی۔ وہ فوراً تاڑ گیا اب اُس نے پہلے سے زیادہ بے تکان غل مچانا شروع کیا اور بڑی زور زور سے ملیر کے سر پر آنکس مارنے لگا۔ اُسوقت ملیر کو جوش دلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ بوڑھا خرانٹ تھا اپنے داؤں گھات خوب سمجھتا تھا۔ اُسے خود معلوم ہو چکا تھا کہ اب فتح و نصرت کا سہرا اُسکے سر بندھا چاہتا ہی اور اس خیال سے اُسکی ہمت بلند ہو چکی تھی۔ اور مہاوت کیطرح اُسکا دل بانسوں بڑھ رہا تھا۔ اُسوقت دونوں ہاتھی ساحل سے چند گز کے فاصلے پر تھے اور ہزیمت خوردہ ہاتھی آہستہ آہستہ پیچھے کھسکتا ہوا۔ رفتہ رفتہ بالکل لب دریا پہونچ گیا آخر کار دفعتہً اُسنے پچھلے پانوں سے ایک جست کی اور حریف کے پنجے سے اپنے کو چھڑا کے دریا میں کود پڑا۔ اب اُسکا مہاوت رسی پکڑ کے پیٹھ پر پہونچ گیا لیکن تھوڑی دیر بعد پھر اُسکی گردن پر سوار نظر آیا۔ اور ہاتھی پیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہونچا اور بھاگا۔ ملیر کو حریف کے اسطرح بھاگ نکلنے پر بیحد غصہ آگیا۔ اُسکا مہاوت ہزار اُسے پانی میں جانیکی ترغیب دیا کیا مگر اُسنے اُدھر رخ ہی نہ کیا اس پلے پر نہ آیا۔ بلکہ غیظ و غضب کی حالت میں وہ چارطرف اس غرض سے گھومنے اور گھور گھور کے دیکھنے لگا کہ کسپر حملہ کرے اور غصہ اتارے۔ اُسکا مہاوت اب بھی آنکس پر آنکس مارتا اور غل شور مچا کے اُسے اپنے بس میں لانیکی کوشش کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ حریف کا تعاقب کرے۔ اسی کوشش میں تھا کہ ایکبار ملیر نے پلٹا کھایا اور اُسکے گھومتے ہی مہاوت غریب کا آسن اُکھڑ گیا اور وہ دھم سے زمین پر آرہا اور اُسی ہاتھی کے سامنے چاروں شانے چت گر پڑا جسے مار مار کے وہ خود جوش دلا رہا تھا ہم لوگوں کو فوراً یقین ہو گیا کہ اب اس بیچارے مہاوت کی جان کی خیر نہیں۔ وہ اس شان سے زمین پر پڑا تھا کہ ایک پانوں سمیٹے۔ ایک اوپر اُٹھائے اور دونوں ہاتھ نہایت حسرت و بیکسی کے ساتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے۔ کہ دفعتہً ہاتھی نے ایک پانوں اس غریب کے سینے پر رکھدیا اور ہڈیوں کے چٹاچٹ ٹوٹنے کی آواز ہمارے کانوں تک پہونچی اور دو گھڑی میں اُسکی کچلی۔ بدہیبت لاش سامنے نظر آنے لگی۔

اُسے چلّانے غل مچانے۔ داد فریاد کرنے کا بھی موقع نہ ملسکا۔ ہاتھی کی گردن سے جیسے ہی وہ بچارہ دو شانے چت زمین پر گرا ویسے ہی ہاتھی کا پاؤں اُسکے سینے پر پہونچگیا۔ اور آناً فاناً ہڈیاں چرمرا کے رہگئیں۔ لیکن ابھی ہاتھی کا غصہ فرو نہیں ہوا تھا سینے پر پاؤں رکھے ہی رکھے اُسنے اپنی سونڈ سے اُسکا ہاتھ پکڑا اور اُسے شانے سے اُکھاڑ کے پھینک دیا۔ پھر دوسرا ہاتھ پکڑا اور وہ بھی اُسیطرح خون میں لتھڑا ہوا ہوا پر اُڑتا نظر آیا۔ یہ بھی کیا ہیبتناک سماں تھا جسے خیال کرکے اب بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور جسوقت یہ سماں پیش نظر تھا اُسوقت تو جتنے دیکھنے والے تھے سب تھرا اُٹھے تھے۔ مگر اسکا الزام سوا ہاتھی کے اور کسی پر آ نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ کسی اور کی خطا نہ تھی۔ ابھی ہم لوگ تماشے کے اس بد انجام سے متاثر ہی تھے کہ ہمنے دیکھا کہ ایک عورت بڑی زور سے جھپٹتی ہوئی ملیر کی طرف آرہی ہے اور اُسکی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ دبا ہوا ہے۔ یہ دیکھکے ہملوگ اور زیادہ مضطر و بدحواس ہوگئے حتے کہ صاحب کمانڈر انچیف بیتابی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بادشاہ سے کہنے لگے کہ "جاپناہ اور خون ہوا چاہتا ہے۔ للہ خبر لیجیے۔ کیا کوئی تدبیر اسکے روکنے کی ممکن ہی نہیں؟" بادشاہ سلامت فرمانے لگے کہ "کیا کیا جائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ عورت اسی مہاوت کی معلوم ہوتی ہے" لیکن صاحب رزیڈنٹ حکم دیچکے تھے کہ سانٹے مار جلد دوڑیں اور ہاتھی کو ہنکا لائیں۔ اگرچہ یہ حکم دیا گیا تھا مگر فوراً تعمیل دشوار تھی۔ کچھ تو حکم پہونچنے میں توقف ہوا۔ کچھ سواروں کے سوار ہونے اور پانچ پانچ کا پرا باندھکے چلنے میں دیر ہوئی۔ یہ سوار اپنے لانبے برچھونکی انی ہاتھی کی نازک سونڈ سے چھوکر اُسکو ایک طرف ہنکا لایا کرتے ہیں حقیقت میں وہ اپنے فن میں طاق ہوتے ہیں اور اگر ہاتھی اُنکے برچھونکی چوٹ بچا کے مقابلے پر آمادہ ہوجاتا ہے تو وہ نہایت پھرتی اور چالاکی سے گھوڑے کو کودا کے فوراً الگ ہوجایا کرتے ہیں۔

ابھی سانٹے مار جلد جلد سوار ہوکے نہایت ہوشیاری کے ساتھ دو سمتوں سے ہاتھی کے قریب جارہے تھے۔ کہ وہ عورت بڑی دلیری سے بیخوف وخطر ہاتھی کے پاس پہونچگئی اور چلائی کہ "اُسے ملیر۔ ملیر بیدرد۔ جلاد۔ دیکھ تو ہی تو نے یہ کیا غضب ڈھایا ہے اب پوری طرح گھر کا ناس کردے تو نے چھت تو ڈھادی دیواریں باقی ہیں۔ وہ بھی گرادے۔ میرے والی کو تو مار چکا۔ اُسے تو بہت پیار کرتا تھا۔ اب اُسکی رونے والی ایک میں باقی ہوں اور ایک یہ بچہ۔ لے انھیں بھی اُسی کے پاس پہونچا دے" جو لوگ ہندوستان سے ناآشنا محض ہیں اُنکو یہ گفتگو مہمل۔ خرافات اور قابل مضحکہ معلوم ہوگی۔ لیکن قریب قریب یہی الفاظ اس عورت نے اُس رنج وغم میں اپنی زبان سے نکالے تھے

اور عرصے تک اُسکا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ بات یہ ہی کہ مہاوت اور اُسکے بال بچے اپنے ہاتھی کے ساتھ ساتھ رہا کرتے ہیں اور اُسے آدمی کی طرح جھڑکتے۔ خفا ہوتے۔ اور خفا ہوتا ہی تو مناتے۔ اُسکی تعریف یا خوشامد کرتے اور اُسپر اپنا غصہ و خفگی دکھاتے رہتے ہیں۔

یہ حالت دیکھکے ہم لوگوں کو بالکل یقین ہو گیا کہ اب کوئی دم میں ملیر اپنے مہاوت کی پارہ پارہ لاش سے جدا ہو کر اُسکی غریب بیوہ اور یتیم بچے کا بھی خون کر ڈالے گا۔ لیکن ہمارے خیالات بالکل غلط نکلے اور برعکس کیفیت پیش آئی یعنے ملیر کا غصہ فوراً فرو ہو گیا۔ اب وہ اپنے کردار پر پچھتانے سا لگا۔ اُسنے اپنا پاؤں لاش پر سے اٹھا لیا۔ تب تو یہ عورت ہاتھی سے چمٹ گئی ہاتھی بھی اُسکے زار نالے پر متاسف و پشیمان کھڑا ہو گیا۔ یہ سماں بھی عجب دردناک تھا کہ عورت ہائے وائے کا غل مچاتی اور گرد پھر پھر کے ہاتھی کو ہزاروں صلواتیں سنا رہی تھی اور ہاتھی اپنی نازیبا حرکت پر نادم و منفعل ساکت کھڑا اور غمگیں نظر سے اُسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں معصوم بے زبان بچے نے دو تین بار ہاتھی کی سونڈ پکڑ لی اور اُس سے کھیلنے لگا جس سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ سونڈ سے کھیلنے کا عادی ہو رہا تھا۔ کیونکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مہاوتوں کے لڑکے برابر ہاتھی کی اگلی ٹانگوں کے بیچ میں کھیلتے کھیلتے گھس جایا کرتے ہیں اور ہاتھی آہستہ آہستہ اپنی سونڈ کو پیارانہ شفقت سے اُن کے اوپر اِدھر اُدھر گھمایا اور اُنکو جھولا جھولایا کرتا ہی۔

اس درمیان میں سانٹے مار آ پہونچے۔ یہ لوگ عمدہ۔ چالاک گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور انھوں نے دونوں طرف سے آہستہ آہستہ اپنے نیزوں کی نوکیں اُسکے جسم پر لگائیں اور اپنے منشا سے اُسکو آگاہ کرنا چاہا۔ ملیر نے برہم ہو کے ایکبار کان پھٹ پھٹائے اور خشمگیں نگاہ سے سواروں کو دیکھا اُسکے چشم و ابرو سے صاف پایا جاتا تھا کہ اُسکی مرضی یہ ہی کہ سواروں کو اپنے کرتب دکھانے کی ضرورت نہ پڑے بلکہ مہاوت کی عورت جدھر چاہے اُسے ہنکا لے جائے۔ پھر سواروں نے اپنے نیزے اُسکے بدن میں چبھوئے اور اُنکی انی دراز دور سے چبھوئے۔ اب تو اُسنے بھی اپنی سونڈ ہلائی اور زور سے چنگھاڑ کے بائیں جانب کے سواروں پر جھپٹا۔ لیکن فوراً ہی سواروں نے گھوڑے کودائے اور الگ ہو گئے۔ ملیر پیچھے دوڑا اور سوار زد سے بھاگ کر ایک دیوار پھاندے اور ملیر کی نظر سے غائب ہو گئے۔ لیکن ملیر کو غصہ آ چکا تھا۔ وہ بھرا ہوا داہنی طرف کے سواروں پر جھپٹا اور وہ بھی اُسی طرح بچ بچا کے نکل بھاگے۔ ملیر اُنکے بھی پیچھے دوڑا اُسوقت بادشاہ سلامت نے چلا کے فرمایا کہ ”مہاوت کی عورت سے کہو کہ وہ ملیر کو بلائے۔ اُسکے بلانے سے ضرور وہ چلا آئے گا۔“ چنانچہ عورت نے ملیر کو پکارا اور جسطرح کتا اپنے مالک کی آواز پر دُم دبائے پلٹ

پڑتا ہی۔ ملیر بھی اس عورت کی آواز سنتے ہی سیدھا چلا آیا۔ تب بادشاہ نے حکم دیا کہ "اس عورت سے کہو کہ بچے کو لیکر اسپر سوار ہو جائے۔ اور ہنکا لیجائے"۔ فوراً یہ حکم اُس عورت تک پہونچا یا گیا۔ اور ملیر اُسکے کہنے سے بیٹھ گیا۔ اور عورت ملیر پر سوار ہوئی۔ پھر ملیر نے اپنی سونڈ سے پہلے مہاوت مقتول کی لاش اور پھر اُسکے لڑکے کو اُٹھا کے عورت کے حوالے کر دیا۔ اور یہ عورت ہی بجاے اپنے شوہر کے ملیر کی مہاوت مقرر ہو گئی۔ کیونکہ اُسے کوئی دوسرا مہاوت پسند ہی نہ آیا۔ اور سخت غیظ و غضب اور جوش و مستی کی حالت میں بھی وہ اسی عورت کا مطیع و فرمانبردار بنا رہتا تھا۔ وہ کیسا ہی بپھرا اور جوش میں بھرا کیوں نہو جہاں اس عورت نے اپنا ہاتھ اسکی سونڈ پہ پھیرا اور اُسکا سارا جوش و خروش جاتا رہا۔ عورت بھی بالکل نڈر تھی اور بے خوف و خطر اُسپر سوار ہوتی اور کل کام اُس سے لیتی تھی۔ ظن غالب تو یہی ہو کہ جسقدر قابو عورت نے ملیر پہ حاصل کیا تھا اُسکے مرنے کے بعد اُسکے لڑکے کو بھی وہی قابو حاصل ہوا ہوگا۔ ایک مہاوت کی ہلاکت کی کیفیت تو میں بیان کر چکا اب ایک دوسرے ہاتھی کے مہاوت کی جان بچانے کی سرگذشت سناتا ہوں۔

ایک مرتبہ ہاتھیوں کی لڑائی کے وقت ایک رمنے میں (جسکے چاروں طرف آہنی کٹہرا لگا ہوا تھا) یہ اتفاق پیش آیا کہ دیر سے دونوں ہاتھی بڑے زور شور کے ساتھ باہم ریل پیل کر رہے تھے کہ دفعتاً کمزور ہاتھی ہمت ہار کے اپنے حریف کے مقابلے سے بھاگ نکلا۔ اور رمنے کے چار طرف چکر کاٹنے لگا اُسکا حریف بھی اُسکا پیچھا لیے ہوے برابر دوڑ لگا رہا تھا۔ اس حالت کو دیکھکے یہ حکم دیدیا گیا کہ ہزیمت خوردہ ہاتھی کو نکل جانے کی راہ دیدیجائے۔ لیکن جسوقت وہ نکل کے بھاگا اُسی وقت اتفاقیہ اُسکا مہاوت اُسکی گردن پر سے الگ ہو کے زمین پر گر پڑا۔ مگر ابھی تعاقب کنندہ ہاتھی کی نظر اُسپر نہیں پڑی تھی لیکن جسوقت یہ ہاتھی کٹہرے کے پاس کھڑا ہو کر رُک گیا اُسوقت بیچارے مہاوت کی جان کا خدا ہی حافظ و نگہبان تھا۔ کیونکہ اب اُسے مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ ذرا کی ذرا وہ ہاتھی کی نگاہ سے بچا رہا۔ لیکن کب تک چھپ سکتا تھا۔ آخر اُسنے دیکھ ہی لیا اور دیکھتے ہی اُسے ریلنا اور مسلنا شروع کر دیا۔ اسوقت مہاوت کی جان بری کی کوئی تدبیر ممکن نہ تھی۔ کیونکہ یہ صورت دفعتہً پیش آگئی تھی۔ بالآخر ہاتھی اس غریب پر پل پڑا۔ کیونکہ ہاتھی صرف اپنے ہی مہاوت سے راضی رہتے ہیں اور حریف کے مہاوت کو ہمیشہ دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس ہاتھی کے مہاوت نے ہزار روکا کہ اُس غریب کی جان کسی طرح بچ جائے مگر وہ غصے میں بھرا اور بپھرا ہوا [illegible] کسی طرح اس کے قابو میں نہ آیا۔ اور اُسکی کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ ایکبار ہاتھی سنبھلا اُسپر

حملہ کرنے کے واسطے اپنی سونڈ اٹھائی اُسوقت بیچارا مہاوت کٹہرے کے ایک کونے سے لگا ہوا سمٹا سہما کھڑا تھا۔ ہاتھی نے اپنی مستک ٹیک کے بڑی زور سے ریلا اور اُس کے دونوں دانت کٹہرے کی سلاخوں کے درمیانی فصل میں باہر نکل آئے اور مہاوت بیچ میں آگیا۔ اب وہ اپنی مستک سے بعینہٖ اُسی طرح زور زور سے ہولے مارتا تھا۔ جیسے مقابلے پر کوئی ہاتھی ہوتا اور اُسے ٹکراتا بیچارا مہاوت کٹہرے کے کونے سے چمٹا ہوا بہت ہی بدن کو سمٹائے کھڑا تھا۔ اور ہاتھی ٹکر پر ٹکر مار رہا تھا لیکن اس شخص نے اپنے بدن کو کٹہرے سے چمٹ کر اتنا سکوڑا اور اپنے دونوں ہاتھ اس طرح پیٹھ کے پیچھے کر لیے کہ جس سے وہ بالکل دُبلا پتلا معلوم ہونے لگا۔ اور اوپر سے ہم لوگ جو دیکھ رہے تھے تو ہم سب یہی خیال کر رہے تھے کہ ٹکروں کے مارے بیچارا بالکل پچی ہو گیا ہوگا۔ اور ہڈیاں پسلیاں سرمہ ہو گئی ہونگی۔ لیکن یہ ہم لوگوں کی غلط فہمی تھی کیونکہ مہاوت نے اپنے کو کٹہرے کے گوشے میں ہاتھی کی ٹکر سے محفوظ تصور کر کے اپنا بدن خوب سکوڑا تھا پھر نہایت ہوشیاری سے بدن چرا کر آہستہ آہستہ جھکنا شروع کیا اور ایکبارگی بیٹھ گیا۔ ہاتھی چونکہ اسکو دیکھ نہیں سکتا تھا اپنے دل میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ ٹکریں مار مار کے اُسکا کام تمام کر چکا ہی بیٹھنے کے ساتھ ہی مہاوت ایک دم سے بڑی پھرتی کے ساتھ ہاتھی کی اگلی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل کے فوراً علیحدہ میدان میں قلانچ مار کے جا کھڑا ہو گیا۔ ہم لوگوں نے جو اُسے دبے پاؤں ہاتھی کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل کے اور قلانچ مار کے میدان میں آتے دیکھا تو دنگ ہو کے رہگئے کہ اتنی زبردست ٹکروں پر بھی نہ اُسکی کسی ہڈی کو گزند پہونچا نہ کھال پر کوئی خراش لگی۔ اور ایک لمحہ میں یہ شخص کٹہرے کے باہر سے بھاگ کر میدان کے اس پار آکے کھڑا ہو گیا۔ چنانچہ جسوقت بہت سے لوگ آتشبازی چھٹنے کے وقت میدان میں ہاتھی کے ڈرانے اور ہٹا لیجانے کے واسطے آ کھڑے ہوئے تھے اُسوقت وہ آدمی جسے چند ساعت قبل لوگ ایک چکنا چور لاشہ تصور کرتے تھے ہٹا کٹا چاق چوبند ان لوگوں کا شریک حال نظر آتا تھا۔

بڑے تعجب کی بات ہی کہ ہاتھی کیسے ہی غیظ اور مستی کی حالت میں کیوں نہو جہاں اُس کے سامنے آتشبازی چھوڑی گئی وہ سہم کے خوف زدہ ہو جاتا ہی۔ اگر بان یا چرخی اُسکے آگے داغی جاتی ہی تو ہاتھی اُس کی آواز اور سنسناہٹ سے بیحد ڈر کے لرزنے لگتا ہی۔ چنانچہ اسی خیال سے ایسے موسم میں کہ جب ہاتھی مست اور بے قابو ہو جاتے ہیں ہمیشہ آتشبازی اُنکے ڈرانے دھمکانے اور ایذا رسانی سے روکنے کے لیے طیار رہا کرتی ہی۔

باب دوازدہم

لکھنؤ کا محرم

ہندوستان کے مسلمانوں کی طرز معاشرت میں جو انقلابات و تغیرات سال کے مختلف اوقات میں ہوا کرتے ہیں کچھ عجیب ہیں۔ ماہ محرم جو عربی کا ایک مہینہ ہے اُسمیں دو اولین ائمہ اسلام یعنے حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ کی شہادت کی سالانہ عزاداری ہوا کرتی ہے۔ یہ دونوں نبی زادے تھے اور نصف سے زیادہ مسلمان باشندگان ہند اُنکا ماتم مناتے اور یہ زمانہ بہت کچھ گریہ و بکا اور سخت غم و ماتم میں بسر کرتے ہیں۔ انھیں میں دربار لکھنؤ بھی شامل ہے۔ نصف سے زیادہ مسلمان اسوجہ سے محرم مناتے ہیں کہ یہ بخوبی ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں دو بڑے فرقے ہیں۔ ایک فرقہ شیعہ دوسرا فرقہ اہل سنت و جماعت۔ اور ان دونوں فرقوں میں باہم ویسی ہی تناتنی ہے جیسے متعصب پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک عیسائیوں میں۔ ترک لوگ سنی ہیں۔ اور اہل عجم شیعہ علے العموم یوں سمجھنا چاہیے کہ مغربی مسلمان دریاے فرات سے لیکر بحر اطلانطک تک سُنی ہیں۔ اور مشرقی مسلمان دریاے فرات سے لیکر جاوا تک شیعہ۔

ہندوستان میں محرم کا زمانہ کبھی دنگہ فساد سے خالی نہیں جاتا[1]۔ شیعہ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسین کی شہادت بڑی سفاکی و بیرحمی سے ظالمانہ واقع ہوئی اور سنیوں کا اعتقاد ہے کہ خلیفہ وقت نے انکو بطور جائز قتل کیا کیونکہ وہ غاصب تھے[2] (معاذ اللہ)

یکم محرم کو اکثر مسلمانان لکھنؤ ایسے مغموم نظر آتے ہیں گویا تمام دنیا کی عیش و راحت اور کاروبار زندگی سے دفعتاً محروم کردیے گئے ہیں۔ گلی کوچے سنسان پڑ جاتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے گھر میں اپنے گھر والوں کے ساتھ غم امام میں سوگوار ہو جاتا ہے۔

دوسری تاریخ کو گلیوں میں پھر بھیڑ بھبڑ نظر آتی ہے۔ اور لوگ ماتمی لباس پہنے ہوے تعزیوں کے جلوس کے ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جگہ جگہ پر تعزیے نظر آنے لگتے ہیں اور اُنکی ساتھ خلقت کا مجمع بھی ہوتا ہے۔ یہ تعزیے اُن مزارات متبرکہ کی شبیہ ہوتے ہیں جو کربلا یا مشہد میں دریاے فرات کے ساحل پہ واقع ہیں۔ اور انھیں لیجا کے امام باڑوں یا امرا کی محلسراؤں میں

---

[1] چونکہ زمانہ شاہی میں یہ باتیں لکھنؤ میں ہوتی تھیں اسوجہ سے مصنف نے غلطی سے سارے ہندوستان کو قیاس کر لیا ہے اب یہ حالات محض داستان پارینہ ہے۔

[2] نہ سنیوں کا یہ عقیدہ ہے نہ اُنکی کسی کتاب میں ہے۔ نہ یہ وجہ اختلاف۔ یہ صرف مصنف صاحب کی غلطی ہے۔

رکھتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کا تعزیہ جو غازی الدین حیدر کے عہد میں انگلستان سے بنکے آیا تھا سبز بلور کا ڈھلا ہوا تھا اور اُسپر سنہرا مینا کیا ہوا تھا۔ اسے سب لوگ نہایت عزت و توقیر سے دیکھتے اور بہت مقدس خیال کرتے تھے۔

امام باڑہ محض محرم کرنیکی غرض سے پیشتر سے تیار کیا جاتا ہی۔ اور اکثر سرگروہ اُس خاندان کے جنکا امام باڑہ بنوایا ہوتا ہی اُسمیں دفن بھی ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہی امام باڑونکی بھی یہی حالت تھی۔ امام باڑے میں تعزیے جو محرم کے زمانے میں رکھے جاتے ہیں مکہ معظمہ کے رُخ پر رکھے جاتے ہیں۔ شاہی تعزیہ کے اوپر ایک سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ بھی تنا ہوتا ہی۔ سامنے کی طرف ایک ممبر بھی (جو اسی کینڈے کا ہوتا ہی جیسا تعزیہ) بیان شہادت پڑھنے کی غرض سے رکھا جاتا ہی جسپر مرثیہ خواں رو بقبلہ ہوکے اور تعزیے کیجانب پیٹھ کرکے کھڑا ہوتا ہی۔ ممبر کی شکل ایک اونچے چبوترے کی ہوتی ہی جسمیں دیوار یا کٹہرا کچھ نہیں ہوتا۔ اُسپر واقعہ خواں کھڑے ہوکے یا بیٹھ کے پڑھتا ہی۔ کھڑے ہونا یا بیٹھنا اُسکی مرضی پر منحصر ہوتا ہی۔

اس زمانے میں امام باڑوں میں روشنی کی یہ بہتات اور اُسی روشنی میں کارچوبی کام کی چیزوں کی اسقدر چمک دمک ہوتی ہی کہ آدمی کی نظر کو چکاچوند لگ جاتی ہی۔ علموں کے طلائی و نقرئی پنجوں کی جگمگاہٹ اور اُنکے بھاری بھاری پٹکوں کی سجاوٹ۔ زردوزی کام پر گنگا جمنی کرن کی جھالرونکی زیبائش اور اُنکی وجہ سے در و دیوار کی آب و تاب بس سارا امام باڑہ بقعۂ نور ہوجاتا۔ اور روشنی کی کثرت سے رات کو دن کا سماں نظر آنے لگتا ہی پھر اسی آرائش و زیبائش میں اونچی پگڑیاں باندھے اور لانبی داڑھیاں چھٹکائے ہوئے آدمیوں کا ادب اور سکوت سے چلنا پھرنا۔ اُنکی مغموم و اندوہگیں صورتوں سے حد درجہ رنج و غم کا ظاہر ہونا یہ ایسا سماں ہوتا ہے کہ مسٹر میر حسن علی کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہی کہ ان چیزوں کو دیکھ کے وہ طلسمی ایوانات بارہا میری آنکھوں کے نیچے پھر گئے جو الف لیلہ کی داستانوں کو پڑھ کے ذہن میں منقش ہوجاتے ہیں۔"

تعزیوں کے نیچے اکثر نشانات شاہی ملک عرب کے جیسے زرتار عمامہ و دستار۔ آفتاب کا نقشہ اور جواہر نگار اسلحہ رکھے نظر آتے ہیں۔ یہ گویا اس بات کی شہادتیں ہیں کہ ائمہ مظلوم کو مسلمانوں کے خلیفہ برحق ہونے کا جائز استحقاق تھا کہ جس سے متعصب سنی انکار کرتے ہیں۔

ایام محرم میں برابر تعزیونکے گرد بڑی بڑی سپید و سبز رنگ کی مومی توریں روشن رہا کرتی ہیں اور حسب دستور روز میں دو مرتبہ مجالس عزا امام باڑوں میں منعقد ہوا کرتی ہیں جس میں شام کی مجلس زیادہ

دلچسپ ہوتی ہے۔ کیونکہ اسمیں مجمع خوب ہوتا ہے۔ یہ عجب سیر ہوتی تھی کہ بادشاہ سلامت ماتمی لباس پہنے اور سر پر مور کے پروں کا تاج رکھے ہوئے واقعہ خواں کے روبرو بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُنکے پیچھے کثرت سے اُنکے ہندوستانی ملازم بیٹھے ہیں کہ جو دو دو کی قطار باندھے۔ گردنیں جھکائے نظریں نیچی کیے۔ اور غمگیں صورت بنائے امام باڑے میں داخل ہوئے تھے۔ اُسوقت جھاڑوں اور مومی شمعوں کی تیز روشنی میں یہ سماں نہایت پرلطف اور اسوقت کا عالم سکوت قابل دید ہوتا تھا اس سکوت کو واقعہ خواں (واضح ہو کہ بادشاہ کے سامنے وہی مجتہد واقعہ خوانی کرتا تھا جسپر بادشاہ سلامت کی نظر ہوتی تھی) پہلے اپنی دردناک آواز سے توڑ دیتا تھا اور سامعین بالکل خاموشی کے ساتھ سراپا مغموم و حزیں بنے اور ہمہ تن گوش ہوکے اُسے سنتے تھے۔ اُسوقت روشنی کی آب و تابش میں بڑی بڑی پگڑیوں کی شان اور امام باڑے کے ساز و سامان کی چمک دمک۔ زرنگار علموں کے پٹکوں کی تڑپ عجب لطف دکھاتی تھی کیونکہ ہر طرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آگ لگی ہوئی ہے۔ واقعہ خواں جسوقت واقعاتِ شہادت ائمہ معصومین پڑھتا تھا تو عجب انداز سے آنکھیں گھما گھما کے پڑھتا تھا۔ پڑھتے ہی پڑھتے اُسکی آواز میں زور اور آنکھوں سے جوش ظاہر ہونے لگتا تھا۔ سامعین پہلے تو ساکت و مغموم صورت بنائے منہ لٹکائے بیٹھے رہتے تھے لیکن سنتے سنتے اُنکے دل بھی گداز ہونے لگتے تھے اور آخر کار جب لوگ آہیں بھرنا شروع کر دیتے تھے مجلس میں جب [illegible] پڑ جاتی تھی تو واقعہ خواں اور بھی چلا چلا کے مصائب اہلبیت کا حال بیان کرنے لگتا تھا جس سے سامعین پر شدت گریہ و بکا سے عجب حالت طاری ہو جاتی تھی۔ کسیکی آنکھ سے آنسوؤں کا تار بندھا تھا۔ کوئی ہچکیاں سسکیاں لیتا اور کوئی چلا چلا کے واویلا و امصیبتا کی صدا بلند کرتا۔ اور اسی درمیان میں خاص خاص مواقع پر بعض سامعین کی زبان سے "حسن حسین" کا نعرہ بھی نکلتا اور آخرکار سب لوگ متواتر اور مسلسل سینہ کوبی کرنے لگتے یہ ماتم پہلے تو آہستہ آہستہ ہوتا تھا پھر زور سے "حسن حسین" کی صدا اور اُسکے ساتھ سینہ کوبی کا ہنگامہ بلند ہوتا اور سارا امام باڑہ اُسی سے گونج اٹھتا تھا۔ دس منٹ تک یہی حالت طاری رہتی اور پھر یکایک سکوت اور سناٹے کا عالم پیدا ہو جاتا۔ چونکہ ہر شخص کو محنت و مشقت کے بعد تھوڑی سی راحت ملنا چاہیے عام اس سے کہ وہ محنت ایسی شدید ہو جیسے برفستانی ملک (جہاں پچھوا ہوا کا تھپیڑا دانت سے دانت بجا دیتا ہے) اور ایسے سخت موسم میں جبکہ آلہ مقیاس الحرارت صرف نوے درجے پر ہو تیس میل کی کڑی منزل کو طے کرنا پڑے یا صرف دس منٹ کے واسطے علی الاتصال "حسن حسین" کی صدا لگا کر سینہ کوبی کیجائے۔ اسی لحاظ سے اس محنت شاقہ کے بعد جس سے سب لوگ ہلکان ہو جاتے تھے شربت کا دور چلتا تھا اور بادشاہ سلامت

اور اراکین خاندان شاہی حقہ نوشی میں مصروف ہوتے تھے اور اور لوگ اپنے اپنے ٹیکون سے مزے دار گوشت نکال نکال کے چباتے تھے۔ پھر دوبارہ واقعہ خوانی شروع ہوتی تھی اور پھر اسی طرح ماتم اور سینہ کوبی اور اُسکے بعد تفریح میں وقت کٹتا تھا۔ خاتمۂ مجلس پر مرثیہ خوانی شروع ہوتی تھی۔ یہ مرثیہ خوانی بالکل اُردو زبان میں اور عام پسند بول چال میں ہوتی تھی مرثیہ ختم ہونے پر سارا مجمع کھڑا ہو کے کل ائمہ معصومین اور پیشوایان اسلام کے نام لیتا تھا اور خلفاء غاصب پر تبرا کرتا تھا۔

محرم بھر روزانہ اسی طرح کی مجالس عزا امام باڑوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ خود بادشاہ سلامت کو بالذات اس قسم کے مذہبی مراسم کے ادا کرنے میں بیحد شغف اور انہماک تھا۔ کیونکہ اُنھوں نے اپنی صغر سنی میں یہ منت مانی تھی کہ اگر اُنکو تخت شاہی نصیب ہوگا تو بجاے معمولی عشرے کے وہ اربعین تک سوگ منایا کرینگے۔ چنانچہ اس زمانے میں بادشاہ اپنے ذکور اعزا یا احباب ہی کے مجمع میں رہا کرتے تھے۔ شراب نہیں پیتے تھے۔ دعوتیں نہیں دیتے تھے اور عیش و عشرت کے جن سامانوں کے بڑے دلدادہ تھے اُن سب کو ترک کیے رہتے تھے۔ اسی طرح انگریزی مذاق کی جتنی باتیں بالطبع اُنکو مرغوب تھیں اُن سب کو چھوڑ دیتے تھے۔

بیگمات شاہی کے امام باڑے محلات کے اندر علیحدہ علیحدہ تھے۔ اور وہاں کی مجلسوں میں عورتیں حدیث خوانی مرثیہ خوانی کیا کرتی تھیں۔ میں نے بہ تحقیق سنا ہے کہ ان مجلسوں میں سینہ کوبی „حسن حسین" کی نعرہ زنی اور خلفاء پر تبرا کسیقدر زیادہ جوش کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان عورتوں کا دستور تھا کہ تکلیف و مصیبت رنج و غم حسرت و اندوہ کے ظاہر کرنے کی ہر ایک صورت امام مظلوم کے غم میں ظاہر کرتی تھیں۔ چنانچہ جب ایک یورپین لیڈی (مسز میر حسن علی) نے ان عورتوں سے پوچھا کہ „زمانۂ محرم مین تم کبھی اپنے مردہ بچون یا والدین کا خیال نہین کرتین اور اُنکی یاد کیون کر بالکل فراموش کر دیتے ہو" تو اُسکا جواب اُنکو یہ ملا کہ „ہماری اشکباری اور گریہ و زاری تو صرف اہلبیت نبوت کے حصے میں پڑ چکی ہے۔ اب بھلا اپنے ذاتی صدمات اور مصائب کی فکر کیونکر ہو سکتی ہے"۔

شیعہ لوگ صرف امام باڑوں میں جانے یا مجالس عزا میں شریک ہونے ہی سے امام سید الشہدا کا سوگ نہیں مناتے ہیں بلکہ زمانہ عزاداری میں اپنے نفس پر اور بھی جبر گوارا کرتے ہیں اور تکلیفیں سہتے ہیں۔ وہ بہت مبتذل معمولی کھری چار پائیوں پر یا صرف چٹائی بچھا کے زمین پر لیٹتے

ہیں۔ موٹا جھوٹا کھاتے پیتے ہیں۔ گرما گرم سالن اور مزے دار پلاؤ چھوڑ کے صرف جو کی روٹی ابالے ہوئے چاول اور دال پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ عورتیں اپنے زیور بڑھا ڈالتی اور بناؤ سنگار کی تمام چیزیں بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ حالانکہ ہندوستانی مستورات کی جان انھیں زیورات میں اٹکی رہا کرتی ہے۔ زیور سے انھیں بڑی تفریح اور راحت قلبی پہونچتی ہے اور زیور ہی کا رکھ رکھاؤ بہت کچھ انکا مشغلۂ زندگی ہوتا ہے۔

باشندگان لکھنؤ کا اعتقاد ہے کہ لکھنؤ میں امام حسینؑ کے علم کا پنجہ (جسے ایک غریب زائر ملک شام سے وہاں لایا تھا) موجود ہے اور یہ نہایت ہی مقدس و متبرک یادگار سمجھا جاتا ہے جس مکان میں یہ تبرک رکھا ہے وہ "درگاہ" سے موسوم ہے۔ اور محرم کی پانچویں تاریخ وہاں بڑے جلوس اور رچاؤ کے ساتھ ساری لکھنؤ کے علم چڑھائے جاتے ہیں۔ ایوان شاہی سے درگاہ پورے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ اسکی عمارت بہت شاندار ہے اور اسکے بیچوں بیچ میں ایک چبوترہ بنا ہے۔ چبوترے کے چاروں طرف چھوٹے بڑے علم کھڑے ہیں انکے ٹیکوں اور پھریروں پر نہایت نفیس معرکے بنے ہوئے ہیں۔ چبوترے کے بیچ میں وہ علم کا پنجہ ایک بانس کے اوپر لگا ہوا رکھا ہے جسنے مکاں کو زیارت گاہ بنایا ہے۔

پانچویں محرم کی صبح کو ہر حیثیت و منزلت کے باشندگان لکھنؤ اپنے اپنے علم لیکے جوق جوق اس درگاہ کی طرف جاتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ ایسے نمود و نمایش کے مواقع پر یہاں کی خلقت اپنی دولت و ثروت کے اظہار کی عادی ہے۔ لہذا اسکے اہتمام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا چنانچہ شاہی امام باڑے سے جو علم باجاہ و حشم درگاہ جاتے تھے انکا جلوس اور کر و فر کچھ بیان کرتا ہوں۔ اس جلوس میں سب کے آگے چھ سات ہاتھی ہوتے تھے جنپر مغرق جھولیں پاکھریں پڑی نقرئی طلائی ہودے عماریاں کسی اور گلے میں نقرئی گھنٹے اور ہیکلیں لٹکتی ہوتی تھیں۔ ہر ایک ہاتھی پر کچھ لوگ جواہر نگار علم ہاتھوں میں لیے سوار ہوتے تھے اور انکے ہمراہ سپاہیوں کا ایک گارد ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کے پیچھے ایک شخص خاص طور پر سوگوار بنا ہوتا تھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں بانس کی ایک بڑی چھڑ سیاہ کپڑے سے منڈھی ہوتی تھی۔ اس چھڑ کے اوپر ایک الٹی کمان میں دو ننگی تلواریں لٹکتی ہوتی تھیں اسکے پیچھے خود بادشاہ سلامت ہوتے تھے۔ انکے گرد و پیش خاندان شاہی کے لوگ اور مقرب علماء مذہب ہوتے تھے انکے پیچھے ایک گھوڑا جسے "دُلدُل" کہتے ہیں (یعنی جسپر امام حسینؑ شہید ہونیکے وقت سوار تھے) ہوتا تھا۔ یہ گھوڑا عربی النسل اور بڑے قد و قامت کا ہوتا تھا۔ اور اسی غرض کیواسطے سدھایا جاتا تھا۔ اسکی ٹانگیں اور پہلو سرخ رنگی ہوتی تھیں اور اسکا بدن تیروں سے چھدا ہوتا تھا۔ یہ گویا یادگار

تھی اُس مصیبت واذیت کی جو اصلی گھوڑے اور اُسکے سوار پر پڑی تھی۔ گھوڑے کے پشت پر نہایت مغرق زرتار و جواہر نگار چارجامہ کسا ہوتا تھا جو گھوڑے کے سبزہ یا نقرئی رنگ پر بہت کھلتا اور زیب دیتا تھا۔ گھوڑے کا ساز و یراق سب ٹھوس سونے کا ہوتا تھا اور گھوڑے کی زین پر ایک عربی عمامہ ایک کمان اور ایک تیر و نشے بھرا ترکش بھی رکھا ہوتا تھا اور اُسکے جلو میں نہایت زرق برق وردیاں پہنے ہوے چند خادم ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہاتھوں میں چنور لیے اُسکی مگس رانی کرتے جاتے تھے۔ اس گھوڑے کے پیچھے ملازمان شاہی کی ایک جماعت اور پھر فوج کے سواروں پیدلوں کی رجمنٹیں اور تماشائی خلقت کا انبوہ کثیر ہوتا تھا۔

علم چڑھانیکی یہ صورت ہوتی ہے کہ پہلے سب علم ایک دروازے سے داخل ہوتے ہیں پھر اُس پنجے کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور اُس سے بدلا کر دوسرے دروازے سے نکالے جاتے ہیں تاکہ اور اور علموںکے آنے میں دقت نہو۔ دن بھر یہی ہوا کرتا ہے۔ اور شہر کی خلقت انبوہ در انبوہ اس رسم کے ادا کرنے کیواسطے برابر آتی رہتی ہے۔ امیروں سے بعض کو تو بھیڑ چھٹنے کے انتظار میں صبح سے تیسرا پہر ہوجاتا ہے اور بعض یوں بھی کسی اور اتفاقی سبب سے یہیں ٹھہر جاتے ہیں جس سے صبح سے شام تک ایک میلا سا لگا رہتا ہے۔ علموں کی کثرت تعداد اسی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ مجھے خوب یاد ہے جب میں لکھنؤ میں تھا تو میں نے ایک سال سنا کہ ایک بار پچاس ہزار علم درگاہ میں چڑھائے گئے اور اسپر مجھے کچھ اجنبھا نہیں ہوا تھا۔

دنیا میں عام طور سے مشہور ہے کہ شادی و غم توام ہیں چنانچہ ایک شاعر کہ گیا ہے۔

دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

یہ بات بلاد مشرقیہ میں بہت اچھی طور سے ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً زمانہ محرم میں جو مخصوص اظہار رنج و ماتم کا وقت ہوتا ہے غم کے پہلو بہ پہلو شادی کا سماں بھی نظر آتا ہے یعنے محرم کی ساتویں تاریخ کو تقریب شادی کی یادگار میں بھی ایک جلوس بڑے سامان اور تزک و احتشام سے نکالا جاتا ہے جسے "مہندی" کہتے ہیں۔ یہ یادگار ہوتی ہے ایک روایت تاریخی کی کہ عین اسی روز جبکہ امام حسینؑ کے بھتیجے امام قاسم کی شہادت ہوئی اُسکی شب کو امام حسینؑ نے اپنی چہیتی لاڈلی بیٹی کی شادی اپنے بھتیجے امام قاسم کے ساتھ کردی تھی۔ "مہندی" میں شادی و مسرت کے بڑے ساز و سامان اور تکلفات جمع کیے جاتے ہیں اور وہ علی العموم شب کو نکالا کرتی ہے۔ غریبوں کی مہندیاں امرا کے امام باڑوں میں جاتی ہیں اور نواب

یا وزیر اعظم کی منہدی معمولاً شاہی امام باڑے میں چڑھائی جاتی ہے۔ ان عظیم الشان منہدیوں کی آمد کے سبب سے اس رات کو تمام امام باڑوں میں بیحد غیر معمولی روشنی اور سجاوٹ کیجاتی ہے اور جب روشنی اور سجاوٹ کا انتظام کامل ہو چکتا ہے اُسوقت خلایق بے روک ٹوک امام باڑوں کی بہار دیکھنے جایا کرتی ہے۔ اس کثیر الانفار گروہ میں سے بعض تو بڑے بڑے رنگا رنگ جھاڑوں کی کیفیت دیکھنے میں محو ہوتے ہیں جنمیں صدہا شمعیں روشن ہوتی ہیں کیونکہ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے ایکمرتبہ گنا تھا تو ایک جھاڑ میں سو کنول چڑھے ہوئے تھے۔ بعض خوشرنگ اور باغ و بہار کنول رنگ دیکھ دیکھ کے دنگ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ امام کے مزار پر انوار کی آرایش اور تاب و تابش کھڑے دیکھا کرتے ہیں جسکے سامنے ایک بڑے شیر کی تصویر ایک جانب اور دو مچھلیاں جنکے سر باہم ملے اور ایک دوسرے کیطرف جھکے ہوتے ہیں (یہی شاہان اودھ کا شاہی معرکہ ہے) دوسری جانب ہوتے ہیں۔ یہ تماشائی ان عجائبات و نوادرات کو دیکھکے عجب لطف اُٹھاتے ہیں اور ایک ایک شے کو حیرت سے دیکھتے اور اسپر تحسین و آفریں کی صدا بلند کرتے ہیں۔ کیونکہ اسوقت امام باڑے کی تزئین کے واسطے ہر ایک مذاق اور طبیعت کے لوگوں کی تفریح اور دلبستگی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً ایک طرف طلائی و نقرئی علموں کے زرگار و جواہر نگار پنجے اور پٹکے استادہ رکھے ہیں۔ اور اُنھیں کے پاس خانہ کعبہ کے دروازے اور امام حسینؑ کے خیمہ و خرگاہ اور قبہ مبارک واقعہ کربلا کے نقرئی نقشے ہوتے ہیں جو ایک چاندی کی میز پر رکھے ہوتے ہیں اور اُنکو دیکھ دیکھ کے رقیق القلب حضرات کے دل پگھلنے لگتے ہیں۔ ایک طرف دیواروں میں طرح طرح کے نفیس و نادر اور عجیب عجیب ساخت کے ہتھیار لٹکے ہوئے ہوتے ہیں جنکے دیکھنے سے بہادر جری اور جنگ آزما لوگوں کے دلوں میں جوش و غصا پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس ساری آراستگی اور زینت کا مقصود ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ مذاق کی نفاست ظاہر کی جائے بلکہ یہ ساری کھکھیڑ صرف اظہار شان و علوے مرتبت کے واسطے اُٹھائی جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسکے دیکھنے سے جو تحیر و استعجاب کی کیفیت تماشائیوں پر طاری ہوتی ہے اُسے دیکھکے بڑا مزا ملتا ہے۔

جسوقت اُدھر سے توپونکے سر ہونے کی آواز سُنائی دیتی ہے اُسوقت معلوم ہوجاتا ہے کہ اب آرایش شادی کے تخت (وہی تخت جنکے پاشنہ کوب تختہ تابوت ہیں) قریب ہو چکے ہیں۔ اس آواز کے سُنتے ہی شاہی نقیب اور چوبدار امام باڑے اور اسکے راستے کی صفائی کیواسطے آجاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے کام خدمت میں بہت چست و مستعد ہوتے ہیں۔ اب ایکطرف تو تماشائی

بیخبری کے ساتھ مصروف سیر و تماشہ ہیں اور دوسری طرف یہ لوگ انھیں نکال باہر کرنے پر کمربستہ تماشائی ابھی جی بھر کے دیکھ نہیں چکے ہیں۔ اُنکی آنکھیں سیر نہیں ہوئی ہیں کہ یہ تفرقہ انداز اُنکے سروں پر بلاے بے درماں کیطرح مسلط ہو گئے۔ چونکہ خالی دوت دبک سے وہ لوگ ٹلنے والے نہیں ہوتے لہذا دوت دبک شروع بھی نہیں کیجاتی بلکہ سر سے ہاتھ پاؤں کی قوت سے کام لیا جاتا ہی۔ میں یہ تو نہیں کہ سکتا کہ ان لمبی داڑھی اور بھیانک صورت والے مسلمانوں سے لندن کے پولس والے کیا برتاؤ کرینگے اگر وہاں کہیں یہ پہونچیں اور راستہ صاف کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ البتہ یہ میرا دیکھا ہوا ہی کہ لکھنؤ میں شاہی چوبدار بڑی دوٹوک کارروائی کرتے ہیں اور اپنے برتاؤ میں لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ پہلے بلند آواز سے تین بار پکار کے کہتے ہیں کہ "امام باڑہ خالی کردو" لیکن جب اس آواز کی صداے بازگشت نہیں آتی اور وہ دیکھتے ہیں کہ تماشائیوں کے کان پر ذرا جوں نہیں رینگی بلکہ وہ بدستور زرق برق روشنی جگمگاتے شیشہ آلات اور نقرئی و طلائی سازوسامان کے تماشے میں محو اور منھ کھولے۔ گردنیں اُٹھائے بے تکان دیکھنے میں مصروف ہیں تو وہ اچھی طرح ڈنڈے مارنے اور کوڑے پھٹکارنے لگتے ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ لات چپت۔ گھونسے مکی سبھی آلات حرب و ضرب کام میں آنے لگتے ہیں۔ اور یہ کارروائی ایسی لاپروائی بلکہ بیدردی کے ساتھ کیجاتی ہی کہ ہر طرف سے تڑاق پڑاق اور دھماکے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اب بیچارے تماشائی لوگ بڑبڑاتے دل ہی دلمیں ان لوگوں کو کوستے۔ گالیاں دیتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں اور رکی تھمی چال سے باہر نکلنے لگتے ہیں۔ کسی تماشائی کی اتنی مجال نہیں ہوتی کہ ان سرکاری آدمیوں سے مقابلہ پیش آسکے کیونکہ اُنکو ایسے ہر ایک برتاؤ کا کلیۃً اختیار حاصل ہوتا ہی۔ چونکہ ایسے موقع پر ڈنڈے مارنے اور کوڑے پھٹکارنے کی رسم پڑ گئی ہی لہذا نہ کسی کو ناگوار ہوتی ہی نہ کوئی اُسے بیجا سمجھتا ہی چنانچہ کبھی کبھی کسیکے اس زور سے گدّا رسید کیا جاتا تھا کہ وہ بیچارہ تلملا کے رہجاتا تھا لیکن بجز اسکے کہ بھوچکا ہو کے وہ سپاہی کو دیکھنے لگے اور کچھ نہ کر سکتا تھا اور میاں سپاہی کو اسپر کچھ اعتنا نہ ہوتی تھی وہ اپنی لاپروائی کے ساتھ کوڑے کو بل دینے یا ڈنڈا تاننے میں مصروف ہوتے تھے۔ تماشائیوں کے واسطے یہ وقت بڑی مصیبت کا ہوتا تھا کہ ہر طرف یکایک کوڑے چھٹکتے دیکھتے تھے اور چوں نہ کر سکتے تھے مغلظات گالیاں سنتے اور ذلتیں سہتے تھے مگر جواب نہ دے سکتے تھے۔ اُسوقت ہاتھ اور کمر کے سب ہتھیار بھی بیکار ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ وقت ہی اسکا نہ ہوتا تھا کہ برا مانیں اور مقابلہ کریں۔ یہ سب رسم اور دستور کے کرامات ہیں۔ واقعی یہ ہے کہ دریاے انڈس کے مشرق جانب "وہ دستور" اور "وہ حق"

مترادف لفظیں ہیں۔

اتنے عرصے میں امام باڑے میں مہندی کے داخل ہونے کا پورا پورا انتظام ہوجاتا ہی۔ اور
اور مہندی بھی امام باڑے کے بالکل قریب پہونچ جاتی ہی۔ اب امام باڑے میں بالکل سناٹا ہوگیا ہی۔
جس پھاٹک سے تماشائی نکال باہر کیے گئے ہیں وہ بند کر دیا گیا ہی۔ باہر کا مربع صحن جسمیں ہر طرف
روشنی ہوتی ہی چشم منتظر بنا ہوا ہی۔ پیچھے مہندی کا جلوس آنے لگا۔ ہاتھی۔ اونٹ۔ اور گھوڑے
تو پھاٹک کے باہر ہی چھوڑ دیے گئے سپاہی۔ جلو میں بردار۔ اور باجے والے امام باڑے
کے صحن میں رہے۔ انکی وجہ سے ایسا مجمع ہوجاتا ہے کہ تل دھرنے کی جگہ خالی نہیں رہتی اور زمین
کی پچی کاری کا فرش بالکل چھپ جاتا ہے۔ یہ لوگ داہنے بائیں پرا جما کے کھڑے ہوجاتے ہیں
اور بیچ میں راستہ چھوڑ دیتے ہیں جسپر سے پہلے تو مہندی کا اصلی سامان آنا شروع ہوتا ہی۔
یعنے نقرئی کشتیوں میں ہر قسم کی مٹھائیاں۔ خشک میوے۔ پھولوں کے ہار گجرے۔ چھپر کھٹ
اور گلدستے جنھیں زرق برق پوشاکیں پہنے ہوے ملازمین اپنے ہاتھوں یا سروں پر لیے ہوتے
ہیں اب اسیوقت نہایت نفیس آتشبازی بھی چھوٹنے لگتی ہی۔ پھر اس سامان عروسی کے بعد
دولہن کی نقرئی پالکی جیسی بیگمات کی سواری کی ہوتی ہی آتی ہی اوسکے آگے بہت بھڑک
کی وردی پہنے ہوے مشعلچی ہاتھوں میں مشعلیں لیے ہوتے ہیں۔ پھر مشعلوں کی روشنی میں باجے والوں کی
چوکیاں آتی ہیں۔ یہ لوگ بہت عمدہ باجے بجاتے ہوے ہنسی خوشی اس سامان عروسی کو
امام باڑے کے وسیع دالان کے اندر لیجاتے اور وہاں گشت لگاتے ہیں۔ پھر یہ سب سامان تعزیے
پر چڑھا دیا جاتا ہی۔ کیونکہ اس ساری دردسری کا حاصل اتنا ہی ہوتا ہی کہ بعد چندے اوسے
بھی تعزیہ کے ساتھ کربلا لیجائیں۔ ہنوز سامان عروسی پوری طرح اماباڑے میں پہونچ بھی نہیں
چکتا ہی کہ عزاداروں کا ایک گروہ سر جھکائے منھ لٹکائے۔ ماتمی لباس پہنے اور غمگیں صورت بنائے
امام باڑے میں آجاتا ہے۔ چونکہ شادی اور شہادت ایک ہی روز ہوئی تھی اسلیے سامان عروسی
کے پاشنہ کوب یہ سامان غم و ماتم بھی ہوتا ہی۔ اسکے بعد حضرت قاسم کا تابوت چند خادم کاندھوں پر
اٹھاکے لاتے ہیں اور اسکے ساتھ عزاداران مغموم صورت کا مجمع ہوتا ہی۔ بعض اوقات ان لوگوں
کے ساتھ ایک گھوڑا جو حضرت امام قاسم کا سمجھا جاتا ہی اور جو اسی غرض سے سدھایا جاتا ہی،
بھی ہوتا ہی۔ اس گھوڑے پر امام قاسم کی زرہ۔ پگڑی انکی کمان اونکا خنجر اور تیروں سے بھرا ترکش
بھی ہوتا ہی۔ اور اسکے اوپر کا چوبی و نقرئی نشان بنا ہی یعنے چتر اور آفتابہ سایہ کنا ہوتا ہے

اگر اس گھوڑے کو امام باڑے میں لاتے ہیں تو وہ ایسا شائستہ ہوتا ہے کہ جس پر کامل اطمینان ہو سکتا ہے۔ وہ اس شان اور متانت سہولت کے ساتھ امام باڑے کے دالان میں گشت لگاتا ہے کہ جی چاہتا ہے۔ بس دیکھا کرے۔ اندر کا حال تو بس اس قدر بیان کے قابل تھا جو بیان کیا گیا کیونکہ یہاں اب صرف مجلس ہوتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا اب باہر کا بیان کرتا ہوں کیونکہ وہاں بھی کچھ رسوم ادا ہوتے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ عوام الناس کے مذاق کے مناسب ہوتا ہے کیونکہ اندر کا اندوہناک سماں عوام کے لیے بالطبع مرغوب نہیں ہو سکتا۔ وہاں سبھی قسم کی مخلوق جمع ہوتی ہے بوڑھے بالے۔ زن مرد۔ ایک پر ایک گرتا ہے۔ انہیں غل غپاڑا۔ ہنگامہ۔ ہنسی۔ دل لگی چہل مذاق سبھی کچھ بے تمیزیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ روپیہ پیسہ لوٹنے کے منتظر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس ملک کا یہ ہندوانہ دستور ہے کہ بیاہ برات میں ہمیشہ کچھ روپیہ ضرور لٹایا جاتا ہے۔ اور مہندی کے بھی لوازم میں یہ بات داخل ہے پھر بھلا متروک کیونکر ہو سکتی ہے۔ درانحالیکہ یہ رسم عقد امام قاسم و دختر امام حسین ع کی یادگار میں کی جاتی ہے۔ چنانچہ عہدہ بردار لوگ جو اسی خدمت پر مامور و متعین ہوتے ہیں مٹھیاں بھر بھر کے روپیہ اور چھوٹے چھوٹے سکے چاندی کے اس آزادی و سیر چشمی سے دائیں بائیں لٹاتے رہتے ہیں کہ جسے دیکھ کے یورپین حضرات دنگ رہ جاتے ہیں لیکن ایسے موقع پر بلا خیال کسی زیر باری کے جی کھول کے خیرات و مبرات کرنے کو مسلمان لوگ ایک مذہبی فرض سمجھتے ہیں چنانچہ لکھنؤ کے کسی حکمران نواب کے زمانے کی یہ ایک معتبر زبانی روایت ہے کہ محرم کے زمانہ میں انہوں نے تین لاکھ روپیہ صرف کیا تھا لہذا خیرات و مبرات جلوس کے سامان۔ آرائش کی چیزوں بھاری بھاری پوشاکوں اور وردیوں (جو ایک مرتبہ کے سوا دوبارہ استعمال میں نہیں آتیں) کی طیاریوں میں جو کچھ نمود و نمائش ہوا کرتی ہے اسے دیکھ کے کسی کو متحیر نہ ہونا چاہیے۔ بیشک یہ بہت صحیح ہے کہ کسی حصہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دولت کا اندازہ ان کے سامان عزاداری محرم سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تمام قیمتی اور گراں بہا سامان ایک مرتبہ طیار کر کے رکھ لیا جائے اور ہر سال استعمال میں آیا کرے کیونکہ اس سے اخراجات میں بہت تخفیف کی صورت نکل سکتی ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کرتا۔ بلکہ جو شے ایک بار استعمال میں آجاتی ہے پھر وہ دوسرے سال ہرگز استعمال میں نہیں آتی اور زمانہ عزاداری کے خاتمے پر یہ سارا سامان غریبوں اور حاجتمندوں کو تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محرم کے زمانہ میں عام لوگ نہایت جوش و خروش ظاہر کرتے ہیں اور اس سے پریشان نہیں ہوتے۔ میں نے ابھی ایام عزاداری کا بیان انجام کو نہیں پہنچایا ہے۔ امام باڑوں میں یہ تمام سامان آرائش انعقاد مجالس عزا۔ شادی و غم کے جلوس

کا اس کر و فر سے مہندی اور علموں میں اٹھنا یہ سب تو ابتدائی مراتب ہوتے ہیں۔ اور اُنکے انتہا میں ایک حد درجہ دلکش و دلفریب سماں نظر آتا ہی۔

واضح ہو کہ دونوں امام مظلوم زیر زمین دفن ہیں۔ اور ابھی صرف اُنکی شہادت کے اور اُس کے پیشتر کے واقعات کی یاد تازہ کی گئی ہی۔ لیکن اُنکے جنازہ اُٹھانے اور تجہیز و تدفین کی ساری رسمیں ابھی باقی ہیں۔ چنانچہ جنازہ اُٹھانے میں بھی بہت کچھ اہتمام کیا جاتا ہی۔ اور تدفین اور ضریح مبارک کی نقل کے بابت (جو کربلا میں ہوتی ہی) ہر ایک متمول اور ذی مقدور خاندان نے بہت زمانہ پیشتر سے بڑے بڑے بندوبست کر رکھے ہیں۔ یعنے تدفین کے واسطے بڑی بڑی عالیشان کربلائیں لوگوں کے اسلاف عرصہ سے بنا گئے ہیں۔ یہ کل کربلائیں شہر کی دیواروں سے فاصلۂ دراز پر واقع ہوئی ہیں اور بڑے تڑکے سے بیشمار مخلوق کے گروہ کچھ تو تماشہ دیکھنے اور کچھ بغرض شرکت بعض مراسم مذہبی وہاں جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ کھانے پینے کا بہت کچھ سامان ہوتا ہی اور وہ سامان بھی ہوتا ہی جو مسلمان کی قبروں میں رکھتے وقت درکار ہوتا ہی۔

چونکہ امام حسین کی شہادت میں فوجی حیثیت غالب تھی لہذا ہر طرح یہ کوشش کیجاتی ہی کہ ساری نمائش میں فوجی شان اور جنگی آن بان قایم رہے۔ چنانچہ جلوس میں بیشتر جھنڈیاں بیرقیں ہوتی ہیں جن کے پھریرے اور پرچم ہوا میں اوڑتے ہوتے ہیں۔ بینڈ باجے ہوتے ہیں جو رزمیہ گتیں بجاتے ہیں۔ پھر سپاہی منش لوگ اپچی بنے ہوئے بندوقیں پستولیں داغتے۔ اور ڈھالیں تلواریں ہلاتے چمکاتے نکلتے ہیں اور ان چیزوں کو دیکھکے ہر شخص کے متخیلہ کے سامنے پورا میدان جنگ کا سامان پیش ہو جاتا ہے امرا کے تعزیوں کے پیچھے پیچھے غریب غربا کے تعزیہ بھی ہوتے ہیں کیونکہ انکے جلوس اور بھیڑ بھبڑ میں اُنکو کہاں بار مل سکتا ہے۔ لہذا وہ اپنے حد سے تجاوز نہیں کرتے علاوہ اسکے بعض مواقع پر متعصب سنی لوگ بہ نیت حملہ یا مزاحمت کھڑے نظر آتے ہیں کیونکہ یہ مخالف فرقہ اور عقیدہ والے لوگ اس کل سامان کو بیہودہ اور فی الحقیقت ناپاک تصور کرتے ہیں۔ تعزیوں کے جلوس میں جو سامان ہوتا ہو ایک ہی قرینہ سے سب جگہ ہوتا ہی یعنے سب سے پہلے علم ہوتے ہیں اس طرح سے کہ ہاتھی کے ہودج پر کچھ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اور اُنکے ہاتھوں میں کپڑے سے منڈھی ہوئی چھڑیں بانس کی ہوتی ہیں جنکے سروں پر پنجے اور پنجوں کے نیچے لانبے پٹکے لگے ہوتے ہیں۔ اگر کسی کا تعزیہ دھوم سے اُٹھتا ہی تو دو تین یا پانچ چھ ہاتھیوں پر اسی طرح علم ہوتے ہیں۔ پھر اسکے پیچھے باجے والوں کی چوکیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے

باجوں میں مرثیے یا نوحے کہتے ہوئے چلتے ہیں۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس جگہ پر سب باجے والے برابر اپنے باجے بجاتے ہونگے اور ایک کے بعد ایک چوکی بجانیوالوں کی چلتی ہوگی تو وہاں باجوں کے تال سُر کی آواز کیا خاک سمجھ میں آتی ہوگی۔ پھر انکے بعد ایک آدمی بڑی لانبی چھڑ میں ایک الٹی کمان لگائے اور کمان کے دونوں سروں میں دو تلواریں لٹکائے نکلتا ہے۔ اور اسے کچھ لوگ سنبھالے ہوتے ہیں جنکے ہاتھوں میں جھنڈیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان جھنڈیوں کے سیاہ ریشمی پھریرے ہوا میں لہراتے ہوتے ہیں اور انکے پیچھے دُلدُل گھوڑا ہوتا ہے جسکے دائیں بائیں دو سائیس لگام تھامے ہوتے ہیں۔ اور اسکے آگے آگے ایک افسر نشان شاہی یعنے آفتاب لیے ہوئے اور دوسرا افسر اسکے اوپر چتر لگائے اور اسکے ساتھ کچھ لوگ گھوڑے کا نقرئی زیور وغیرہ لیے ہوئے اور بہت سے لوگ چھوٹی چھوٹی سبز رنگ کی جھنڈیاں لیے ہوئے ہوتے ہیں اور دُلدل کے زین پر سنہری کام کی بیش بہا پگڑی۔ شمشیر آبدار۔ پرتلہ۔ ترکش۔ کمان۔ اور دیگر اسلحہ رکھے ہوتے ہیں اور اکثر اس گھوڑے کے پیچھے صاحب خانہ بحیثیت سرخیل عزاداراں ہوتا ہے واضح ہو کہ اس عنوان سے اور ایسے بھیڑ بھبڑ کے ساتھ کئی میل تک پا پیادہ چلنا کچھ آسان نہیں ہوتا پھر اسکے پیچھے کچھ لوگ نقرئی و طلائی انگیٹھیاں لیے ہوتے ہیں جن میں چاندی سونے کی زنجیریں لگی ہوتی ہیں (جسطرح کہ رومن کیتھولک گرجاؤں میں ہوتی ہیں) اور لوبان وغیرہ خوشبوئیات سلگتی ہوتی ہیں۔ صاحب خانہ اور اسکے احباب ہی کے ساتھ مرثیہ خواں بھی ہوتے ہیں۔ یہ سب سوگوار برہنہ سر ننگے پاؤں ملول و غمگیں صورت بنائے ہوتے ہیں اور اکثر ان لوگوں کے برہنہ سروں پر گرد یا بھوسہ پڑا ہوتا ہے۔ یہی ممیز علامت انتہائے غم و الم کی ہے۔ پھر انکے پیچھے ضریح مبارک ہوتی ہے جسکے اوپر سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ تنا ہوتا ہے۔ تعزیہ بانسوں پر رکھا ہوتا ہے اور اسے بہت سے لوگ اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوتے ہیں۔ پھر اسکے بعد امام قاسم کا تابوت اور اُنکی بی بی کی بند پالکی اور بہت سی کشتیاں تحفہ تحائف اور سامان عروسی کی سلسلہ وار ہوتی ہیں۔ پھر سب سے آخر میں اونٹوں اور ہاتھیوں پر لشکریان امام تشنہ کام کا خیمہ و خرگاہ اسطرح بار ہوتا ہے جسطرح انھوں نے مدینہ سے کربلا کی طرف کوچ کیا تھا۔ یہ سب ضروری لوازم اور سامان عزاداری کے بالعموم تعزیوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ علاوہ ان کے ہندوستانی طمطراق اور داد و دہش کا سامان بھی ہوتا ہے یعنے ایک قطار اونٹوں یا ہاتھیوں کی ہوتی ہے جنپر معتمد اور مستعد ملازمین سوار ہوتے ہیں اور وہ راستہ بھر روپے پیسے اور روٹی غربا و مساکین کو

برابر تقسیم کرتے چلتے ہیں۔ مسلمان عورتوں کے عقیدے میں یہ روٹی جو اسطرح تعزیے کے ساتھ تقسیم کی جاتی ہی۔ ایک تبرک ہوتی ہی۔ چنانچہ وہ اپنے نوکروں چاکروں کو اس کام پر تعینات کر دیتے ہیں کہ جاکے ایک ٹکڑا روٹی کا مانگ لاویں۔ حالانکہ وہ خود منوں آٹے کی روٹیاں خیرات کرتے کراتے رہتے ہیں۔ عام عقیدے کے موافق زمانہ محرم میں فقرا و مساکین پر بخشش و ایثار کرنا نہایت مستحسن و موجب صد برکت سمجھاتا ہی۔

چونکہ شہر کے مختلف راستوں سے برابر تعزیے نکلتے ہیں اسوجہ سے تمام گلی کوچے توپ بندوق اور پستول کی آوازوں اور "حسن حسین" کی صداؤں سے گونج اُٹھتے ہیں جب تعزیے کربلا میں پہونچ جاتے ہیں اُسوقت معمولی طور پر دفن کر دیے جاتے ہیں۔ اسی غرض سے کربلا میں پہلے سے قبریں کھدوا رکھی جاتی۔ اور اُنھیں گڑھوں میں تعزیے مع کل تحایف عروسی۔ ہار پھول خوشبو وغیرہ کے گاڑ دیے جاتے ہیں۔ اکثر اس موقع پر شیعہ سنی کا پرانا جھگڑا تازہ ہو جاتا اور فتنہ و فساد کا شعلہ بھڑک اُٹھتا ہی۔ یعنی نقلی تجہیز و تدفین میں شور و شر اور اصلی کشت و خون کی نوبت پہونچ جاتی ہی اور اُسمیں کچھ نہ کچھ جانیں بھی تلف ہو جاتی ہیں۔

محرم کے روزے رمضان کے روزوں سے کہیں متغایر و مختلف ہوتے ہیں۔ رمضان کے روزے تیس دن کے ہوتے ہیں اور وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے نزدیک فرض ہوتے ہیں سبھی ہندوستان کے دریاے گنگا سے سیراب ہونے والے مسلمان اور افریقہ غربی کے بحر اطلانٹک سے پیاس بجھانیوالے مسلمانان قیروان سب برابر ہیں اور یکقلم تیس روزے رکھتے ہیں یعنے مابین طلوع و غروب آفتاب کھانا۔ پینا۔ حقہ۔ پان۔ قطعاً چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن محرم[عہ] کے روزے صرف شیعہ لوگوں نے دس دن کے واسطے وضع کر لیے ہیں البتہ جو ذرا زیادہ پابند مذہب ہیں وہ چالیس دن اسطرح محرم مناتے ہیں جیسے دونوں گروہ کے پابندان مذہب رمضان سے ایک مہینہ پیشتر اور ایک مہینہ بعد رمضان مناتے ہیں۔

محرم کے زمانے میں ہلوگوں کو حضوری شاہ کی عزت بخشے کے طور پر کبھی حاصل نہوتی تھی۔ وہ حسب معمول دربار صبحگاہی میں برآمد ہوتے تھے اور اُسمیں ہلوگ بھی حاضری دے آیا کرتے تھے۔ لیکن اکثر یہ دربار بھی ناغہ ہو جاتا تھا۔ اور تمام ملکی و مالی کام اس زمانے میں ملتوی ہو جاتے تھے۔ ہلوگوں کو اگر کسی امر خاص میں یا ضرورت شدید کی وجہ سے حضوری میں باریاب ہونے کی حاجت پڑتی تھی تو سہل سی تدبیر یہ تھی کہ ہر وقت بادشاہ سلامت اپنے مقرب بارگاہ خاصہ تراشوں سے

عہ) روزے کے بارہ میں مصنف کی تحقیقات محض غلط ہی - مترجم

اصلاح بنواتے ہوتے تھے اسوقت حاضر حضور ہوجایا کرتے تھے۔

بادشاہ سلامت یونتو محتاط بہت تھے لیکن ایک مرتبہ اپنے خودمختاری کے زعم اور نیز بچپنے کی بگڑی ہوئی حالت کی وجہ سے وہ محرم کے زمانے میں انگریزی لباس پہنکے اور لندن کی نئی ٹوپی ہیکے امام باڑے میں چلے گئے تھے۔ اُسپر مسلمانوں نے بہت کچھ لعنتیں اور ملامت کی۔ اور لوگوں نے گردنیں ہلا ہلاکے اور داڑھیاں پھٹکار پھٹکار کے خوب اسکے چرچے کیے۔ ہم یوروپین ملازمان شاہی نے بھی اُنکے ہندوستانی مصاحبوں کیطرح اس حرکت کو بہت نازیبا اور معیوب سمجھا تھا۔ بلکہ حتی الامکان اُنکو یہی سمجھاتے رہتے تھے کہ ایسے مواقع پر اپنے قدیمی طریقے پر قائم رہیں اور قومی وضع کو ترک نہ کریں لیکن بادشاہ سلامت اپنے "راج ہٹ" کے مقابلے میں ہم لوگوں کی گفت وشنید کی ذرا پروا نہیں کرتے تھے۔ اُنکی عادت تھی کہ اُنکی خلاف مرضی جو صلاح ومشورہ یا پند ونصیحت ہوتی تھی اُسپر وہ کان دہرتے ہی نہ تھے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ رزیڈنسی میں لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ہم ہی لوگ اُنکی اس نازیبا حرکت کے محرک تھے۔ اگرچہ ہم لوگوں کی طرح صاحب رزیڈنٹ بخوبی جانتے تھے کہ دربار شاہی کا رنگ ڈھنگ کیا ہے مگر اُنکو اس بات کا علم صحیح کیونکر ہوسکتا تھا کہ ایسی خفیف الحرکاتی خود بادشاہ سلامت کے مزاج میں تھی۔ یا ہم لوگ یعنے اُسکے مصاحبین اُسکے محرک ہوتے تھے۔ البتہ اُنکے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ ہم لوگوں کی ترغیب ہی سے ایسے افعال اُنسے سرزد ہوتے ہیں۔ کلکتہ ریویو و نیز دیگر ہندوستانی اخبارات ہم لوگوں پر بالکل بیجا طور پر یہ الزام بھی عاید کرتے ہیں کہ ہم لوگ بادشاہ کے اسراف اور فضولی کے معین تھے۔ حالانکہ حقیقت میں ہم لوگ ان حرکات کو ویسی ہی بری نگاہ سے دیکھتے تھے جیسے یہ ہمارے الزام دہندہ حضرات۔ اور اگر ہمارا بس ہوتا تو ہم ضرور اُنکو روک دیتے۔ ہم نے خود بارہا اسے صدق دل سے قابل ملامت سمجھا اور حتی المقدور روکنے کی کوشش کی لیکن اس بارے میں ہماری کسی کی کوشش کارگر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

باب سیزدہم

لکھنؤ سے رخصتی

جن اسباب سے کہ مجھے اور نہ صرف مجھے بلکہ ایک اور ملازم خانگی صاحب اکو جنکی عزت و توقیر بادشاہ کی نگاہوں میں ہمیشہ مجھسے زیادہ رہی دربار لکھنؤ سے علٰحدہ ہونا پڑا۔ اسکی داستان کچھ بہت طول طویل نہیں ہو۔ خاصہ تراش کا رسوخ بادشاہ سلامت کے مزاج میں بڑھ رہا تھا اور اُسکے اقبال کا دریا اس جوش سے موجزن تھا کہ ہر شخص کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ یہ اُسترے قینچی کا کام جاننے والا عنان سلطنت کا مالک ہو رہا ہو اور حکومت کے اونٹ کو جس کل چاہتا ہو بٹھا دیتا ہو۔ صاحب رزیڈنٹ تک کو بھی رفتہ رفتہ اس جانب توجہ ہو گئی تھی اور اب یہ بات ہر شخص کے دل میں جم گئی تھی کہ اگر کسیکو دربار میں کچھ رسائی پیدا کرنا ہو تو اُسے سب سے پہلے خاصہ تراش سے راہ رسم پیدا کرنا اور اُسکی نظر عنایت اپنے حال پر مبذول کرا لینا چاہیے۔ لیکن خاصہ تراش کا یہ عروج بے وجہ نہ تھا۔ مختلف اسباب ایسے جمع ہو گئے تھے جنسے یہ نتیجہ پیدا ہو گیا تھا۔ نو عمری کی حالت میں ایک مدت تک مطلق العنان رہنے۔ اور پھر یکا یک دولت بے اندازہ ہاتھ آ جانے سے بادشاہ کی طبیعت میں ابتذال آ گیا تھا اور مذاق میں پستی پیدا ہو گئی تھی۔ اور خاصہ تراش نے بادشاہ کی افتاد طبیعت کو دیکھکے اسی میں اپنا فائدہ سمجھا کہ انھیں باتوں کو ترقی دے۔ اُسنے رفتہ رفتہ یہ کیا کہ بادشاہ کی نگاہوں میں اپنے آپ کو بہت اہم اور ضروری بنا لیا۔ اسمیں اُسکو ملکہ حاصل تھا کہ بادشاہ کو اپنی راہ پر ایسی چالاکی سے لگا لیتا تھا کہ بادشاہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ اُنکی مرضی پر کاربند ہو رہا ہو۔ آپ ہی سب کچھ کرتا تھا اور پھر الگ تھلگ رہتا تھا۔ بادشاہ کے ہاں شراب کا جسقدر صرف تھا وہ سب اُسکی معرفت آتی تھی لہذا بیر کی ہر بوتل سے جو وہاں کھلتی تھی کچھ نہ کچھ اُسکے ہتے ضرور لگ جاتا تھا۔ ایسی حالت میں اسکا نفع تو اسیمیں تھا کہ جسقدر ممکن ہو شراب زیادہ صرف کیجائے۔ اور اُسے کیا پڑی تھی کہ وہ بادشاہ کی بے اعتدالی میں خلل انداز ہوتا۔ پھر بادشاہ کی نظر عنایت جس خواص یا رنڈی منڈی پر ہوتی تھی وہ اپنی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ خاصہ تراش کے پیشکش ضرور کرتی تھی۔ ستے کہ نواب اور عساکر شاہی کے کمانیر صاحب نے بھی خیریت اسی میں سمجھی کہ اس مقرب بارگاہ کو گرانبہا تحف و ہدایا سے اپنے قابو میں کیے رہیں۔ اب ان حالات و واقعات کو سن سمجھ کے اور

اُسکی کمینہ طینت کو پیش نظر رکھکے ہرگز یہ محل تعجب نہیں ہو سکتا کہ اُسنے بادشاہ کی اُن معائب کی نشو و نما کی پوری کوشش کی جنسے اُسکو منفعت کثیر حاصل ہو رہی تھی۔

ہم ملازمان خانگی پر بادشاہ کی یہ معائب بالکل آشکارا تھی اور میں یقین کرتا ہوں کہ ہماری سب کی دلی تمنا یہی تھی کہ انکی اصلاح ہو جائے۔ بیشک ہماری آرزو یہی تھی کہ یہ خرابیاں رفع ہوں۔ لیکن ہمارا کسیکا بس نہ چلتا تھا۔ اور اگرچہ ہم لوگوں نے بارہا اپنے آپس میں اسپر صلاح و مشورہ بھی کیا مگر کوئی معقول تدبیر ہاتھ نہ لگی۔ ہم میں سے ایک صاحب جو ذرا زیادہ منہ لگے تھے اُنھوں نے آخر اپنے سر یہ خدمت لی کہ وہ بادشاہ سلامت کو افہام تفہیم کرینگے کہ یہ ہر وقت کی بیخودی ٹھیک نہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسا کیا۔ اور بادشاہ سلامت نے اُسوقت اُنسے قول قسم کی۔ تسلی دی۔ اصلاح کا عہد و پیمان کیا لیکن جو کچھ کیا اُسے طاق نسیان پر دھر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتوں سے خاصہ تراش کا مرتبہ کچھ اور بڑھتا ہی، ہاں گھٹنے کا کیا ذکر۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ بادشاہ اور اُنکے چچاؤں کے درمیان سخت دشمنی چلی آتی تھی۔ اور ان لوگوں نے بادشاہ کے والد کے اس منصوبے میں کہ بادشاہ کو مسند نہ ملے جو ساز کیا تھا اُسکو بادشاہ نے کبھی دل سے محو نہیں کیا۔ چنانچہ جب کبھی اُنمیں سے کسی کو بادشاہ لنچ کی دعوت میں مدعو کرتے تھے تو اُسکی غرض و غایت صرف اتنی ہی ہوا کرتی تھی کہ اُنھیں شراب پلا پلا کے خوب سرشار کریں اور سرشار کر کے اُنکو چھیڑیں اور ذلیل کریں۔ اس بارے میں جو واقعات میں آگے چل کے لکھونگا یقینا لوگ اُنکو باور نہ کرینگے۔ لیکن درحقیقت وہ لفظاً بلفظ صحیح و درست ہیں۔ کیونکہ ایسے واقعات کبھی حافظے سے فراموش نہیں ہو سکتے اور میں اُنکو اسی طرح حوالۂ قلم کرونگا جسطرح وہ پیش آئے تھے۔

انھیں کمسن چچاؤں میں سے ایک بار ایک صاحب کو بادشاہ نے مدعو کیا جب وہ آئے تو اُنکے سامنے نفیس شراب پیش کی گئی۔ اور جتنی وہ پی سکتے تھے اُس سے کہیں زائد اُنکو زبردستی پلائی گئی۔ کیونکہ خاصہ تراش دیکھ رہا تھا کہ بادشاہ جسطرح خود سرمست ہو رہے ہیں اُسی طرح اپنے چچا کو بھی سیہ مست کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہے ہیں کہ یہ فرتوت ایک بلا میں گرفتار ہو رہا ہے۔ لہذا اُسنے ایک نیا راگ مالا نکالا کہ ایک بار بیٹھے بیٹھے بول اُٹھا کہ قبلہ عالم۔ اسوقت تو اسکاچ ریل[1] ہونا چاہیئے۔

---

[1] ایک قسم کا انگریزی ناچ۔

اگر قبلہ عالم کی مرضی پاؤں تو میں میاں سعادت[لہ] کے ساتھ ناچوں۔" بادشاہ یہ سنکے پھڑک اُٹھے اور فوراً بولے "بہتر۔ بہتر" پھر اُنھوں نے اپنی کرسی پیچھے کھسکائی۔ گویا ناچ کیواسطے تیار ہوگئے اور بولے "بہت بہتر۔ بہت بہتر۔ ہاں ہاں خان تم ہمارے چچا جان کے ساتھ ناچو" اب تو سارا کمرہ جیتا جاگتا ہوگیا۔ اور ایک طرف گوشے میں رنڈیاں تو ناچ ہی رہی تھیں دوسری جانب بادشاہ سلامت خود ناچنے پر آمادہ ہوگئے۔ اگرچہ درحقیقت اُنکو منظور یہی تھا کہ خاصہ تراش اور چچا صاحب ناچیں۔ بیچارا پیر فرتوت اُسوقت اس مقرب درگاہ کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ اور وہ برابر چکر دیے چلا جاتا تھا۔ حتی کہ وہ بیچارے گھوم گئے اور اب بمشکل اُنکے قدم زمین سے لگنے لگے۔ اسی آپادھاپی میں خاصہ تراش نے بیچارے کی پگڑی بھی اُچھال دی اور وہ زمین پر گر پڑی۔ چونکہ ہندوستانیوں میں سر سے پگڑی اُتار لینا معیوب اور اہانت انگیز سمجھا جاتا ہی لہذا باوجود المست ہونے کے بڈھے بیچارے کو غصہ آگیا اور اُسنے فوراً اپنا ہاتھ پیش قبض پر ڈالدیا لیکن دم کے دم میں خاصہ تراش نے پیش قبض کو ہتھیا لیا اور میان سے باہر نکلنے ہی نہ دیا۔ پھر تو خاصی دست درازی شروع ہوگئی۔ اور ایک ایک کرکے کمر کی ڈواب۔ شالی پٹکا۔ زریں عبا و قبا۔ سب اُتر گئے جسوقت اس بیچارے کی یہ درگتیں ہو رہی تھیں ہم میں سے دو صاحبوں نے چاہا کہ بیچارے کو بچالیں لیکن بادشاہ نے ایک ڈانٹ بتائی کہ صاحب ہٹ جاؤ اور سیر دیکھنے دو۔ نہیں تو خدا کی قسم میں ابھی تم کو گرفتار کرادوں گا۔ اب تو مخمور اور سرشار بادشاہ (جو اپنے مقرب خاص کی ان اداؤں سے بہت محظوظ ہو رہے تھے) کا یہ عتاب دیکھکے سب اپنی اپنی جگہ تھم گئے کس کی طاقت تھی کہ چوں بھی کرتا۔

چند ہی منٹ میں بیچارے سن سفید بڈھے کی یہ نوبت ہوگئی کہ کمرے کے بیچوں بیچ میں ننگ دھڑنگ کھڑا کر دیا گیا۔ بدن پہ ایک دھجی نہ رہی۔ اور بادشاہ اُنکے اہالی موالی۔ رفیق رفقا اور خواصوں کا تودہ ظرافت بن گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا اور بیچارے پر پانی بھی ڈالا گیا اور لوگوں نے بودی مار سے مارا بھی۔ اُسکی اس حالت کو دیکھکے بہت ترس آتا تھا کہ اگرچہ بیچارا نشہ سے چور تھا لیکن پھر بھی اتنے حواس باقی تھے کہ اپنی اس ذلت و خواری پہ دونوں ہاتھوں سے بار بار منہ ڈھانپتا اور زار قطار رو رہا تھا۔

پیارے ناظرین! آپ غالبا پکار اُٹھیں گے کہ "کیوں جی! تم سب لوگ بیٹھے یہ سب تماشہ دیکھا کیے۔ اور کسی سے اتنا نہو سکا کہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اور بیچارے کو بچا لیتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ

[لہ] بادشاہ کے ان چچا کا یہی نام تھا۔

ہمنے کئی بار مداخلت کا قصد کیا۔ لیکن ہر بار سختی سے جھڑکے اور ڈانٹے گئے۔ بلکہ یہاں تک نوبت پہونچ گئی کہ ایک بار کچھ مسٹنڈے ننگی تلواریں لیکے ہمارے سروں پر مسلط کیے گیے کہ ہم لوگ چوں نہ کر سکیں۔ آخرکار ہم سے یہ دیکھا نہ گیا اور بڑی بیزاری کے ساتھ ہم لوگ چل کھڑے ہوئے۔ اُسوقت ہم لوگ اس قدر نفور تھے کہ ہمنے معمولی مراسم تعظیمی میں بھی کوتاہی کی اور بادشاہ سلامت جو ہمارے دخل در معقولات سے زچ ہو رہے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم اُنکا عیش منغص کر رہے ہیں انھوں نے بھی نہایت بے پروائی اور سرد مہری کے ساتھ ہم لوگوں کو اُٹھ جانے دیا۔

ہمارے چلے آنے کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہمکو بعد ازاں معلوم ہو گیا۔ یعنے جب یہ بیچارا بالکل ننگا ہو چکا تو بادشاہ نے اوسے ناچنے پر اصرار کیا اور خاصہ تراش صاحب اُنکا ساتھ دیتے رہے اب اسوقت محل کے تمام ملازم زن و مرد۔ ہر درجہ اور طبقہ کے جمع ہو گئے کہ جہاں پناہ کے چچا صاحب کی جو کچھ درگت ہو رہی ہی اُسکا تماشہ دیکھیں۔ اور یہ سارا اُلہڑ اُسوقت تک مچا کیا جب تک جہاں پناہ کثرت مے نوشی کے سبب بالکل چور نہیں ہو گئے۔ اسوقت البتہ اس بیچارے کی جان چھوٹی۔

اودھ کی طرح اور جتنے دیسی دربار ہیں سب کا یہ حال ہی کہ وہاں بادشاہ کی ذات ہی سب کچھ ہوتی ہی۔ اور اُسکے عزیز اقارب کی وقعت کمتر درجے کے آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ حتی کہ وہ شخص جو مثلاً اپنی ذرا گلے بازی سے بادشاہ کو راضی و خرسند کرے یا وہ چھوکری جسکے ناچ کی ادا پر بادشاہ ذرا فریفتہ ہو جائیں اُنکی عزت و توقیر کے مقابلے میں بادشاہ کے سگے بھائی یا اُنکی ماں بھی ہمسری نہیں کر سکتی۔ اور چونکہ بادشاہ کو ہمیشہ رعایا کی موت و زندگی پر پورا اقتدار حاصل ہوتا ہے لہذا یہ ضرور ہے کہ اُنکے ایسے عیش میں کوئی خلل انداز ہو اور نہ انکے جور و جفا میں کوئی ہاتھ پکڑنے والا۔ بلکہ وہ جو چاہیں مطلق العنانی کے ساتھ کرتے رہیں اور نہ اس کا نتیجہ مظلوم کے حق میں کچھ اچھا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مثلاً ایک بات ایسی ہی جو کسی وقت محض گھڑی دو گھڑی کی تفریح سمجھ کے کی گئی ہی۔ اب اگر اسمیں کسی نے ذرا روک ٹوک کی تو ضد اور استبداد پیدا ہو کے وہ ایک مستقل اور دیرپا زحمت و خرابی کا سبب ہو جائیگی علی الخصوص اگر کبھی یورپین لوگ کسی بات میں دخل در معقولات کر بیٹھتے تھے تو بادشاہ کو اور بھی ضد پڑ جاتی اور کد سی ہو جاتی تھی۔ کیونکہ اُنکا غم و غصہ یورپین لوگوں پر تو اُتر سکتا نہ تھا۔ چار ناچار اُسی غریب کے سر جاتی تھی جسکی حمایت یہ لوگ کرتے تھے۔ چنانچہ جب بختاور سنگھ پر اُسکی بیجا ظرافت سے عتاب نازل ہوا تھا (جسکا ذکر کسی گذشتہ باب میں ہو چکا ہی) تو اُسوقت اُسکو جو کچھ

دھڑکا تھا یہی تھا کہ کہیں ہم یا وہیں ملازمان خانگی اس بیچ میں نہ پڑیں۔ حتی کہ اُسنے خود ایکبار یہ بیان کیا تھا کہ "اگر کہیں آپ لوگ اس بیچ میں پڑتے اور میرے حمایتی بنکے میری سفارش کرتے تو پھر میری جان ہی جاتی اور دنیا میں کوئی قوت ایسی نہ تھی جو مجھے بچا سکتی۔

جس موقع کا میں نے بیان کیا ہے اُسوقت بادشاہ نے اپنے چچا سعادت سے یہی برتاو کیا تھا اور اس سے بیشتر ہم لوگ اسی قسم کا ایک اور سماں دیکھ چکے تھے۔ اسوقت جس غریب کے سر بلا نازل ہوئی تھی وہ ایک نو عمر طوائف تھی کوئی سن سفید بوڑھا نہ تھا۔ اور اگرچہ اُسنے بہت کچھ ہاتھ پانوں مارے۔ ہاے واے کی۔ بلکہ اپنے تحفظ کے واسطے لڑتی جھگڑتی رہی لیکن خاصہ تراش (جو دونوں دفعہ اصلی محرک اور کارکن تھا) اپنے حرکات سے باز نہ آیا اور اُس غریب کو ستا ستا کے بادشاہ کا دل خوش کرتا رہا۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ اُسکے برائے نام شوہر نے جو اُسکے سنگتیوں یا طبلیوں میں تھا (واضح رہے کہ یہ ناچنے والیاں ہمیشہ اپنے سنگتی ساتھ رکھا کرتی ہیں) جب یہ سیر دیکھی کہ اُسکی اس دُرگت سے جہاں پناہ محفوظ ہو رہے ہیں تو وہ بھی خاصہ تراش کا شریک حال اور معین و مددگار ہو گیا۔ دیکھو ایک خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کے دربار کے حاضر باش اور حاشیہ نشین اخلاق سے کسقدر معرا اور بد اخلاقی میں کیسے بیباک ہو سکتے ہیں۔

حقیقت میں یہ سب حرکات جیسے مذموم و رکیک تھے اور ہمنے بار ہا بادشاہ سے یہ عرض معروض کی کہ ہمارے نزدیک یہ بالکل گناہ [illegible] ہیں۔ بلکہ یہانتک کہا کہ ہمکو تو ایسی باتوں سے بڑی نفرت ہوتی ہے۔ لیکن بھلا اُنکو ہماری ناپسندیدگی یا نفرت کی پروا ہی کیا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اسکے بعد جو کچھ واقع ہوا اور بدتر ہوا۔

بادشاہ کے ایک اور چچا جنکا نام آصف تھا اور جو سعادت سے زیادہ معمر اور ضعیف تھے ایک روز بادشاہ کے ڈنر میں مدعو کیے گئے۔ ابھی ہم لوگ ایک بغل کے کمرے میں بیٹھے جہاں پناہ اور اُنکے مقرب بارگاہ خاصہ تراش کا انتظار کر رہے تھے۔ آصف بھی ہمارے ساتھ تھے کہ ایکبار اُنھوں نے مجھے الگ لیجا کے چپکے چپکے یہ پوچھا کہ "مجھے بادشاہ نے کیوں بلایا ہے۔ آخر مجھسے کون کام لینا ہے؟" میں نے جواب دیا کہ "صرف اپنے ساتھ خاصہ نوش کرنے کے لیے آپ کو یاد فرمایا ہے"۔ اسپر اُنھوں نے بہت حسرتناک طریقہ اور درد بھری آواز سے کہا جسپر میرا بھی دل بھر آیا کہ "بھلا تم دیکھو تو کہ میں کسقدر سن رسیدہ ہوں میرے سن سفید بال دیکھو۔ میری دھندلی اور جالے کی ماری آنکھوں پہ خیال کرو۔ بھلا میں اپنے نوجوان بھتیجے کی صحبت کے قابل ہوں کہ جو شباب میں بھرا الھڑپنے میں

ڈوبا ہوا ہے مجھے تو آثار اچھے نظر نہیں آتے کیونکہ جب کبھی ہم ایسوں کو وہ یاد فرماتے ہیں تو کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔" میں نے اُنکو تسکین دی کہ "نہیں آپ ایسا خیال نہ کیجیے اور کچھ ڈریے نہیں۔ ابھی اُس دن بادشاہ نے آپکے بیٹے کو خاصہ کے وقت یاد فرمایا تھا اور اُنسے اچھی طرح پیش آئے تھے" اسپر وہ بولے کہ "ارے تم نہیں جانتے جب نصیر الدین حیدر کے باپ مرے ہیں تب میرا بیٹا اودھ میں نہیں تھا اور نہ وہ اُسوقت اودھ میں تھا جب غازی الدین حیدر نے ہم لوگوں سے وعدہ وعید کیے تھے کہ نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی سے مخالفت کریں۔ اسیوجہ سے نصیر الدین حیدر کو میرے بیٹے سے کچھ رنج و ملال نہیں ہے جو کچھ ہے وہ مجھسے ہے۔ میں تو خدا سے یہی دعا مانگتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے بعافیت گھر میں پڑا رہنے دیں۔ کیا اُنکے خوش کرنے کو سارا شہر اور شہر میں جو کچھ ہے کافی نہیں ہے"۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ کہ بادشاہ سلامت اپنے مقرب بارگاہ کے بازو کا سہارا دیے ہوئے نمودار ہوئے۔ آتے ہی آتے اُنھوں نے شاہانہ انداز سے ہمارے سلام لیے کیونکہ اسوقت انپر خاص قسم کا رعب داب تھا۔ پھر انھوں نے آصف اور میرے اوپر نگاہ ڈالی اور قریب آکے بولے کہ "چچا آصف خیر مقدم۔ خوش آمدید" پھر ہاتھ بڑھا کے ملایا اور کہنے لگے کہ آپ تو کبھی میرے یہاں تشریف ہی نہیں لائے۔ آنکھیں ڈھونڈھا کیں" اسپر آصف نے بادشاہ کا ہاتھ ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا کہ "جہاں پناہ کی عنایات نے غلام کو سرفراز فرمایا" بادشاہ آگے بڑھے اور کہنے لگے "آئیے میں آپکو میز پر لے چلونگا" ہملوگ بھی پیچھے پیچھے ہو لیے۔ اُسوقت کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ بادشاہ اپنی کرسی پر متمکن ہو گئے جو وسط میں ذرا بلندی پر بچھی تھی۔ ہملوگ دائیں بائیں اپنی اپنی معمولی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ آصف کو ٹھیک بادشاہ کے سامنے جگہ ملی۔ اور اُنکے اغل بغل کوئی نہ بیٹھا۔ جب کبھی بادشاہ سلامت کسی ہندوستانی کو خاصے پر یاد فرماتے تھے تو وہ اسی مقام پر بیٹھتا تھا جہاں آصف بیٹھے تھے۔ یعنی ٹھیک بادشاہ کے روبرو۔

پہلے مڈیرا شراب کی ایک بوتل کھلی اور آصف کے سامنے رکھ دیگئی۔ پھر یخنی آئی۔ پھر مچھلیاں پھر اور رنگین کھانے اور لذیذ غذائیں آتی ہیں۔ بادشاہ سلامت آصف کے ساتھ شراب پیتے رہے۔ بیچارا بڈھا جام پر جام چڑھاتا چلا گیا۔ اور اپنی عادت کے بموجب بار بار اپنی سفید مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا۔ اتنے میں بادشاہ نے ہملوگوں میں سے ایک صاحب کی طرف خطاب کرکے فرمایا کہ "کیوں جی! تم ہمارے چچا آصف کا ساتھ نہیں دیتے" پھر ہر ایک سے مخاطب ہوکے یہی فرمایا۔

چنانچہ باری باری ایک شخص انھیں اپنا ہم پیالہ بناتا اور اپنے ساتھ جام پلاتا رہا۔ اسی طرح کئی دورے ہو گئے۔ چوتھا یا پانچواں دورہ تھا کہ اُنھوں نے جو گلاس رکھا تو آدھا خالی کر کے رکھا۔ بادشاہ کی نظر فوراً اسپر پڑی اور اُنھوں نے اپنے چچا کی صورت پر پوری نظر جما کے ذرا خشونت کے ساتھ کہا کہ "کیوں صاحب! کیا میرے ہاں کی شراب اچھی نہیں ہے۔ اسپر آصف نے شراب کی ثنا و صفت کی اور جو کچھ گلاس میں باقی رہا تھا پی گئے۔

دسترخوان بڑھا دیا گیا۔ اور آخر کار میوہ جات میز پر آنے لگے میوہ جات ہی کے ساتھ معمولی کھیل تماشے بھی شروع ہوے۔ اُس رات کچھ بھان متی کے سوانگ تھے اور کچھ ناچنے والیاں لیکن بادشاہ ادہر بہت ہی کم ملتفت ہوے اُنکی نگاہیں برابر آصف ہی پر پڑتی رہیں۔ اب وہ مڈیرا کی بوتل جو آصف کے سامنے رکھی گئی تھی قریب قریب بالکل خالی ہو گئی یہ دیکھکے بادشاہ سلامت نے خاصہ تراش سے مخاطب ہو کے فرمایا "کچھ دیکھتے بھی ہو۔ آصف نواب کو اور شراب دینا چاہیئے۔ جاؤ اُن کے واسطے دوسری بوتل لاؤ" اور جب وہ بوتل لینے چلا تو بادشاہ نے ایک معنی خیز ادا کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں کچھ بات چیت ہو گئی۔ آصف بیچارے نے بہت نہیں نہیں کی اور زور زور سے مونچھوں کو بل دیے۔ لیکن اُنکی ایک نہ چلی۔ اگرچہ اُسوقت وہ بہت تکلیف اور تمکنت سے بیٹھے ہوے تھے۔ لیکن شراب کی وجہ سے عالم سرخوشی طاری تھا۔ میں تو خاصہ تراش کی بوتل لانے کیواسطے اٹھنے ہی سے کھٹک گیا تھا کیونکہ وہاں بہتیرے ملازم موجود تھے ایسی حالت میں خاصہ تراش کا اُٹھکے جانا ثابت کر رہا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے بعد کو جو تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ پھر جو بوتل آئی اُسمیں نصف مڈیرا تھی اور نصف برانڈی۔ اسکی تصدیق مجھے اُسی خدمتگار سے ہوئی جسنے خاصہ تراش کی اعانت اس بارے میں کی تھی۔ جب یہ بوتل آگئی تو بادشاہ نے کئی جام صحت تجویز کیے۔ پہلا تو اپنے بھائی "شاہ انگلستان" کا پھر "اپنے دوستدار گورنر جنرل ہندوستان" کا۔ پھر اسی طرح اور۔ اور آصف بیچارے کو اصرار اور زبردستی سے برابر شراب پینا پڑی۔ حتے کہ اب وہ بالکل نشہ میں بیخود ہو کے جھومنے لگے۔ وہ اپنی ہتھے دار کرسی پر بڑی بیکلی سے بیٹھے تھے اور اُنکا سر کبھی ادہر جھکتا تھا کبھی اُدہر۔ کیونکہ ہر مرتبہ وہ اپنے کو سنبھالتے اور آنکھوں کو کھولے رہنے کی کوشش کرتے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ نشہ سے بالکل سرشار ہو گئے۔

یہ حالت دیکھکے بادشاہ خوش ہو گئے اور ایکبار خوشی خوشی اپنے منظور نظر کیطرف مڑے

اور بڈھے بیچارے کی خمیدہ گردن کی بابت کچھ ارشاد فرمانے لگے جسپر خاصہ تراش سرو قد کھڑے ہوکے بولا کہ "حضور! انکی مونچھیں بے ترتیب ہوگئی ہیں۔ انکو سنوار دینا چاہیے" اسپر بادشاہ ہنسے اور بولے "ہاں۔ خان! لے اٹھو اور اُنکی مونچھیں درست کردو۔ دیکھو اچھی طرح خوب کس کے بل دینا" خاصہ تراش اُٹھا اور بڑی بیدردی کے ساتھ دونوں طرف سے مونچھیں پکڑ کے کھینچنے لگا۔ ایسا کہ ہر جھٹکے میں سر کبھی ادھر جھک جاتا تھا کبھی اُدھر۔ یہ حرکت ایسی تھی کہ جس سے ہر شخص کو ایذا پہونچ سکتی تھی چہ جائیکہ ایک ضعیف۔ معمر۔ سن سفید بوڑھے کے واسطے۔ چنانچہ یہ بیدردی دیکھکے ہم میں سے دو صاحب بڑی بیتابی کے ساتھ اپنی کرسیون سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور غل مچانے لگے کہ "یہ کیا ظلم ہو رہا ہے" مگر بادشاہ سلامت بہت جھنجلا کے ہماری طرف پلٹ پڑے اور کہنے لگے۔ "دیکھو! خبردار! جو تمنے اپنی جگہ چھوڑی تو مجھسے برا کوئی نہیں۔ کیا یہ بڑھا سور میرا چچا نہیں ہے؟ ہمارا جو جی چاہیگا ہم اور خان اُسکی درگت بنا دینگے" ایسی حالت میں کون دخل در معقولات کر سکتا تھا۔ چون کرنا بھی بے سود تھا۔ بلکہ بیہودہ سے بھی زیادہ۔ کیونکہ شاید بیچارے بڈھے پر اور کچھ سختی میں زیادتی ہو جاتی۔ ابھی تک آصف کا سر بے تکان ہلے چلا جاتا تھا۔ آنکھیں البتہ خوب کھلی ہوئی تھیں اور جیسی سفاکی کے ساتھ مونچھوں کو تاؤ دیئے جا رہے تھے اُسے قہر درویش بجان درویش سمجھ کے انگیز کر رہا تھا۔ دو گھڑی بعد پھر آنکھوں پر جھپیان پڑ گئے اور انٹا غفیل ہو گیا شراب کے بے انداز پی جانے نے اُسے بالکل خودی سے باہر کر رکھا تھا۔ اسی عرصے میں تھوڑی دیر کے واسطے بادشاہ بھان متی کے تماشے اور رنڈیوں کے ناچ کی جانب متوجہ ہوئے۔ لیکن اُنکے تیور پر بل پڑے ہوئے تھے اور آنکھیں بھی خشمگیں تھیں۔ انکو ہم لوگوں کی آواز بھلی نہ لگی۔ یکایک بادشاہ کی نظر پھر بڈھے بیچارے پر پڑی کیونکہ جب وہ سامنے دیکھ رہے تھے تو اس بیچارے کے سر کے بار بار ہلنے سے حجاب ہو جاتا تھا۔ وہ بول اُٹھے کہ "اسکے سر کو تو قرار ہی نہیں ذرا ٹھیک کرنا چاہیے" فوراً ہی خاصہ تراش صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور جلدی سے سُتلی کا ایک ٹکڑا لے کے سرشار آصف کے سرپر پہونچ گئے۔ پھر سُتلی کے برابر برابر دو ٹکڑے کرکے اُسنے ایک ایک ٹکڑا دونوں طرف کی مونچھ سے باندھ دیا۔ ابھی تک ہم لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ لیکن بادشاہ سلامت خوش ہو رہے تھے کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ کیا ہونے والا ہے لہذا اس بات پر خوش تھے کہ نئی سوجھی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس مضبوطی سے اُسنے گرہ لگائی تھی وہ اُسی کا حق تھا۔ اور کوئی جسے قینچی استرے سے کبھی کام نہ پڑا ہو داڑھی مونچھ کے رموز و نکات کیا سمجھ سکتا تھا۔ لیکن۔ ابھی یہ معاملہ طلب تھا کہ

ستلی کے دوسرے سروں کا کیا انجام ہوگا۔ خاصہ تراش نے اس گتھی کو جلد سلجھا دیا اور ہم لوگوں کو زیادہ زحمت انتظار کھینچنا نہ پڑی۔ اس عرصے میں بڈھے بیچارے نے دو ایک بار آنکھیں بھی کھولیں اور کچھ بڑبڑایا بھی۔ لیکن مڈیرا اور برانڈی خوب دماغ پر تسلط کر چکی تھی۔ وہ آنکھیں کھولتا تھا مگر فوراً ہی بیخود ہو جاتا تھا۔

میں نے کہا ہے کہ خاصہ تراش نے ہم لوگوں کو زیادہ منتظر نہ رکھا۔ اُسنے ستلی کے ٹکڑوں کے دونوں سروں کو جس کرسی پر بڈھا بیچارا بیٹھا تھا اُسکے دونوں ہتوں سے کس کے باندھ دیا۔ ادھر یہ کارروائی ہو رہی تھی اُدھر بھان متی اپنے کرتب دکھانے اور رنڈیاں اپنے ناچنے گانے میں مصروف تھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ اپنے اپنے کام میں ایسا جی لگائے ہیں کہ اِدھر دیکھتے بھی نہیں۔ اتنے میں بادشاہ نے زور سے تالی پیٹی۔ قہقہہ لگایا۔ بغلیں بجائیں۔ اور اپنے منظورِ نظر کی برمحل تجویز پر خوب خوشی ظاہر کی۔ اور اُس بیچارے کی یہ حالت ہوگئی کہ مونچھیں کرسی کے ہتوں سے بندھ گئیں اب سر نے جو بے اختیاری اور بدہوشی میں جھونک کھائی تو سینے پر جھک کے رہگیا۔ یہ حالت دیکھ کے بادشاہ نے خاصہ تراش کے کان میں کچھ کہا جسپر وہ اُٹھا اور کمرے کے باہر چلا گیا۔ اُسوقت مجھے یقین ہو گیا کہ اب کوئی نیا ستم اس بڈھے بیچارے پر ہوگا۔ اور ایک معنی خیز نظر سے میں نے اپنے اُن مہربان کیطرف دیکھا جنھوں نے میری تقریب دربار میں کی تھی۔ خاصہ تراش کے بعد اور جتنے لوگ دربار میں تھے اُنہیں سب سے زیادہ انھیں کو بادشاہ کے مزاج میں رسوخ حاصل تھا۔ انھوں نے میری حقارت آمیز اور نفرت انگیز نظر کو دیکھا اور میرا مطلب سمجھ گئے۔ پھر تھوڑی دیر سکوت کر کے اُٹھے اور نہایت آہستگی و سہولت سے بادشاہ سے عرض کرنے لگے۔ "قبلۂ عالم۔ میں حضور کے چچا کو گلو خلاص کیے دیتا ہوں۔ یہ بڑی ہتک ہو رہی ہے۔" اب تو بادشاہ سلامت کا غصہ بانسوں بڑھ گیا۔ چہرہ تمتما اُٹھا۔ پاؤں زمیں پر دے مارے بولے تو یہ بولے "جاؤ کمرے سے نکل جاؤ۔" پھر قسمیں کھانے لگے اور بولے کہ جائیے صاحب یہاں سے چلے جائیے۔ کیا مجھے اپنے گھر میں بھی اختیار نہیں ہے؟ اپنے محل میں بھی؟ جائیے جائیے اور اگر کسی اور صاحب کو میرے اور میرے چچا کے بیچ میں دخل در معقولات کرنیکا شوق ہو تو وہ بھی آپکے ساتھ چلے جائیں۔" یہ سنکے میں بھی اُٹھا۔ سلام کر کے اپنے دوست کے ساتھ ہو لیا اسوقت اسکا تو خیال کرنا بھی محض حماقت تھا کہ زبردستی کیجائے۔ ہم سے جو ممکن تھا یہی تھا کہ اگر ایسی بیدردی کے دیکھنے کی تاب نہ ہو تو وہاں سے اُٹھ آئیں۔ چنانچہ ہم دونوں آدمی ساتھ ہی کمرے کے دروازے

پر پہونچے اور وہاں سے باہر نکل آئے۔ ہمارے بعد جو کچھ وہاں ہوا اُسکو بھی ہمنے دریافت کرلیا یعنے جیسے ہی ہملوگ کمرے سے باہر ہوے ہین کہ خاصہ تراش کچھ آتشبازی لیے ہوے پہونچا اور یہی آتشبازی بیچارے بڈھے کی کرسی کے نیچے چھڑائی گئی جس سے کمبخت کی ٹانگیں بھسم ہو گئیں اور جب بیتاب ہو کے اُسنے کرسی کے ہتوں پر ہاتھ ٹیک کے ٹانگیں اُٹھانا یا اُٹھ کھڑے ہونا چاہا تو اُسکے اوپر کے ہونٹ پر سے بالوں کی دو لٹیں الگ ہو گئین اور اُنھیں کے ساتھ تھوڑا حصہ گوشت کا بھی اتو خون خاصی طرح دہل دہل بہنے لگا اور سارا نشہ کافور ہو گیا۔ طرہ یہ کہ اب جو بیچارا اپنی جان بچا کے اور یہ عذر معذرت کرکے وہاں سے چلا کہ ناک سے خون جاری ہو کیونکر بیٹھے تو اُسنے پہلے بادشاہ سلامت کا شکریہ بابت دعوت و مدارات کے ادا کیا اور پھر اسبات پر تاسف ظاہر کیا کہ زخم کی وجہ سے زیادہ حاضر حضور نہیں رہسکتا۔ بیشک وہ جانتا تھا کہ اُسکے ساتھ نہایت وحشیانہ و ظالمانہ مدارات کی گئی ہو لیکن اُسمیں مصاحب بننے کا مادہ موجود تھا اس لیے اُسنے حرف شکوہ لب پر آنے نہ دیا نہ اپنی ناراضگی و نفرت کو کسی طرح ظاہر ہونے دیا معاذ اللہ کیا "زبردست مارے اور رونے نہ دے" کا مضمون ہو۔ ستم تو یہ ہوا کہ اُس کے ان تکالیف اور عذر خواہی پر بادشاہ سلامت خوب جی کھول کے اور قہقہے مار کے ہنسے۔ البتہ اُنکے یورپین ہمنشیں بالکل ساکت رہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ خاصہ تراش کے سوا اور کسی نے ہنسی میں اُنکا ساتھ ہی نہیں دیا۔ اور خاصہ تراش پر بھی اپنی چھیڑ چھاڑ کے آخری نتیجے پر تشویش و تردد کے آثار نظر آتے تھے۔ کہتے ہیں کہ پھر اُس رات کو شاہی میز پر اور زیادہ چہل مذاق نہوا۔ اور بادشاہ سلامت سویرے ہی اُٹھ کھڑے ہوے۔

اب میرا اور میرے دوست کا حال سُنیئے۔ ہملوگ جو وہاں سے چلے تو سیدھے کانسٹنشیا (جنرل مارٹین صاحب کے مکان) پہونچے۔ کیونکہ اب یہ عمارت لکھنؤ میں ایک مشرقی سرائے کے طور پر ہو گئی ہو جسمیں یورپین مسافر اور سیاح آ کے ٹھہرتے ہیں۔ اُنکو کرایہ مکان دینا نہیں پڑتا۔ لیکن نہ خدمتگار خدمت کرنے کو ملتے ہیں نہ کھانا پینا مہیا ملتا ہو۔ ہملوگ وہاں اِس غرض سے گئے تھے کہ کچھ کمرے خالی کرالیں کیونکہ ہملوگ شاہی مکانات میں رہتے تھے اور ہمیں یہی خیال تھا کہ عنقریب حکم شاہی صادر ہوگا کہ "وہ مکان خالی کیجیے اور نوکری سے اپنے کو موقوف کیجیے"۔ لیکن ایسا کوئی حکم آیا ہی نہیں۔

بادشاہ کے ہاتھوں آئے دن جو ذلت و خواری لوگوں کی ہوا کرتی تھی آخر کار رنگ لائی اور

نتیجہ یہ ہوا کہ اُنکے تمام اہل خاندان اُنکے ساتھ سخت کینہ و عداوت رکھنے لگے۔ اب اُنکے ماموں اور چچا اور اُنکی اولاد اور اہالی موالی کا ایک گروہ تھا کہ جو بادشاہی اہلکاروں پر تیوریاں چڑھائے اور ہر وقت اُنکے ستانے پر آمادہ رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچگئی کہ لکھنو میں برہمی اور شورش پھیل گئی۔ ہر طرف سرہنگی اور شورہ پشتی شروع ہوگئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی فوج کے لوگوں تک پر بدمعاشوں نے اندھیرے اُجالے ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ آخر۔ تنگ ہو کے بادشاہ کو صاحب رزیڈنٹ کی پناہ ڈھونڈھنا پڑی۔ کیونکہ اگر کمپنی کی فوج چھاؤنی سے آجاتی تو یقیناً شورش فرو ہوجاتی۔ مگر صاحب رزیڈنٹ نے اپنی فوج کے ذمے اس خدمت کے ڈالنے سے انکار کر دیا بلکہ بادشاہ کو افہام تفہیم کی اور ہر طرح نشیب و فراز سے آگاہ کر کے یہ راے دی کہ اپنے اعزا اقربا سے ربط ضبط پیدا کریں اور جو کچھ شکر رنجیاں ہیں اُنکے رفع دفع کرنے کے واسطے خود بیچ میں پڑنے کو بھی اقرار کیا۔ چنانچہ ایک ہفتے کی تشویش اور سخت پریشانی کے بعد سب معاملات سلجھ گئے اور اطمینان ہوگیا۔ اب دربار بھی حسب معمول ہونے لگے۔ ہم لوگ بھی اپنے معینہ خدمات و مناصب پر سرفراز ہونے لگے۔ اور ہماری اتنے دنوں کی غیر حاضری بالکل نظر انداز کر دی گئی۔

انھیں واقعات کے بعد شاید پندرہ دن بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ بادشاہ نے کسی ضرورت خاص سے خاصہ تراش کو کلکتہ بھیجا۔ مجکو اب یاد نہیں رہا ہے کہ وہ ضرورت کیا تھی شاید نئے شیشہ آلات۔ جھاڑ فانوس یا شراب کی خریداری کے واسطے بھیجا تھا۔ اُسکی جگہ پر اُسکا بھائی کہ جو ابھی حال ہی میں وارد ہوا تھا لکھنؤ میں رہگیا۔ لیکن اُسکو مطلق رسوخ اور اقتدار حاصل نہوا۔ خاصہ تراش کے چلے جانے کے بعد ہم لوگوں نے آپس میں یہ صلاح کی کہ بس اب موقع ہے کہ اُسکے واسطے کوئی جوڑ مارا جائے اگر اب چلگیا تو چلگیا نہیں تو پھر کبھی نہ چلے گا۔ جن صاحب نے دربار میں میری تقریب کی تھی وہ بھی بڑے مقرب بارگاہ تھے اور بادشاہ اُنکو اپنا نہایت معزز اور مخلص دوست سمجھتے تھے اور یہی صاحب زیادہ تر درپے تھے کہ خاصہ تراش کی غیر موجودگی میں اُسکے خلاف پوری کوشش کر کے اُسے بالکل نظرِ دلسے گرا دینا چاہیے اور ایسا کچھ کرنا چاہیے کہ اُس کی واپسی پر بادشاہ اپنے عادات سابقہ کیطرف عود نہ کرنے پائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے بارہا تخلیہ کی صحبتوں میں بادشاہ کو وہ تمام خرابیاں اور مفسدتیں سمجھائیں۔ سمجھائیں۔ جنسے بادشاہ کی شان بلکہ صحت و عافیت میں بھی سخت خلل پڑ رہا تھا۔ اور اُنکے مرکوز خاطر کر دیا کہ یہ ہر وقت کی مستی اور بیخودی اُنکے واسطے کس درجہ ضرر رساں ہے۔ بادشاہ ہمیشہ ان باتوں کو اسی طرح کان دبا

سنا کرتے تھے جیسے کوئی مدرسے کا لڑکا استاد کی مار کھا کے اُسکی باتین سنا کرتا ہی۔ بلکہ اکثر اوقات وہ خود اپنی حالت پر اسقدر نادم اور متاسف ہوتے تھے کہ آبدیدہ ہو جایا کرتے۔ اور کہنے لگتے تھے کہ "ہان۔ ہان۔ سچ کہتے ہو۔ سچ۔ مین ایک رند خراباتی ہو گیا ہون۔ اور یہ ہر شخص جان گیا ہی لیکن یہ سب شان کی بدولت ہوا ہی۔ واللہ۔ باللہ۔ وہ جو چاہتا ہی مجھسے کرا لیتا ہی۔"

اسی قسم کی گفتگوئین بارہا ہوئین۔ اور آخر بادشاہ نے یہ ٹھان لی کہ جب خاصہ تراش لوٹ کے آئے تو اپنے حد سے نہ بڑھنے پائے۔ نہ خاصہ کے وقت شریک کیا جائے۔ نہ اب وہ منظور نظر بنکے سامنے آئے۔ یہ منصوبہ خود بادشاہ ہی نے ہملوگون سے بیان کیا۔ اور ہملوگون نے اُنکو اسپر مبارک سلامت کی صدائین سنائین۔ اور اُنکو یہ یقین دلایا کہ نہ صرف اُنکی اپنی شان بلکہ سلطنت کی شان بلکہ وہ چیز جسے وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے یعنے اُنکی صحت و تندرستی کا بھی یہی تقاضا تھا کہ ایسا انقلاب جلد کیا جائے۔ جسپر اُنھون نے بہت سمجھ بوجھ کے کہا کہ "صاحبو! تمکو معلوم نہین ہی کہ جب مین دل مین ٹھان لیتا ہون تو کیسا بات کا دھنی اور ارادے کا پکا ہوتا ہون۔ مین اُس موٹے سور یعنے خان کو دکھلا دونگا کہ دیکھ اب مین تیرے اشارون پر نہین چلونگا۔ آپ خود اسے دیکھ لیجئے گا۔ اپنی آنکھون سے دیکھ لیجئے گا۔ اچھا ذرا کلارٹ کا ایک جام تو پلائیے۔"

اس منصوبے کے ٹھان لینے کے بعد ایک ہفتے تک ہملوگ سلسلے کے ساتھ شاہی میز پر شریک ہوتے رہے اور کسی روز ایسا اتفاق نہین ہوا کہ کوئی شخص میز پر سے بدمست ہو کے اُٹھا ہو۔ اب دربار کے قرینے درست ہونے لگے اور بداخلاقی اور بیغیرتی کی باتین اُٹھنے لگین۔

آخرکار ایک دن صبح صبح ہمکو یہ خبر ملی کہ رات کو خاصہ تراش صاحب داخل لکھنؤ ہو گئے ہین اب ہمکو اشتیاق پیدا ہو گیا کہ دیکھین کیا انجام ہوتا ہی۔ ادھر اُدھر پوچھ گچھ کرنے سے معلوم ہوا کہ اُسکا آنا صحیح ہی اور یہ کہ صبح گجردم وہ حضوری مین باریاب بھی ہوا۔ ہملوگ بھی بج کے دربار مین حاضر ہوے جا کے دیکھتے کیا ہین کہ بادشاہ کا سر اپنے منظور نظر کے ہاتھون مین ہی۔ مجھکو اچھی طرح خیال ہی کہ جب ہملوگ رہنے پہونچے تو اُسکے چہرے پر فتحمندی کی بشاشت ظاہر ہو رہی تھی گویا زبان حال سے وہ کہہ رہا تھا کہ "دیکھو۔ پالا ہمنے مارا!" بہرحال بظاہر اُسنے گرمجوشی کے ساتھ ہم سے علیک سلیک کی اور ہم نے بھی بخندہ پیشانی اُسکا جواب دیا۔ بادشاہ سلامت اُس سے کلکتے کے حالات پوچھنے لگے۔ پھر اسکی خرید و فروخت۔ گورنر جنرل۔ جہازون کی روانگی وغیرہ سے متعلق سوالات کرتے رہے اور خاصہ تراش اپنے معمولی لب و لہجہ مین جواب دیتا رہا۔

جب ہملوگ وہان سے اُٹھے اور اپنے ہاتھیون کے قریب پہونچے تو میرے دوست مجھسے کہنے لگے کہ "مجھے ڈر ہے کہ بادشاہ مطلق اپنے وعدونکا خیال نہ رکھینگے" اسپر میں نے کہا کہ "اگر وہ اپنی بات کا پاس نکرینگے تو سمجھ لیجیے کہ ہم بھی لکھنؤ مین زیادہ قیام نہیں کرسکتے" اُنھون نے کہا کہ "ہان سچ کہتے ہو۔ اگر معاملات کی یہی صورت رہی تو ہمارا یہان ٹھہرنا ناممکن ہوگا۔ کیونکہ کوئی ایماندار آدمی اسکا تحمل نہیں کرسکتا" اب ہم لوگوں نے بجاے خود طے کرلیا کہ اگر رات کو خاصہ کی میز پر خاصہ تراش اپنے معمولی جگہ پر بیٹھا تو میں تو اپنی معمولی جگہ پر بیٹھ جاؤنگا تاکہ دیکھوں انجام کار کیا ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن میرے دوست صاحب جماعت میں شریک ہونے سے انکار کردینگے۔ جب شام ہوئی تو ہمکو اسمیں ذرا بھی شک نہ رہا کہ آتے ہی آتے خاصہ تراش کا رسوخ اور اقتدار بالکل مثل سابق قایم ہوگیا ہے۔ کوئی فرق نہیں ہوا۔ کیونکہ ہمنے دیکھا کہ بادشاہ جب پہلو والے کمرے کے قریب پہونچے تو حسب دستور اپنے منظور نظر کے شانہ پر سر نہوڑاے ہوے تھے یہ دیکھکے ہمارے دوست تو فورًا چلتے پھرتے نظر آئے اور لب دریا جس مکان میں رہتے تھے وہیں پہونچ گئے۔ اب ہملوگ کھانیکے کمرے میں پہونچ گئے۔ آگے آگے بادشاہ اور پیچھے ہم سب۔ پہلے تو بادشاہ نے ہمارے دوست کی غیر موجودگی کو اپنے اوپر لیا ہی نہیں۔ لیکن۔ جب سب لوگ میز پر بیٹھ لیے تو انھوں نے کہا کہ "ایں ہمارے مہربان کہاں ہیں؟"

میں نے جواب دیا کہ "قبلۂ عالم۔ وہ تو گھر چلے گئے"

اسپر وہ ہنسے اور بولے "ایں چلے گئے۔ واللہ یہ تو کچھ اچھا نہ کیا۔ اچھا انھیں بلواؤ" چنانچہ ایک چوبدار سے کہا گیا کہ دریا پار اُترکے باغ جائے اور انکو بلا لائے۔ اب کھانا شروع ہوگیا خاصہ تراش اپنی معمولی جگہ پر بیٹھا اور حسب دستور سابق اپنے خدمات بجا لا رہا تھا۔ اتنے میں چوبدار واپس آیا۔ اُسے دیکھتے ہی بادشاہ نے پوچھا کہ "وہ کہاں ہے" ہرکارے نے عرض کیا کہ "قبلۂ عالم صاحب نے بہت بہت آداب و تسلیم عرض کیا ہے اور یہ گزارش کی ہے کہ حضور غیر حاضری معاف فرمائیں" بادشاہ کہنے لگے کہ "اباجان کے سر کی قسم وہ کبھی معاف نہیں کیے جائینگے۔ جاکتے۔ اور انسے کہہ اُنکو ضرور حاضر ہونا چاہیے" ہرکارے نے جھک کے تسلیمیں کین اور آہستگی کے ساتھ پلٹ گیا۔ اب خشکہ اور سالن کے عوض ثقیل کھانے آنے لگے نفیس نفیس کھانوں کی بوباس سے کمرا مہک رہا تھا کہ پھر ہرکارا داخل ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی بادشاہ ذرا تیز ہوکے پکار اُٹھے "کیون۔ کیا ہے" یہ اسوجہ سے کہ بجاے کچھ زبان سے کہنے کے ہرکارا صرف سلام کرتا رہا تھا۔ آخر اُسنے بیان کیا کہ "صاحب کہتے ہیں کہ مجھے

قبلۂ عالم سے یہی امید ہے کہ وہ میری حاضری پر زیادہ اصرار نہ فرمائینگے۔ کیونکہ جہاں پناہ بخوبی جانتے ہیں کہ میں کس وجہ سے حاضر نہیں ہوتا۔" بادشاہ نے جھنجلا کے کانٹا میز پر پٹک دیا۔ یہ اُن کی معمولی عادت اظہار غضب کی تھی اور بولے کہ "جا۔ پھر جا۔ اور صاحب سے کہہ کہ اگر وہ یوں نہ آئینگے تو میں خود اُنکو لینے آؤنگا۔ آج اگر اُنکا اپنا بادشاہ ہوتا تو کبھی وہ ایسا برتاؤ اُس سے نہ کرتے۔ پھر بھلا مجھسے ایسا برتاؤ کیوں کرتے ہیں۔ جلد جا۔" تیسری بار بھی ہرکارا روانہ ہوا اب میوہ جات میز پر آئے۔ اور بادشاہ کے جی بہلانے کے واسطے کٹھ پتلی کا "تماشہ ہو رہا تھا کہ پھر ہرکارا واپس آیا۔ لیکن۔ ابکی بار وہ اس شان سے آیا کہ گویا یہ کہہ رہا ہے کہ "دیکھئے۔ میں صاحب کو لے ہی آیا وہ دیکھئے وہ آرہے ہیں۔" بادشاہ نے جب اُن کو دیکھا تو بولے کہ "آؤ۔ مہربان آؤ۔ ذرا میرے ساتھ ایک جام تو پیو۔ یا حیدر۔ تمھارے یہاں آنے میں تو جیسے برسوں لگ گئے۔" یہ کہکے بادشاہ نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اُنھوں نے عرض کیا کہ "حضور مجھے معاف ہی رکھیں۔ میں جہاں پناہ کے گوش گزار کر چکا ہوں کہ میں اب میز پر اس شخص کے ساتھ کبھی نہ بیٹھونگا۔" یہ کہتے وقت اُنھوں نے خاصہ تراش کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر کہا "اور اب میں ہرگز نہ بیٹھونگا۔" لیکن بادشاہ کہنے لگے کہ "اوہ جی۔ یہ کیا واہیات ہے۔ بیٹھو۔ بیٹھو۔ اجی شامپین کی ایک بوتل ہمارے واسطے لاؤ۔" لیکن بادشاہ کی اس بات کا ذرا اثر نہ ہوا۔ اُنکا جی پھرا ہوا تھا۔ بھلا ایسی باتوں میں کب آسکتا تھا۔ اُسنے نہایت استقلال سے اِسکا جواب دیا۔ اور بادشاہ کو اُنکے مواعید یاد دلائے۔ آخر بادشاہ نے تنگ ہو کے کہا کہ "معاذ اللہ معاذ اللہ تم کسقدر ستارہے ہو۔" یہ کہکے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوے اور خاصہ تراش اور کپتان باڈی گارڈ کو اپنے ساتھ آنے کا حکم دیکر بگڑے دل رفیق کو ساتھ لیا اور ایک پہلو کے کمرے میں چلے گئے۔

یہاں پہونچکے بہت کچھ قیل وقال ہوئی۔ دونوں طرف سے شکوہ شکایت کے دفتر کھلے خوب جواب سوال ہوے۔ اسمیں خاصہ تراش نے تو بالکل اپنے کو جہاں پناہ کی مرضی پہ چھوڑ دیا بگڑے دل رفیق نے بار بار بادشاہ کو اُنکا عہد وپیمان یاد دلایا۔ اور کپتان صاحب نے صلح کن طریقہ اختیار کرکے دونوں کو دھیما کرنیکی کوشش کی خود بادشاہ سلامت بہت ہی دست بپاچے تھے یا تو بولے ہی نہیں یا بولے تو بہت کم۔ آخرکار بادشاہ نے یہ راہ نکالی کہ سب کھانیکے کمرے میں چلیں اور وہیں بیٹھکے شامپین کی بوتل پر معاملہ اُٹھا رکھیں۔ شیشہ و ساغر سے سب قضایا فیصل ہو جائینگے لیکن اسکو میرے دوست نے کسی طرح نہ مانا اور جب بادشاہ نے دیکھا کہ منانے کی جتنی تدبیریں تھیں

سب کر تھکے اور کچھ نتیجہ نہ نکلا تو اُنھوں نے پہلے ٹھنڈی سانس لی۔ پھر قسمیں کھائیں۔ دھمکی دی اور خاصہ تراش کی بغل میں ہاتھ دیکے کھانے کے کمرے میں چلے آئے۔ اُنکے پیچھے پیچھے کپتان صاحب بھی آگئے لیکن بگڑے دل رفیق صاحب اپنے گھر پلٹ گئے۔

جب بادشاہ نے مڑکے کمرے میں دیکھا اور اُنکو نہ پایا تو بولے کہ "وہ چلے گئے!" جسپر اُنکے ناظر نے جواب دیا کہ "خیر۔ کیا مضائقہ ہے۔ انکی جگہ آسانی سے بھر سکتی ہے۔" بادشاہ سلامت یہ سنکے کہنے لگے کہ "اُف۔ جانے بھی دو۔ مردود کو۔ اُسکی جگہ کا بھرنا بھی کوئی بڑی بات ہے۔" اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ بات رفع دفع ہو گئی۔ لیکن ہنوز یہ معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اب میری باری تھی۔

جب بادشاہ نے نظر اُٹھا کے ایکبار اپنے سب مہمانوں کو دیکھا تو اُن کی نگاہ مجھپر دیر تک کے جم گئی چونکہ اُسوقت میں بھی اُنھیں کی طرف دیکھ رہا تھا لہذا ہم دونوں کی نگاہیں لڑ گئیں۔ لیکن اُنھوں نے فوراً اپنی آنکھ پھیر لی اور بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا کے دبی زبان میں شراب کی بابت کچھ کہا۔ جسپر میں نے اپنا گلاس بھرا اور بادشاہ نے اپنا۔ ابھی اُنکا ہاتھ بوتل پر تھا اور نگاہ مجھپر لگی ہوئی تھی۔ لیکن اب اُنکے چہرے پر بشاشت نہ تھی بلکہ آنکھیں خونفشاں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں میں نے اپنا گلاس اُٹھایا اور دربار کی معمولی دعا و دستور کے بموجب یہ کہنے کو تھا کہ "خدا بادشاہ پہ اپنی برکت نازل کرے" کہ بادشاہ نے اپنا گلاس پٹک دیا۔ شراب لنڈھک گئی اور بہت زور سے غضبناک ہو کے فرمایا "نہیں۔ صاحب میں آپکے ساتھ شراب نہ پیونگا۔ تم بھی اُسی کے دوست ہو!" میں نے عرض کیا کہ "ابھی کل کی بات ہے کہ حضور بھی اُسی کے دوست تھے اور اُس سے ارشاد فرماتے تھے کہ کیسی کچھ قدر اُسکی حضور کے دل میں ہے۔" اب تو بادشاہ بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے "سنتے ہو آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایں ذرا سننا تو آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا انکو کیسے اس لب ولہجہ میں مجھسے بات کرنے کی جرات ہوئی۔" میں نے عرض کیا کہ "حضور جہانپناہ تو انگریزوں کے قدرداں ہیں۔ اور حضور کی سرفرازی و قدردانی نے انکو جری کردیا ہے۔ کہ بعض اوقات وہ اپنا دل کھول کے حضور کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ شاید حضور کو میری موجودگی ناگوار ہو۔ ہاں واقعی میں نے خود بہت تاخیر کی۔" یہ کہتے ہی کہتے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف چلا۔ جب تک میں دروازے تک پہونچا سنتا رہا کہ پہلے تو بادشاہ نے کچھ قسمیں کھائیں پھر میز پر زور سے کانٹا دے مارا۔

اسی شب کو میرے دوست کو شاہی حکم پہونچا کہ جس مکان میں وہ مقیم ہیں اُسے خالی کردیں

جو ہرکارے یہ سم لائے تھے اُنکو یہ بھی حکم ملا تھا کہ مکان کا اسباب نکال کے باہر پھینک دینگے لیکن نواب کا دل نہیں چاہتا تھا کہ ایسے حکم کی تعمیل مین کچھ سختی کریں۔ کیونکہ اُنکو یورپین لوگوں سے عجب طرحکا ڈر سمایا ہوا تھا۔ چنانچہ اُن کے آدمیون نے مختلف اشیاء کی کانسٹنشیا تک پہونچا دینے میں بڑی اعانت کی۔ یہی مقام تھا جہان معتوب رفیق اور اُسکے اہل خاندان کیواسطے کمرے رکھے گئے تھے۔

میری یہ حالت ہوئی کہ میری علیحدگی بہت جلد سرانجام پاگئی۔ میرے ساتھ نہ جورو جنجال تھی نہ لڑکے بھونچال لہذا میرے پاس اسقدر سازوسامان ہی نہ تھا جسکے اُٹھانے بٹھانے میں کچھ بہت زحمت ہوتی۔ خیر صبح ہونے سے پہلے ہی پہلے ہملوگ کانسٹنشیا میں مزے سے آرام کرنے لگے۔ کیونکہ یہاں پہونچکے ہملوگوں نے صاحب رزیڈنٹ کی حفاظت و سرپرستی حاصل کر لی تھی اور اُنھوں نے اس باب مین نواب سے کچھ خط وکتابت بھی کی تھی جسمیں اُنکو آگاہ کر دیا تھا کہ اگر ہمارا ذرا بھی بال بیکا ہوگا تو اُسکے جوابدہ وہی ہوں گے۔

ہملوگ چند روز تک کانسٹنشیا میں نہایت اطمینان سے رہے۔ اور جب سب انتظامات درست ہو گئے تو ہملوگ گومتی کے ذریعے گنگا پہونچے۔ اور فوراً کلکتہ کے مسافر بن گئے۔ یہ انجام تھا اُس شاہی نظر عنایت کا جو میرے حال پر تھی۔ اب مجھے صرف چند الفاظ اور کہنا ہیں جن میں خاصہ تراش اور جانپاہ دونوں کے سرگزشتین مکمل ہو جائینگی۔

جب خاصہ تراش کلکتہ گیا تھا جسکا حال میں اوپر بیان کر چکا ہون تو اُسکا یہ ارادہ معلوم ہوتا تھا کہ بس ہندوستان سے چلا ہی جائے۔ اُسنے ایک معتد بہ رقم کمپنی کے خزانے میں امانتاً جمع کی۔ کیونکہ اتنا تو آخر وہ خود بھی جانتا بوجھتا تھا کہ اُسکی حیثیت کیا ہے اور کسقدر پائدار اور مستقل ہے۔ اور اسی وجہ سے اُسنے یہ قصد کر لیا تھا کہ بس اب لکھنو کو خیرباد کہنا ہی مناسب ہے۔ ورنہ کہین بادشاہ کی تلون طبع تک نوبت پہونچی تو بہت زبون ہوگا۔ اسمیں کچھ شک نہیں کہ اپنے چلنے کی طیاری کا ایک بندوبست یہ بھی تھا کہ اُسنے انگلستان سے اپنی ایک بھائی کو بلا بھیجا تھا۔ اور اسی بھائی نے اُسے کلکتہ سے واپس آنے پر اُسکو مفصل اطلاع کر دی تھی کہ اُسکی غیبت میں اُسکے واسطے کیا کیا سازشیں کی گئیں تھیں۔ کیونکہ ہملوگوں نے جو اصلاحات تجویز کی تھیں اُنکا دربار اور ریذیڈنسی دونون جگہ بڑا چرچا تھا۔ خاصہ تراش کو یہی امید تھی کہ اُسکی غیرموجودگی مین اُسکا بھائی اُسکی دونوں خدمتون کو سرانجام دے دیگا یعنے بادشاہ کے بال بھی سنوارا کریگا

اور رمنے اور نقش خانے کا بھی انتظام کیا کرے گا۔ لیکن یہ اُسکی غلطی تھی — یا تو اُسنے بادشاہ کی طبیعت کو نہیں پہچانا تھا کہ کتنی مستقل اور وضعدار ہو اور یا اپنے بھائی کی دلشکن اداؤن کا اندازہ غلط کیا تھا۔ خیر۔ ہملوگوں کی علیحدگی کے بعد جب خاصہ تراش پھر اپنی جگہ پر قایم ہو گیا اور بادشاہ کی نظر عنایت پھر حسب دستور اُسپر پڑنے لگی تو اب اُسنے اور بھی زیادہ خود مختاری اور مطلق العنانی دکھلانا شروع کر دی۔ اور دربار مین اب کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اُسے کسی بات مین روک ٹوک سکے حتی کہ اس زمانے میں جیسے واقعات اور معاملات دربار میں پیش آئے اُنپر ہندوستان بھر مین سرگوشیاں ہونے لگیں۔ چنانچہ کلکتہ ریویو نے اس زمانے کا حال لکھا ہی کہ "دربار سے تہذیب و متانت اور ادب آداب سب تشریف لے گئے اور اب بادشاہ کی یہ کیفیت اکثر ہو جاتی ہی کہ کرنل لو صاحب رزیڈنٹ نے اُن سے ملاقات کرنے سے بارہا انکار کر دیا اور اُن کے کمینہ خصایل اور ذلیل مصاحبوں سے معاملات مین بات چیت کرنا تو مطلقاً چھوڑ دیا" لیکن اس تمام ابتری اور شورش کے زمانے مین بھی بادشاہ کو ہم لوگوں کی جدائی کا صدمہ بہت ہوا۔ وہ خود محسوس کرنے لگے کہ خاصہ تراش اُنھیں موم کی ناک بنا رہا ہی اور جو چاہتا ہی اُن سے کرا لیتا ہی۔ یہ حالت اُنکو آخر میں بہت شاق ہو گئی۔ اور ایک بار نہیں بلکہ کئی مرتبہ اُنھوں نے کھلم کھلا اُسکو اس بات پہ بہت باتیں سنائین کہ اُسی کی وجہ سے اُنکے دو ایسے دوست بچھڑ گئے کہ جو ہر وقت نیک صلاح دیتے رہتے تھے۔ خاصہ تراش کو قہر سلطانی کے آثار نظر آنے لگے تو اُسنے بھی اپنا بوریا بدھنا سنبھالا اُسکے بھائی پر بادشاہ کا دل کبھی نہ آیا۔ بادشاہ کچھ کھٹک گئے تھے۔ اور سمجھنے لگے تھے کہ خاصہ تراش کا منشا یہ ہے کہ "اُنہی ہی ایسی بڑے لوگوں کی صحبت مین مجھے دن رات رکھے۔ اور ہر طرف سے ایسے ہی آدمی میرے ارد گرد رہیں" خاصہ تراش نے دربار میں ایک یوروپین جیف ٹلرد جسکا خطاب داروغہ باورچیخانہ تھا) اور سر چڑھا دیا تھا۔ اور یہ شخص خود اسکا مُنہ دست پرور تھا۔ یوروپین ملازمان خانگی میں پہلے کے دو آدمی جو باقی رہ گئے تھے وہ بالکل برائے نام تھے اب دربار کے مالک یہی تین تھے۔ خاصہ تراش۔ اسکا بھائی۔ اور داروغہ باورچیخانہ۔ اور جو کچھ وقار و اقتدار تھا انھیں کا تھا۔

آخرکار معاملات حد سے گزر گئے اور بگڑنے کی انتہا ہو گئی۔ دربار کی ابتریوں اور بیہودگیوں سے صاحب رزیڈنٹ بھی عاجز آ گئے تھے اور اُنکی ناگواری روز افزون تھی

حتے کہ اب وہ بڑے شد و مد سے اور بہت جلد جلد اصلاح حالت پر توجہ دلانے لگے۔ بادشاہ بھی دق ہو رہے تھے۔ اور تنگ آ گئے تھے۔ کیونکہ دربار میں ایسے ہندوستانیوں کی کمی نہ تھی جو ہر وقت بادشاہ کے کان خاصہ تراش کی برائیوں سے بھرتے رہتے تھے۔ اور مختلف مخفی تدبیروں اور ترکیبوں سے اُنکو دکھاتے سمجھاتے رہتے تھے کہ سارا فساد اس کمبخت کی ذات کا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کو یہ جرأت تو تھی نہیں کہ علانیہ اور علی الرغم اُسکے خلاف کوئی کارروائی کرتے۔ آخرکار ایک روز بادشاہ نے بگڑ کے اُس سے کہا کہ "سنو جی تمھیں نے میرے دو مشیروں کو مجھسے جدا کر دیا۔ اور اب تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اور تمھارا بھائی جو چاہیں گے مجھسے کرا لیں گے۔ لیکن تمکو بہت جلد معلوم ہو جاویگا کہ یہ سودائے خام تمنے پکایا ہے رزیڈنٹ صاحب کا یہ کہنا سچ ہے کہ تمھیں بس کی گانٹھ اور فساد کی جڑ ہو اور تمھاری ہی ذات سے دربار کا رنگ بگڑا ہے۔" یہ سن کے خاصہ تراش کے دل میں ہول سما گئی۔ پھر اسی کے ساتھ ہی اُسنے دیکھا کہ اُسکے ایک یار مددگار کے اخراج کے واسطے بھی کچھ سامان ہو رہے ہیں تو اور بھی سہم گیا۔ حتی کہ اسی وحشت اور اضطراب میں ایک[1] روز شبا شب وہ کانپور ہو رہا یہاں پہونچ کے وہ کمپنی کی عملداری میں داخل اور بادشاہ کے دسترس سے باہر ہو گیا۔

جب نصیر الدین حیدر نے اُس کی مفروری کا حال سنا تو کچھ عہدہ دار سرکاری اُسکے مکان پر بھیجے جنھوں نے اُسکے بھائی اور بیٹے کو گرفتار اور مالی اسباب کو ضبط کر لیا۔ اگر صاحب رزیڈنٹ صاحب کا قدم درمیان میں نہ ہو جاتا تو یقیناً ان دونوں کی گردنیں ماری جاتیں۔ لیکن رزیڈنٹ صاحب سینہ سپر ہو گئے اور ان کی وجہ سے یہ دونوں صرف دس دن تک مقید رہے پھر چھوڑ دیے گئے۔ دس دن تک اسوجہ سے کہ اتنی مدت میں بادشاہ اور اُنکے وزیر نے اسباب کی ضبطی قرقی کی کارروائی باطمینان کر لی۔ کہتے ہیں کہ جو جائداد ضبطی میں ملی اُسکی قیمت تخمیناً ایک لاکھ روپیہ (یعنے دس ہزار پاونڈ) تھی۔

---

[1] یہ واقعہ مفروری میں نے ایک ایسے شخص کی زبانی سنا ہے جو اُس زمانہ میں لکھنؤ میں موجود تھا اور مجھے اسکی صحت میں کچھ شبہ نہیں ہے۔ اگرچہ لٹریری گزٹ مطبوعہ ۲۹ ستمبر سنہ ۱۸۳۵ء میں اس کی بابت ایک اور واقعہ لکھا ہے (مصنف)

اب خاصہ تراش کا حال سنیے کہ کانپور پہونچکے اُسنے فوراً کلکتہ کی راہ لی — اور جب اُسکے عزیز و اقارب کلکتہ مین اُس سے مل گئے تو اُسنے وہان سے انگلستان کا کوچ بول دیا۔

خاصہ تراش نے جسقدر دولت پیدا کی اور جو وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ اُسکا بالکل ٹھیک اندازہ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن میں نے یہ سنا ہے کہ لوگونکا تخمینہ یہ تھا کہ اُسنے چوبیس لاکھ روپیہ (یعنے دو لاکھ چالیس ہزار پاونڈ) سے کسیطرح کم جمع نہیں کیا۔ جب وہ انگلستان میں پہونچا تو اُسنے اس روپیہ کو کاروبار میں لگایا اور ایک مدت تک اُسکا کام خوب چلتا رہا وہ سوداگر بھی۔ ایک شراب کے کارخانے کا شریک بھی تھا اور تھوک فروشی کا بھی کام کرتا تھا۔ پھر اُسنے ریلوں میں حصہ لیا۔ مگر اس میں اُسکو سب سے پہلے خسارہ ہوا۔ کیونکہ بہت بڑا حصہ اُسکی دولت کا اسی ذریعے سے ٹوٹے میں پڑ گیا۔ پھر شراب کے کارخانے میں بھی بڑا گھاٹا ہوا۔ اور آخرکار انجام یہ ہوا کہ ۱۸۵۶ء میں اُسے دیوالیہ عدالت میں جانا پڑا۔ تاہم اُسکا نام لندن ڈائرکٹری میں اب بھی "…… صاحب سوداگر" کرکے لکھا ہے اور وہ حوالی شہر کے ایک نہایت صاف ستھری اور فیشن ایبل عمارت میں رہتا ہے۔

نصیر الدین حیدر جہاںپناہ و قبلۂ عالم کا یہ حال ہوا کہ خاصہ تراش کا چلا جانا اُن کے واسطے پیغام اجل آنا ہو گیا۔ اُسکے جاتے ہی اُنکے اہل خاندان کو موقع ملگیا اور اُنھوں نے اپنے آدمی دربار میں بھرتی کرنا شروع کر دیے۔ اور ابھی خاصہ تراش کو لکھنؤ سے گئے صرف چار مہینے ہوے تھے کہ ۱۸۳۷ء میں بادشاہ سلامت کو زہر دیا گیا۔ اُنکے بعد اُنکے ایک چچا جنسے وہ ہمیشہ نہایت بری طرح پیش آتے رہے تھے مسند نشین ہو گئے اور اُنھیں چچا کا بیٹا فی الحال بادشاہت کر رہا ہے

تمت

خاتمۃ الکتاب

معزز ناظرین۔ اودھ کے فرمانرواؤں کے مجمل اور نصیر الدین حیدر کے مفصل حالات اور بادشاہی کی کیفیت آپ سن چکے اور اچھی بُری رائے بھی قائم کر چکے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا کہ یورپین مورخ اور سیاح اودھ کے بارے میں کیا خیالات ظاہر کر چکے ہیں۔ اب ذرا تصویر کا ایک اور رُخ ملاحظہ کیجیے۔ دیکھیے ایک محب وطن کس حسرت اشتیاق اور جوش سے اپنے بادشاہ کی تصویر الفاظ میں کھینچتا ہے۔ اسکے جذبات حب الوطنی آنکھوں کو نہ دوسری طرف متوجہ ہونے نہ دل میں نکتہ چینی کی ہوا لگنے دیتے ہیں اُسے سب بھلا معلوم ہوتا ہے۔

ستائیسویں ربیع الاول یوم شنبہ سنہ ۱۲۴۳ھ اور بیسویں ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ء تھے کہ زیب دہ اورنگ شاہی ہوا اور بعد پدر مرزا غازی الدین حیدر جلوس میمنت مانوس سریر سلطنت پر کیا اس سن و سال میں بادشاہی ہاتھ آئی۔ فرمانروائی فرمائی کہ شاہان گذشتہ کو جسکی تمنا رہی میسر نہ آئی۔ جواں بخت و جواں دولت جواں سال پچیس ۲۵ برس کا سن عین شباب۔ جوانی کی آب و تاب۔ مزے کے دن تھے کہ تخت و تاج ہاتھ آیا۔ زیست کی کیفیت۔ حکومت کا لطف خوب اُٹھایا۔ جلسہ وہ موجود رہا جو محمد شاہ کو نصیب نہوا۔ ہزارہا پری پیکر۔ حور وش۔ سیمتن گلبدن نازک اندام با لباس پر تکلف و زر بزمرۂ خدام دست بستہ حاضر رہیں۔ گلاب و کیوڑہ تو کیا عطر کی نہریں بہیں۔ مکان و باغ ہر اک بہشت کا نمونہ۔ گلشن شداد سے طیاری میں دونا۔ روپیہ اشرفی کے گنج خالی کر دیے۔

ناقہ کشوں اور محتاجوں کے گھر بھر دیے۔ گلشن شباب لہلہا رہا تھا۔ پھولوں کا یہ صرف رہا کہ ہزاروں باغ سرکاری عجیب روش و غریب طیاری کے تھے اسپر کئی سو روپیہ روز کے بازار سے آتے صبحکو فراشینوں کے ہاتھ چاندی کے ڈھیر لگجاتے تھے۔ جلسے والیاں نادر زمانہ شہرہ آفاق۔ گائنیں پری پیکر موسیقی میں یکتا۔ دلبری میں طاق۔ انکے علاوہ ہزاروں مہ سیما۔ رشک مہر کمسن۔ انکی لاابالیاں اُمنگ کے دن۔ کہاریاں پریوں کی صورت۔ ہمیشہ ہوادار مثل سلیمان علیہ السلام ہوا پر رہا۔ ناز و انداز نے بر سر زمیں پاؤں نہ لگنے دیا۔ اکثر سہ پہر کو چمن بندی معشوقان طنّاز و گلعذار سے ناظرین کا دل باغ باغ ہوجاتا مدام اُس تختہ گلفام پر لالہ داغ کھاتا سنبل اُنکی زلف مسلسل دیکھکے پریشان

مسی کی دھڑی کی دید میں روے سوسن کبود تھا۔ ملح کو سو زبان سے موجود تھا۔ نرگس کی اُن آنکھوں پر ٹکٹکی رہتی تھی۔ دیدۂ آہوے ختن سے خون کی ندی بہتی تھی۔ زنخداں دیکھکے سبب کا دل ڈوب جاتا منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ بہی کا ضرر ہوتا۔ دھبا لگ جاتا تھا۔ سو طائفہ دیہاتی اور سو شہر کا چیدہ نوکر تھا تین پہر بجے یہ سب موجود ہوئے پچیس پچیس طائفوں نے ایک رنگ کے جوڑے عنایت سرکار باغ و بہار پہنے۔ اور زیور بھی مناسب میل کا۔ معلوم ہوا کہ چمن روانی ہے۔ بلکہ پھولوں میں یہ نزاکت و لطافت۔ روش رفتار۔ تکلف گفتار۔ طرز و انداز۔ غمزہ و ناز کہاں ہے۔ اور بھانمتی۔ چونے والیاں۔ نٹنیاں وضع کی نرالیاں۔ قوال بین کار۔ ربابیے۔ سرودیے۔ یہاں تک کہ ریچھ والے قلندر اور بکرا بند بھی موجود رہتے۔ کمرے میں سامان عیش تیار۔ انگریزی میز ایک سے ایک تحفہ پر نقش و نگار جہاں تک پیک نگاہ جانے گلدستہ بندی پائے۔ گرد کنٹر بادہ ارغوانی گلنار۔ زمرد فام چُنے۔ قریب گزک کو فواکہ۔ ہر قسم کے کباب۔ تشتریوں میں بادام پستے بھنے۔ متصل اوسکے نعمت غیر مترقب طرح طرح کے پلاؤ۔ دوپیازے۔ متعدد دیگوان۔ بے حساب بورانی۔ بھرتہ۔ چٹنی۔ اچار۔ ہر گلدستے تلے اتنا سامان کہ دوسری طرف۔ ہاتھ بڑھانے کی نوبت نہ آئے جس شے کی خواہش ہو کھائے۔ کمرہ دولھن کی صورت کا سجا۔ جھاڑ۔ کنول۔ فانوس ہوشربا۔ پردوں میں سیروں بنت۔ گوکھرو۔ بادلہ۔ لچکا ٹکا۔ فرش سے تا سقف و جدار آئینہ بندی معقول۔ سکندر اگر دیکھتا حیرت آتی۔ اپنی سلطنت بھول جاتی جدھر نظر اُٹھاؤ ایک کے ہزار پاؤ۔ ادہر خود بدولت رونق افزا ہوئے اُدھر پریوں کا ناچ ہونے لگا۔ کمرے کے باہر انگریزی باجے بجنے لگے۔ قوال بین کار ساز ملا بجنے لگے جو جو اندر باہر حاضر تھا اپنے کام میں مشغول۔ حضور اکل و شرب میں متوجہ ہوئے کسیکی طرف آنکھ نہ اُٹھاتے تھے۔ اُنکے لطف آئینوں میں نظر آتے تھے۔ اب جسکا بخت مددگار اور طالع یار رہا اُسکو قریب بلایا کچھ کھلایا پلایا اور جو اختلاط منظور ہوا تو اُس کا دلدّر دور ہوا ایک دم میں نہال کیا۔ دولت دنیا سے مالا مال کیا۔ ایک دن میں پانسو جوڑی جواہر نگار کڑے کی نرم نازک ہاتھوں میں رنڈیوں کے پڑے۔ نصف شب گذری صحبت موقوف یہ قافلہ روانہ ہوا۔ وہ جلسے والیاں اور محل کی گائنیں پری وش۔ ذی ہوش مرصع پوش تھیں اُنکا آنا ہوا۔ کوئی تلوے سہلانے لگی کوئی پنکھا ہلانے لگی۔ کسی نے کہانی شروع کی۔ کوئی ٹپہ گنگنانے لگی۔ کوئی شعر برجستہ پڑھنے لگی۔ کوئی پاؤں دبانے کے بہانے سے دبے پاؤں بڑھنے لگی۔ اب اسمیں جسکا نصیب جاگا وہ اپنا حصہ لے بھاگا۔ دم سحر جب بیدار ہوے۔ سیر کو سوار ہوے۔ ہر روز نیا مکان تازہ سامان۔ غرضکہ ہر شب شب برات۔ جو دن تھا محرم کے سوا عید تھی ہر دم بھی رخوتکی

دیدنی تھی۔ قابل دید یہ جلسہ تھا۔ خوشا نصیب اُسکے جس کی نظر سے گذرا ہمت کے روبرو حاتم بخیل تھا۔ گو ملک قلیل تھا۔ چشمۂ فیض سدا جاری تھا۔ لینے والا عاری تھا جس جس کی قسمت میں لہنا تھا۔ الماس و زمرد کا گہنا تھا۔ قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی۔ خاک سے پاک کیا۔ دو گھڑی میں آسمان پر بارگاہ پہونچائی۔ جاڑے کی فصل میں لاکھ روپیہ مہینے کی تین رضائیاں بنتی تھیں۔ گرمیوں میں اُنکی ہوا معلوم نہوتی تھی کہ کیا ہوئیں۔ ملکہ زمانیہ اور مخدرہ علیا اور تاج محل ان سب کا خرچ رہا اور تا زیست رہیگا۔ احتیاج قریب نہ آنے کی کئی پشت اُنکی مزے اُڑائے گی ڈلوی اور دھنیا کہاریاں تھیں۔ دس پانچ لاکھ روپیہ اُنکی نگاہ میں نہ سمایا یاروں کو کھلایا۔ مکّا خیاط کی قطع برید دنیا سے نرالی رہی۔ ہر دم عیش و طرب لاابالی رہی۔ کچھ صندوق کترنکے جمع تھے نائب سے زر خطیر اُسکی قیمت لیکے حضرت نے مکا کو عنایت کیے وہ منھ دیکھتے رہے۔ لاکھوں روپے کی عمارت اُسنے اپنی بستی میں بنائی۔ اور بارہ سرا۔ گنج۔ باغ کی طیاری کی جو پوشاک ایک بار زیب جسم کی پھر نہ پہنی دے ڈالی گو لاکھوں کی ہوئی۔ خوش دماغی میں تاناشاہ پر طعنہ زن ہوں تو بجا ہے کہ ممدوح میرا نازک دماغ ایسا ہے۔ ایک دن نخلخہ کی ہانڈی میں تیل پڑ گیا وہ بھی موتیا کے عطر سے کم نہ تھا مگر طبیعت مکدر دماغ پریشان ہوا۔ خوشبوساز طلب ہوئے۔ پوچھا گیا۔ کیا جلتا ہے۔ عرض کی موافق معمول۔ انھوں نے باہم اثبات کیا تو میل نکلا۔ بیلے کا تیل نکلا۔ نخلخہ ساز ابن قوت شامہ صفائی دماغ پر خطا کے مقر ہوئے۔ ترحم یہ تھا کہ قصور معاف ہوئے مورد الطاف ہوئے۔ مغلانیاں ہزار پانسو درماہے کی نوکر۔ گوٹے بیچکے۔ بادلے اور زربفت کی کترن باقی تھیں کہ سونے چاندی کی اینٹیں گڑھواتی تھیں۔ خاصے والیوں نے مشک۔ عنبر۔ زعفران کے گارے سے لونگ الائچی کے خاصے خاصے محل بنائے ڈلیاں چکنی دو رنگی جنیر دل بہلے اُنکے انبار لگائے۔ الائچی وہ کہ چھوٹی بڑی کی تمیز نہ آئے۔ شب کو جیسے ملجائے۔ ہر شے کا صرف بے حساب رہا۔ کارندوں نے جو لکھدیا وہ لیا۔ گلوری گز بھر کی بنتی تھی۔ جہاں سے کاٹ کر کھائیے سب مصالحہ برابر پائیے۔ شہر کے تنبولی سیٹھ ہو گئے۔ صوبے اور رنگھ ہیں پان نذر ہے۔ گلوری جو کھلاتی وہ سرخرو کیا گیا انعام باقی تھی ایک روز پانچ توڑے اشرفی کے اور کئی ہزار کی چادر جو اُسوقت زیب و دوش تھی عنایت کی۔ اُسکی خاطر میں نہ آئی۔ روکھی صورت بنائی۔ گھر لٹنے پر مزے اُڑائے ہوس نکالتی ہے۔ سونا اچھالتی ہے۔ گھوڑے وہ کہ ادہم صبا نے ہمراہی میں ہر بار ٹھوکر کھائی۔ گرد نپائی۔ وہم انسان خیال رفتار میں تنگ۔ گمان تصور میں لنگ۔ رخش رستم شبدیز خسرو بھی گرد تھا۔ ہر ایک سر تا سر

جہان گرد تھا۔ ہاتھی ایسے کہ دکھن کی جان۔ بیل فلک سے زیادہ رفعت و شان سبک رو منجھول ایسے کہ جب چلنے پر آئیں حشرات الارض آزار نہ پائیں ہزار ہا جامہ وار گراں قیمت سہلا جھول اور گردنی کے واسطے قطع ہو گئے کشمیر سرد ہو گئی اور ہودج و زین سونے چاندی کے اتنے بنے کہ زمین سفید اور زرد ہو گئی۔ جسطرف خیال آیا اُسے انتہا سے کمال کو پہونچایا۔ اس عیش پسندی پر عشرہ محرم میں تا اربعین دن رات رونا۔ زمین پر سونا۔ لباس آبی یا سیاہ۔ لب پر نالہ و آہ بھولے سے نہ مسکرانا۔ ہزاروں روپیہ مرثیہ خواں اور سادات محتاج آب و نان کو دینا۔ حسنات لینا۔ دوازدہ امام کی درگاہ۔ صاحب الامر علیہ السلام کا غار بنوایا۔ لاکھوں روپیہ کا اسباب وہاں چڑھایا۔ بیٹھے بیٹھے طبیعت جو لہرائی۔ گنگا سے نہر منگائی۔ چشمۂ فیض جاری ہوا۔ یادگار رہا۔ مزدور غریب نہال کار فرما صاحب مال و منال ہوئے۔ گرمی کی فصل میں گلدستوں کا چمن بنتا تھا۔ پھولوں کا شامیانہ تنا تھا اُسکے تلے مسہری گلہائے خوشبو کی بچھتی تھی۔ گرد چار حوض رکھے جاتے تھے۔ دو مرصع کار دو چینی کے پر نقش و نگار۔ عطر سے لبریز۔ بوئے فتنہ خیز۔ فوارے کی جا درخت بنتے تھے۔ پھول اور کلی سے فوارہ چھٹتا تھا۔ اور چینی کے حوضوں میں درختوں پر جانور تھے۔ اُنکی کریاں سے عطر اُچھلتا تھا ہر شام یہ سامان طیار رہتا اور جس جگہ منظور رہوتا وہ باغ درست ہوتا۔

آخر چرخ ستمگار نے اس صحبت کا رشک کھایا۔ ایسی بہار پر خزاں لایا۔ لکھنؤ تباہ روز روشن سیاہ ہوا۔ صدائے "انا للہ وانا الیہ راجعون" آئی۔ سلطنت خاک میں ملائی۔ طبیعت اس صاحب افسر و تاج کی ناساز ہوئی۔ لاشہ گور و کفن کی محتاج رہی۔ روح اس جان جہاں کی بہشت بریں کو بلند پرواز ہوئی ؎ ۔

سلیماں کشتۂ زہر دغا شد   غروب مہ بہ برج کربلا شد

وہ صدر نشین چار بالش عیش و طرب متوجہ دامن خاک ہوا گریباں صبر چاک ہوا۔ تیسری تاریخ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ اور ساتویں جولائی ۱۸۳۷ء روز جمعہ تھا کہ یہ حادثہ غم انجام ظہور میں آیا۔ سبحان اللہ دس برس سے زیادہ سلطنت کی۔ تمام شب گور میسر نہوئی!

فاعتبروا یا اولی الابصار

تصانیف مولانا نذیر احمد دہلوی

مراة العروس	۴ر
نبات النعش	۴ر
توبۃ النصوح	۴ر
محصنات (فسانہ مبتلا)	۸ر
ایامے	۸ر
رویاے صادقہ	۱۲ر
ابن الوقت	۸ر
مبادی الحکمت	۸ر
چند پند	۴ر

تصانیف خواجہ الطاف حسین حالی

حیات سعدی	عہ ر
یادگار غالب	عمار
مسدس حالی	۴ر
مجموعۂ حالی نظم	۸ر
شکوہ ہند	۰۲ر

متفرقات

مخزن المفردات	عہ ر
بستان المفردات	عہ ۴ر
تذکرہ علما ہند	۱۲ر
تذکرہ علمار حال	۴ر
گلستان سخن (تذکرہ شعرار)	عمار
سراپا سخن	۱۲ر
خزینۃ الامثال	۷ر

تصانیف دینیہ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی

کلید مثنوی معنوی حصہ ۱	عہ ر
ایضاً حصہ ۲	عہ ر
تعلیم الدین	۶ر
فروع الایمان	۲ر
جزار الاعمال	۱ر
اصلاح الرسوم	۴ر
بہشتی زیور آٹھ حصہ فی حصہ	۳ر
نیک بیویان	۴ر
اعمال قرآنی ہرسہ حصہ	۴ر
فتاواے اشرفیہ حصہ ۱	۳ر
ایضاً حصہ ۲	۴ر
فردوس آسیہ	عہ ۴ر
اوراد رحمانی	۲ر

متفرق دینیات

شفار العلیل ترجمہ قول الجمیل	۶ر
فوز الکبیر فی اصول التفسیر	۶ر
ہدیۂ مجیدیہ ترجمہ تحفہ اثنا عشریہ	عمار ۸
آیات بینات حصۂ اول جلد ۱	
ایضاً جلد ۱ حصہ ۲	
ایضاً جلد ۲	
فتاوے عزیزی اردو	عمار
مکتوبات امام ربانی	عہ ۱۰ر
مقامات امام ربانی	۵ر

المشتہر شجاعت علی علوی مہتمم النظامیہ ایجنسی امین آباد لکھنؤ

تصانیف عبد الحلیم صاحب شرر اڈیٹر دلگداز

ملک العزیز ورجنا	۵ر
منصور موہنا	۵ر
حسن انجلنا	۵ر
شہید وفا	۶ر
دلکش حصہ ۱ ۰۲ر حصہ ۲	۰۲ر
دلچسپ حصہ ۱ ۴ر حصہ ۲	۳ر
فردوس بریں	۱۲ر
مقدس نازنین	عہ ۲ر
زیاد وحلاده	۱۴ر
یوسف ونجمہ	عہ ر
درگیش نندنی	۴ر
میوۂ تلخ	۳ر
بدر النساء کی مصیبت	۳ر
ایام عرب	عہ ۶ر
ماہ ملک	عہ ۸ر
حروب صلیبیہ	عہ ۶ر
شوقین ملکہ	عہ ۲ر
زوال بغداد	عہ ۴ر
قیس ولیلیٰ	عہ ۴ر

تصانیف مرزا محمد ہادی مرزا

امراؤ جان ادا	۶ر
ذات شریف	۶ر
شریف زاده	۶ر

تصانیف حکیم محمد علی صاحب اڈیٹر مرقع عالم

جان دہنوریا (عبرت) کامل	عہ ۱۰ر
جعفر و عباسہ	عہ ۵ر
نیل کا سانپ	عہ ۵ر
اختر و حسینہ ہر دو حصہ	عہ ۱۲ر
حسن سرور	عہ ۸ر
دیوان دیوی	عہ ۴ر
گورا	عہ ۵ر

تصانیف منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ

کایا پلٹ	۴ر
احمق الذی	۴ر
حاجی بغلول	۴ر
طلسمی فانوس	۸ر
میٹھی چھری	۸ر
پیاری دنیا	۳ر

تصانیف منشی جوالا پرشاد برق

معشوقۂ فرنگ	۱۰ر
آتچیاو	۶ر
ردہنی	۶ر
مار آستین	۸ر
مرنالنی	۱۲ر
پرتاب	۱۲ر
بنگالی دلھن	۱۲
بروگ	۴ر

المشتہر شجاعت علی علوی منیجر الناظر بک ایجنسی امین آباد لکھنؤ